اُردو اَدب ۸۳

ترتیب و انتخاب

- کشور ناہید
- جاوید شاہین
- منّو بھائی

مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۲

قیمت ۲۰۰ روپے

اُردو اَدب ۸۳

میری لائبریری میں جدید اضافے

١ اُردُو کا بہترین انشائی اَدب (رجب علی بیگ سے دَورِ حاضر تک)
مرتّب : ڈاکٹر وحید قریشی

٢ اَذکار و افکار : میرزا ادیب کے کالم جو "نوائے وقت" میں شائع ہوتے رہے۔

٣ غالب سے معذرت کے ساتھ : میرزا غالب کے بارے میں مزاحیہ تحریروں (نظم و نثر) کا انتخاب مرتّب : احمد جمال پاشا

٤ رُسوا، ایک مُطالعہ : میرزا محمد ہادی رُسوا کی شخصیت اور ان کی تصانیف پر مضامین کا انتخاب مُرتّب : ڈاکٹر میمونہ انصاری

٥ منٹو (سَوانح) منٹو کے کلاس فیلو اور زندگی کے ساتھی اَبُو سعید قریشی کے قلم سے

٦ جہانِ آگہی : ظہیر کاشمیری کے مفید اور دِلچسپ خیال انگیز مضامین کا مجمُوعہ

٧ رویّے : ڈاکٹر میمُونہ انصاری کے نثری اَدب کے بارے میں مضامین

٨ سَسّی : شہر بھنبھور دی، عبداللطیف بھٹائی کی تحقیق کے مطابق۔ (پنجابی منظوم)، اسمٰعیل قلندر

٩ تلخاب : ڈاکٹر خیال امروہوی کا نیا مجموعۂ کلام

١٠ نیا خون : خان فضل الرحمان خاں کا نیا ناول، اَدھ کھایا امرُود، افسانے

١١ زرد ستارہ : ڈاکٹر منیر الدّین احمد کے افسانوں کا مجمُوعہ

١٢ امریکہ اور امریکی : (سَفرنامہ)
سیّد ضیا حیدر کو امریکہ کیسا لگا؟

١٣ دیوارِ گریہ : ایک معاشرتی ناول جو معصوری صدیقی نے لکھا ہے

١٤ جن سے بستی بستی روشن تھی : ایم اے عثمانی۔ علم کے اصلی استادوں کا تعارف

١٥ ١٩٨٦ء کے منتخب افسانے : مرتّب : ناصر زیدی

اُردو اَدب ۸۳

ترتیب وانتخاب

- کشور ناہید
- جاوید شاہین
- منّو بھائی

مکتبہ میری لائبریری، لاہور-۲

ناشر ــــــ بشیر احمد چودھری ۔ ڈائرکٹر
مکتبہ میری لائبریری ۔ لاہور

طابع ــــــ ندیم یونس پرنٹرز ۔ لاہور

زیر انتظام ــــــ چودھری محمد شاہنواز، ناظم اشاعت
مکتبہ میری لائبریری ۔ لاہور

قیمت ــــــ ۲۰۰ روپے

اس انتخاب میں

ادب اور صحافت میں ایک فرق تو یہی بتایا جاتا ہے کہ صحافت کیلنڈر کی تاریخوں میں رہ جاتی ہے اور ادب تاریخ کے صفحات میں ریکارڈ ہو جاتا ہے چنانچہ اسے کیلنڈر کے ماہ و سال میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک ادب کو کیلنڈر کے سالوں میں تقسیم نہیں کیا جاتا مگر اس کا ریکارڈ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ خاص طور پر ان حالات میں جبکہ باقاعدگی سے شائع ہونے والے ادبی رسالوں اور جریدوں کی شدید کمی ہو یہ ضرورت اور بھی زیادہ اہم ہو جاتی ہے کہ پڑھنے والوں کو مناسب وقفوں سے ان کے عہد کا منتخب ادب مہیا کیا جاتا رہے اور ادب کا یہ ریکارڈ محفوظ بھی کیا جا سکے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ سال بھر کے ادب کا انتخاب کیا جائے اور اسے کتاب کی شکل میں چھاپ دیا جائے۔ "اردو ادب ۸۲ء" کے سلسلے میں یہی کچھ کیا گیا ہے۔

یہ کام اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے۔ بعض ادبی اداروں، تنظیموں اور ناشروں نے اردو ادب کے سالانہ انتخاب چھاپے ہیں مگر یا تو ان کا وہ تسلسل قائم نہ رہ سکا جو ضروری تھا یا وہ معیار برقرار نہ رکھا جا سکا جو اس سے بھی زیادہ ضروری تھا اور یوں ایک اہم ضرورت پوری نہ ہو سکی۔ گل رنگ پبلشرز نے اردو ادب کے سالانہ انتخاب کا یہ سلسلہ معیار کی کڑی شرط کے ساتھ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر یہ کتاب تاخیر سے شائع ہو رہی ہے مگر اہتمام اور انتظام کیا گیا ہے کہ دوسری کتاب آئندہ سال کی پہلی سہ ماہی میں ہی شائع ہو جائے۔

کوشش کی گئی ہے کہ ایسی تمام تحریریں اس انتخاب میں شامل کی جائیں جو عصری تقاضوں کو پورا کرتی ہیں یا جن میں عصری تقاضوں کا شعور پایا جاتا ہے یا جو حالات و واقعات کی صحیح عکاسی یا ترجمانی کرتی ہیں یا ان پر کسی نئے رخ یا کسی انوکھے زاویے سے روشنی ڈالتی ہیں۔ چنانچہ اس

انتخاب میں وہ تمام تخلیقات آ گئی ہیں جن میں جذبات اور محسوسات کے دل دھڑکتے ہیں اور جن پر انگلی رکھ کر وقت کی نبض محسوس کی جا سکتی ہے اور جو سال ۸۳ء میں شائع ہوئیں۔

یہ مطالعہ آج بھی اور مستقبل میں بھی دلچسپی کا باعث رہے گا کہ ایک خاص عہد کے ادیبوں اور دانشوروں نے اپنے عہد کے انسانی مسائل کو کس نگاہ سے دیکھا، کس شعور سے پرکھا اور ان کے بارے میں کس نوعیت کا ردِ عمل ظاہر کیا۔ کن اثرات کو قبول کیا اور کن تاثرات کو مسترد کیا۔ وہ کون سے سپنے تھے جو وہ دیکھتے رہے اور وہ کون سے خواب تھے جنہوں نے انہیں جگائے رکھا۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر جو ادب منتخب کیا جائے گا اس سے یہ اندازہ لگانا بھی آسان ہوگا کہ ایک خاص عہد کے معاشرے یا معاشروں میں برداشت کی قوت کیسی تھی اور اس عہد کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے برداشت کی اس قوت میں کتنا اضافہ کیا۔ علم و ادراک کے افق میں کتنی وسعت پیدا کی اور فکر و وجدان کی کن سرحدوں تک پہنچے۔

اس انتخاب کے سلسلے میں پاکستان اور ہندوستان کے تمام قابلِ ذکر اور مؤقر اردو رسالوں اور جریدوں کے علاوہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں شائع ہونے والے اردو کے جریدوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ سال ۸۳ء کے دوران دنیا میں جہاں کہیں بھی کوئی لائقِ توجہ تحریر شائع ہوئی ہے اس انتخاب میں شامل ہے۔ بعض تحریروں کی اس انتخاب میں شمولیت پر اختلاف ہو سکتا ہے اور کچھ تحریروں کے شامل نہ کئے جانے پر اعتراض کا بھی امکان ہے۔ مگر انتخاب کرنے والوں نے جس مقصد اور جس معیار کو پیشِ نظر اور ملحوظِ خاطر رکھا اس کے مطابق یہ انتخاب آپ کے سامنے ہے۔

کچھ تحریریں بعنوان "اندوختہ" درج ہیں۔ کا بیاں جوڑتے ہوئے یہ تحریریں گم ہو گئی تھیں اور پھر مل گئیں۔ یوں آپ تک پہنچ رہی ہیں۔ ترتیب میں بھی یہی نشیب و فراز ملیں گے۔ سلامت رہیں وہ ادیب کہ جن کے توسط سے یہ مجموعہ مرتب ہو سکا۔

منو بھائی

ترتیب

افسانے

نظمیں

فیض احمد فیض ۔ اختر الایمان ، وزیر آغا ، احمد فراز ، منیر نیازی ، احمد شمیم ، زہرہ نگاہ
زاہد ڈار ۔ جیلانی کامران ، ساقی فاروقی ، محمد سلیم الرحمان ، اعجاز احمد ، آفتاب اقبال شمیم ۔
، صلاح الدین محمود ، اختر حسین جعفری ، پروین شاکر ، افتخار عارف ، نذیر قیصر ،
نسرین انجم بھٹی ، اصغر ندیم سید ، افضال سید ، حسن عباس رضا ، یوسف کامران ، تنویر انجم ۔

سیما شکیب ، جاوید شاہین ۔ کشور ناہید۔

طنز و مزاح:

محمد خالد اختر	فکر تونسوی	کرنل محمد خان
مشاہیر کے خطوط ۔ صفحہ ۲۸۳	ایک اکیلا تنہا ۔ صفحہ ۔ ۲۹۰	نہ خدا ہی ملا ۔ صفحہ ۳۰۱

غزلیں: صفحہ ۲۱۱ تا ۲۳۶

فراق گورکھپوری ۔ احمد ندیم قاسمی ۔ انجم رومانی ، ظفر اقبال ، محشر بدایونی ، احمد مشتاق ، محسن احسان ، رئیس فروغ ، سلیم شاہد ، ذوالفقار تابش ، ثروت حسین ، ستار سیّد ، غلام حسین ساجد ، جمال احسانی ، ایوب خاور عتیق جیلانی ۔ سلطان سکون ۔

تنقید:

فیض احمد فیض	باقر مہدی	شمیم حنفی
پاکستانی تہذیب کے اجزائے ترکیبی ۔ صفحہ ۳۳۹	نثری نظم ۔ صفحہ ۳۶۵	ترقی پسند ادب ، جدید ادب صفحہ ۳۸۱
مسعود اشعر	ڈاکٹر سعید اختر درانی	انیس الرحمان
ثقافت اور قومی تشخص ۔ صفحہ ۳۴۹	اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط صفحہ ۳۷۳	نیپال کے روبرو ۔ صفحہ ۴۰۸

قاضی جاوید

جنس اور تنہائی ۔ صفحہ ۳۵۶ ۔ احمد شمیم کے خطوط صفحہ ۴۱۸

تراجم:

شیخ ایاز	اعجاز احمد	منیر الدین احمد
جیل میں بلیک آؤٹ صفحہ ۴۵۶	پبلو نرودا ۔ صفحہ ۴۴۹	نظمیں ، کہانی صفحہ ۴۵۳ ، ۴۵۷
احمد سلیم	الطاف قریشی	آصف فرخی
ڈر صفحہ ۵۳۵	مارکیز کا مضمون ۔ صفحہ ۵۲۴	بورخس صفحہ ۵۳۱

وہ رسائل جن سے استفادہ کیا گیا

- فنون ۔ لاہور
- ادب لطیف ۔ لاہور
- محراب ۔ لاہور
- افکار ۔ کراچی
- اوراق ۔ لاہور
- سیپ ۔ کراچی
- نیرنگِ خیال ۔ راولپنڈی
- نیادور ۔ کراچی
- کتاب نما ۔ دہلی
- شاعر ۔ بمبئی ۔
- عصری ادب ۔ دہلی
- اردو انٹرنیشنل ۔ ٹورنٹو ۔ (کینیڈا)

افسانے

راجندر سنگھ بیدی

اِک باپ بکاؤ ہے

دیکھی نہ سُنی یہ بات جو ۲۴ فروری کے ٹائمز میں چھپی۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اخبار والوں نے چھاپ کیسے دی؟ خرید و فروخت کے کالم میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا ہی اشتہار تھا۔ جس نے وہ اشتہار دیا تھا، ارادہ یا اس کے بغیر اسے معمّے کی ایک شکل دے دی تھی۔ پتے کے سوا اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی، جس سے خریدنے والے کو کوئی دلچسپی ہو ــــ بکاؤ ہے ایک باپ، عمر اکہتّر سال، بدن اکہرا، رنگ گندمی، دمے کا مریض۔ حوالہ باکس نمبر ایل ۷۶۴ معرفت ٹائمز۔

اکہتر برس کی عمر میں باپ کہاں رہا ــــ دادا نانا ہو گیا وہ تو؟!

عمر بھر آدمی ہاں ہاں کرتا رہتا ہے، آخر میں نانا ہو جاتا ہے۔

باپ خریدلائے تو ماں کیا کہے گی جو بیوہ ہے۔ عجیب بات ہے نا، ایسے ماں باپ جو میاں بیوی نہ ہوں۔

ایک آدمی نے اُلٹے پاؤں دنیا کا سفر شروع کر دیا ہے۔ آج کی دنیا میں سب سچ ہے بھائی، سب سچ ہے۔

دمہ پھیلائے گا۔

نہیں بے دمہ متعدی بیماری نہیں۔

ہے

نہیں

ہے

ان دو آدمیوں میں چاقو چل گئے . . . . . . جو بھی اس اشتہار کو پڑھتے تھے بڑھے کی سنک پہ ہنس دیتے تھے۔ پڑھنے کے بعد اسے ایک طرف رکھ دیتے اور پھر اُٹھا کر اسے پڑھنے لگتے۔ جیسے ہی انہیں اپنا آپ احمق معلوم ہونے لگتا وہ اس اشتہار کو اڑوسیوں پڑوسیوں کی ناک تلے ٹھونس دیتے۔

ایک بات ہے۔ گھر میں چوری نہیں ہو گی۔

کیسے؟

ہاں، کوئی رات بھر کھانستا ہے۔

یہ سب سازش ہے، خواب آور گولیاں بیچنے والوں کی۔

پھر — اک باپ بکاؤ ہے۔

یوں لوگ ہنستے ہنستے رونے کے قریب پہنچ گئے۔

گھروں میں، راستوں میں، دفتروں میں بات ٹاک ہونے لگی جس سے وہ اشتہار اور بھی مشتہر ہو گیا۔

جنوری فروری کے مہینے بالعموم بہت جھڑکے ہوتے ہیں۔ ایک ایک دارو غے کے نیچے بیس بیس جھاڑ دینے والے، سڑکوں پر گرے سوکھے سڑے، بوڑھے پتے اُٹھاتے اُٹھاتے تھک جاتے ہیں۔ جنہیں اُن کو گھر لے جانے کی ہی اجازت نہیں کہ اُنہیں جلائیں اور سردی سے خود اور اپنے بال بچوں کو بچائیں۔ اس بہت جھڑ اور سردی کے موسم میں وہ اشتہار گرمی پیدا کرنے لگا جو آہستہ آہستہ سینک میں بدل گئی۔

کوئی بات تو ہو گی؟!

ہو سکتا ہے پیسے جائیداد والا . . . .

بکواس۔ ایسے میں بکاؤ لکھتا؟

مشکل سے اپنے باپ سے خلاصی پائی ہے۔ باپ کیا تھا چنگیز ہلاکو تھا سالا۔

تم نے پڑھا، مسز گوسوامی؟

دھت ۔ ہم بچے پالیں گی، سُدھا کہ باپ؟ ایک آپنے ہی وہ کم نہیں۔

گو — سوامی ہے! ہی . . . . ہی ہی۔

باپ بھی حرامی ہوتے ہیں . . . .

باکس ایل ۷۶ ۴ میں چٹھیوں کا طُومار اُتر آیا تھا۔ اس میں ایک ایسی چٹھی بھی چلی آئی تھی، جس میں کیرل کی کسی لڑکی مس اُونی کرشنن نے لکھا تھا کہ وہ ابوظہبی میں ایک نرس کا کام کرتی رہی ہے اور اس کے ایک بچّہ ہے وہ کسی ایسے مرد کے ساتھ شادی کی متمنی ہے جس کی آمدنی معقول ہو اور بچے کی مناسب دیکھ بھال کر سکے، چاہے وہ کتنی عمر کا ہو۔ اس کا کوئی شوہر ہوگا جس نے اسے چھوڑ دیا، یا ایسے ہی ابوظہبی کے کسی شیخ نے اُسے اُلٹا پلٹا دیا۔ چنانچہ غیر متعلق ہونے کی وجہ سے وہ عرضی ایک طرف رکھ دی گئی۔ کیونکہ اس کا بکاؤ باپ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بہرحال ان چٹھیوں سے یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ہیڈلے چیز، رابنسن، ارونگ اور اگاتھا کرسی، کے سب پڑھنے والے اِدھر پلٹ پڑے ہیں۔ کلاسی فائیڈ اشتہار چھاپنے والوں نے جنرل مینجر کو تجویز پیش کی کہ اشتہاروں کے نرخ بڑھا دیئے جائیں مگر نوجوان مُڈھے یا بُڈھے نوجوان مینجر نے تجویز کو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے کہا — SHUCHS! ، ایک پاپولر اشتہار کی وجہ سے نرخ کیسے بڑھا دیں؟ . . . . اُس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی غلطی کا ازالہ کرنے کی بے سود کوشش کر رہا ہے۔

پولیس پہنچی۔ اس نے دیکھا ہندو کالونی، دادر میں گاندھرو داس، جس نے اشتہار دیا تھا، موجود ہے اور صاف کہتا ہے کہ میں بکنا چاہتا ہوں۔ اگر اس میں کوئی قانونی رخنش ہے تو بتایئے؟ وہ پان پہ پان چباتا اور اِدھر اُدھر دیواروں پر تھوکتا جا رہا ہے۔ مزید تفتیش سے پتہ چلا کہ گاندھرو داس ایک گائیک تھا، کسی زمانے میں جس کی گائیگی کی بڑی دُھوم تھی۔ برسوں پہلے اس کی بیوی موت ہو گئی، جس کے ساتھ اس کی ایک منٹ نہ بنتی تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک اندھی محبت میں بندھے ایک دُوسرے کو چھوڑتے ہی نہ تھے۔ شام کو گاندھرو داس کا ٹھیک آٹھ بجے گھر پہنچنا

تھا۔ بیوی کے مائیکے چلے جانے کے بعد دس ہی دن میں گاندھروداس کا اسے واپس بلوانا ضروری تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ کوئی لین دین نہ رہ جانے کے باوجود یہ احساس ضروری تھا کہ —— وہ ہے، گاندھروداس کی تان اُڑتی ہی صرف اس لئے تھی کہ دمینتی اُس کے سنگیت سے بھرپور نفرت کرنے والی بیوی گھر میں موجود تھی کہ اُس کا مرد جو برسوں سے اُسے نہیں بُلاتا، ساتھ کے بستر پہ پڑا، شراب میں بدمست، خراٹے لے رہا ہے۔ کیونکہ خراٹا ہی ایک موسیقی تھی جسے گاندھرو کی بیوی سمجھ پائی تھی۔

بیوی کے چلے جانے کے بعد گاندھروداس کو بیوی کی تو سب زیادتیاں بھول گئیں۔ لیکن اپنے اس پہ کئے ہوئے اتیاچار یاد رہ گئے۔ وہ بیچ رات کے ایکا ایکی اُٹھ جاتا اور گریبان پھاڑ کر ادھر اُدھر بھاگنے لگتا۔ بیوی کے بارے میں آخری خواب میں اس نے دیکھا کہ "دوسری عورت" کو دیکھتے ہی اس کی بیوی نے واویلا مچا دیا ہے اور روتی چلاتی ہوئی گھر سے بھاگ نکلی ہے۔ گاندھروداس پیچھے دوڑا۔ لکڑی کی سیڑھی کے نیچے کچی زمین میں دمینتی نے اپنے آپ کو دفن کر لیا، مگر مٹی ہل رہی تھی اور اس میں دراڑیں سی چلی آئی تھیں جس کا مطلب تھا کہ ابھی اس میں سانس باقی ہیں۔ جو اس باختگی میں گاندھروداس نے اپنی عورت کو مٹی کے نیچے سے نکالا تو دیکھا اس کے دونوں بازو غائب تھے۔ ناف کے نیچے بدن نہیں تھا۔ اس پر بھی وہ اپنے ٹھنڈے اپنے پتی کے گرد ڈالے اس سے چمٹ گئی اور گاندھروداس اُسی پتلے سے پیار کرتا ہوا اسے سیڑھیوں سے اوپر لے آیا۔

گاندھروداس کا گانا بند ہو گیا۔

گاندھروداس کے تین بچے تھے —— تھے کیا —— ہیں۔ سب سے بڑا ایک نامی پلے بیک سنگر ہے جس کے لانگ پلینگ ریکارڈ بازار میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں۔ ایرانی ریستورانوں میں جیوک باکسوں سے جتنی فرمائش اس کے گانوں کی ہوتی ہے اور کسی کے نہیں۔ اس کے برعکس گاندھروداس کے کلاسیکی میوزک کو کوئی گھاس بھی نہ ڈالتا تھا۔ دوسرا لڑکا اوف سیٹ پرنٹر ہے اور جست کی پلیٹیں بھی بناتا ہے

پیرس سے وہ ڈیڑھ دو ہزار روپیہ مہینہ پاتا ہے اور اپنی اطالوی بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا ہے۔ کوئی جیئے یا مرے اُسے اس بات کا خیال ہی نہیں۔ جس زمانے میں گاندھرو داس کا موسیقی کے ساز بیچنے کا کام ٹھپ ہوا تو بیٹا بھی ساتھ تھا۔ گاندھرو نے کہا۔ چلو، ایچ ایم وی کے ریکارڈوں کی ایجنسی لیتے ہیں۔ چھوٹے نے جواب دیا ــــ ہاں، مگر آپ کے ساتھ میرا کیا مستقبل ہے؟ گاندھرو داس کو دھچکا سا لگا۔ وہ بیٹے کا مستقبل کیا بتا سکتا تھا؟ کوئی کسی کا مستقبل کیا بتا سکتا ہے؟ گاندھرو داس کا مطلب تھا کہ میں کھاتا ہوں تو تم بھی کھاؤ۔ میں بھوکا مرتا ہوں تو تم بھی مرو، تم جوان ہو، تم میں حالات سے لڑنے کی طاقت ہے۔ اس کے جواب کے بعد گاندھرو داس ہمیشہ کے لئے چپ ہو گیا۔ رہی بیٹی تو وہ ایک اچھے مارواڑی گھر میں بیاہی گئی۔ جب وہ تینوں بہن بھائی ملتے تو اپنے باپ کو رنڈوا نہیں، مرد بیوہ کہتے اور اپنی اس اختراع پر خود ہی ہنستے رہتے۔

ایسا کیوں؟

چاترک ایک شاعر اور اکاؤنٹنٹ جو اس اشتہار کے سلسلے میں گاندھرو داس کے ہاں گیا تھا، کہہ رہا تھا ــــ اس بڈھے میں ضرور کوئی خرابی ہے ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تین اولادوں میں سے ایک بھی اس کی دیکھ ریکھ نہ کرے۔ کیا وہ ایک دوسرے کے اتنے نزدیک تھے جو دور ہو گئے؟ ہندسوں میں اُلجھے رہنے کی وجہ سے کوی چاترک کے الہام اور الفاظ کے درمیان فساد پیدا ہو گیا تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ ہندوستان تو کیا دُنیا بھر میں کُنبے کا تصور ٹوٹتا جا رہا ہے۔ بڈھوں کا ادب ایک فیوڈل بات ہو کر رہ گئی ہے، اس لئے سب بُڈھے کسی ہائیڈ پارک میں بیٹھے امتدادِ زمانہ کی سردی سے ٹھٹھرے ہوئے، ہر آنے جانے والے کو تکا کرتے ہیں کہ شاید ان سے کوئی بات کرے۔ وہ یہودی ہیں جنہیں کوئی ہٹلر ایک ایک کر کے گیس چیمبر میں دھکیلتا جا رہا ہے مگر دھکیلنے سے پہلے جبر کے ساتھ ان کے دانت نکال لیتا ہے، جن پہ سونا مڑھا ہے یا اگر کوئی بچ گیا ہے تو کوئی بھانجہ بھتیجا اتفاقیہ طور پر اُس

بڈھے کو دیکھنے کے لئے اس کے مخروطی اٹیک میں پہنچ جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہ تو مرا پڑا ہے، اور اس کی غلافی آنکھیں اب بھی دروازے پر لگی ہیں۔ نیچے کی منزل والے بدستور اپنا اخبار بیچنے کا کاروبار کر رہے ہیں۔ کیونکہ دنیا میں روز کوئی نہ کوئی واقعہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ ڈاکٹر آکر تصدیق کرتا ہے کہ بڈھے کو مرے ہوئے پندرہ دن ہو گئے۔ صرف سردی کی وجہ سے لاش گلی سڑی نہیں۔ پھر وہ بھانجا یا بھتیجا کمیٹی کو خبر کر کے منظر سے ٹل جاتا ہے، مبادا آخری رسوم کے اخراجات اُسے دینے پڑیں۔

چاترک نے کہا — ہو سکتا ہے بڈھے نے کوئی اندوختہ رکھنے کی بجائے اپنا سب کچھ بچوں ہی پر لُٹا دیا ہو۔ اندوختہ ہی ایک بولی ہے۔ جسے دنیا کے لوگ سمجھتے ہیں اور ان سے زیادہ اپنے سگے سمبندھی، اپنے ہی بچے بالے، کوئی سنگیت میں تارے توڑ لائے، نقاشی میں کمال دکھائے، اس سے انہیں کوئی مطلب نہیں۔ پھر اولاد ہمیشہ یہی چاہتی ہے کہ اس کا باپ وہی کرے جس سے وہ، اولاد خوش ہو۔ باپ کی خوشی کس بات میں ہے۔ اس کی کوئی بات ہی نہیں اور ہمیشہ ناخوش رہنے کے لئے اپنے کوئی سا بھی بیگانہ بہانہ تراش لیتے ہیں۔

مگر گاندھر وداس تو بڑا ہنس مکھ آدمی ہے۔ ہر وقت لطیفے سُناتا، خود ہنستا اور دوسروں کو ہنساتا رہتا ہے۔ اس کے لطیفے اکثر فحش ہوتے ہیں۔ شاید وہ کوئی نقاب مکھوٹے ہیں، جن کے پیچھے وہ اپنی جنسی ناکامیوں اور ناآسودگیوں کو چھپاتا رہتا ہے، یا پھر، سیدھی سی بات — بڑھاپے میں انسان ویسے ہی ٹھرکی ہو جاتا ہے اور اپنی حقیقی یا مفروضہ فتوحات کی بازگشت!

اشتہار کے سلسلے میں آنے والے کچھ لوگ ایسے بھی بدک گئے کہ گاندھر وداس پر پچیس ہزار کا قرض بھی تھا۔ جو بات اس نے اشتہار میں نہیں لکھی تھی اور غالباً اس کی عیاری کا ثبوت تھی۔ اس پر طرفہ ایک جوان لڑکی سے آشنائی بھی تھی جو عمر میں اس کی اپنی بیٹی رما سے چھوٹی تھی — وہ لڑکی، دیویانی، گانا سیکھنا چاہتی تھی جو گورو جی نے دن رات ایک کر کے اسے سکھا دیا اور سنگیت کی دُنیا کے شکھر پر پہنچا دیا۔ لیکن

ان کی عمروں کے بُعد کے باوجود ان کے تعلقات میں جو ہیجانی کیفیت تھی، اُسے دوسرے تو ایک طرف، خود وہ بھی نہ سمجھ سکتے تھے۔ اب بھلا ایسے چاروں عیب شرعی باپ کو کون خریدے ہے؟

اور پھر ـــــ جو ہر وقت کھانستا رہے کسی وقت بھی دم اُلٹ جائے اس کا باہر جائے تو توٹانک مار کے آئے، بلکہ لوٹتے وقت پوا بھی دھوتی میں چھپا کر لے آئے۔۔۔۔۔

آخر دمے کے مریض کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے۔

گاندھر وداس سنگیت سکھاتے ہوئے یہ بھی کہہ اُٹھتا ـــــ میں پھر گاڈں گا۔ وہ تکرار کے ساتھ یہ بات شاید اس لئے بھی کہتا تھا کہ اسے خود بھی اس میں یقین نہ تھا۔ وہ مُڑ کر تا بھی تو اسے اپنے سامنے اپنی مرحوم بیوی کی روح دکھائی دیتی جیسے کہ رہی ہو ـــــ ابھی تک گائے جا رہے ہو؟

اس انوکھے مطالبے اور امتزاج کی وجہ سے لوگ گاندھر وداس کی طرف یوں دیکھتے تھے جیسے وہ کوئی بہت چمکتی دمکتی ہوئی شے ہو۔ اور جس کا نقش وہاں سے ٹل جانے کے بعد بھی کافی عرصے تک آنکھ کے اندر پردے پر برقرار رہے اور اس وقت تک پیچھا نہ چھوڑے جب تک کوئی دوسرا عُنصری نظارہ پہلے کو دُھندلا نہ دے۔

کسی خورشید عالم نے کہا ـــــ میں خریدنے کو تیار ہوں، بشرطیکہ آپ مُسلمان ہو جائیں۔

مُسلمان تو میں ہوں ہی!

کیسے؟

میرا ایمان خدا پہ مسلّم ہے، پھر میں نے جو پایا ہے اُستاد علاءالدین کے گھرانے سے پایا ہے۔

آں ہاں ـــ وہ مسلمان ـــ کلمے والا۔۔۔۔۔

کلمہ تو سانس ہے انسان کی جو اس کے اندر، باہر جا رہی اور سارہی ہے۔ میرا دین

سنگیت ہے۔ کیا اُستاد عبدالکریم خاں کا باباہری داس ہونا ضروری تھا؟

پھر میاں خورشید عالم کا پتہ نہیں چلا۔

دو تین عورتیں بھی آئیں لیکن گاندھرو داس جس نے زندگی کو توٹانک بنا کے پی لیا تھا، بولا ــــــ جو تم کہتی ہو عین مین اس سے اُلٹ چاہتی ہو۔ کوئی نیا تجربہ جس سے بدن سو جائے اور رُوح جاگ اُٹھے، اسے کرنے کی تم میں ہمت ہی نہیں۔ دین، دھرم معاشرہ نہ جانے کن کن چیزوں کی آڑ لیتی ہو لیکن بدن رُوح کو شکنجے میں کس کے یوں سامنے پھینک دیتا ہے۔ تم پلنگ کے نیچے کے مرد سے ڈرتی ہو اور اسے ہی چاہتی ہو۔ تم ایسی کنواریاں ہو جو اپنے دفاع میں عفت ہی کی رٹ سے اپنی عصمت لٹواتی ہو اور بے مُہار لُٹواتی ہو۔ پھر گاندھرو داس نے ایک شیطانی مسکراہٹ سے کہا ــــــــــ

دراصل تمہارے بچے ہی غلط ہیں!

اُن عورتوں کو یقین ہو گیا کہ وہ ازلی مائیں دراصل باپ نہیں، کسی خدا کے بیٹے کی تلاش میں ہیں ورنہ تین تین چار چار تو ان کے اپنے بیٹے ہیں۔ مجاز کی اس دُنیا میں۔۔

۔۔۔

مَیں اس دن کی بات کرتا ہوں، جس دن بان گنگا کے مندر سے بھگوان کی مورتی چوری ہوئی اُس دن پت جھڑ بہار پر تھی۔ مندر کا پورا احاطہ سوکھے سڑے، بوڑھے پتوں سے بھر گیا۔ کہیں شام کو بارش کا ایک چھینٹا پڑا اور چوری سے پہلے مندر کی جیوتیوں پر پروانوں نے اتنی ہی فراوانی سے قربانی دی، جس فراوانی سے قدرت انہیں پیدا کرتی اور پھر ان کی کھاد بناتی ہے۔ یہ وہی دن تھا جس دن پجاری نے پہلے بھگوان کرشن کی رادھا (جو عمر میں اپنے عاشق سے بڑی تھی) کی طرف دیکھا اور پھر مُسکرا کے مہترانی چھبو کی طرف (جو عمر میں پجاری کی بیٹی سے چھوٹی تھی) اور وہ پتے اور پھول اور بیج گھر لے گئی۔

مورتی تو خیر کسی نے سونے چاندی ہیرے اور پتوں کی وجہ سے چُرائی، لیکن گاندھرو داس کو لارنس اینڈ لارنس کے دُردے نے یوں ہی خرید لیا۔ گاندھرو داس اور دُردے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ بوڑھے نے صرف آنکھوں آنکھوں میں اُسے کہہ دیا

—— جیسے تیسے بھی ہو، مجھے لے لو بیٹا۔ بنا بیٹے کے کوئی باپ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد دُردے کو آنکھیں ملاتے، سوال کرنے کی ہمت ہی نہ پڑی۔ سوال شرطوں کا تھا مگر شرطوں کے ساتھ کہیں زندگی ہے؟ . . . دُردے نے گاندھرو داس کا قرض چکایا، سہارا دے کر اسے اٹھایا اور مالابار ہل کے دامن میں اپنے عالیشان بنگلے گہری کُنج میں لے گیا۔ جہاں وہ اس کی تیمارداری اور خدمت کرنے لگا۔

دُردے سے اس کے ملازموں نے پوچھا —— سر، آپ یہ کیا مصیبت لے آئے ہیں۔ یہ بڈھا، مطلب! بابو جی آپ کو کیا دیتے ہیں؟

کچھ نہیں بیٹھے رہتے ہیں آلتی پالتی مارے، کھانستے رہتے ہیں اور یا پھر زردے قوام والے پان چباتے رہتے ہیں، جہاں جی چاہے، تھوک بھی دیتے ہیں، جس کی عادت مجھے اور میری صفائی پسند بیوی کو ابھی نہیں پڑی مگر پڑ جائے گی —— دھیرے دھیرے . . . مگر تم نے ان کی آنکھیں دیکھی ہیں؟

جی نہیں

جاؤ دیکھو، ان کی روتی ہنستی آنکھوں میں کیا ہے۔ ان میں سے کیسے کیسے سندیسے نکل کر کہاں کہاں پہنچ رہے ہیں۔

کہاں کہاں پہنچ رہے ہیں؟ — جمنا داس، دردے کے ملازم نے غیر ارادی طور پر فضا میں دیکھتے ہوئے کہا —— آپ تو سائنس دان ہیں؟!

مَیں سائنس ہی کی بات کر رہا ہوں، جمنا! اگر انسان کے زندہ رہنے کے لئے پھل پھول اور پودے ضروری ہیں، جنگل کے جانور ضروری ہیں، بچے ضروری ہیں تو بوڑھے بھی ضروری ہیں ورنہ ہمارا ایکولاجیکل بیلنس تباہ ہو کر رہ جائے۔ اگر جسمانی طور پر نہیں تو روحانی طور پر انسانی نسل ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جائے۔

جمنا داس اور اتھاوالے بھاؤ کچھ سمجھ نہ سکے۔

دَردے نے بنگلے میں لگے اشوک پیڑ کا ایک پتہ توڑا اور جمنا داس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا —— اپنی پوری سائنس سے کہو کہ بتا زندگی یہ شگفتگی، یہ شادابی

اور یہ رنگ پیدا کر کے دکھائے...

اتھادے بولا ـــــ اشوک کا بیج بو ہیں...

ہاں، ہاں رُدر دے نے سر ہلاتے ہوئے کہا، میں بیج کی نہیں پتے کی بات کہہ رہا ہوں۔ بیج کی بات کریں تو ہم دم جانے کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔

پھر جمنا داس کے قریب ہوتے ہوئے ودر دے بولے ـــ میں تمہیں کیا بتاؤں، جمنا! جب میں بابوجی کے چرن کو جاتا ہوں تو ان کی نگاہیں کا مرم مجھے کتنی شانتی، کتنی ٹھنڈک دیتا ہے۔ میں جو ہر وقت ایک بے نام ڈر سے کانپتا تھا اب نہیں کانپتا۔ مجھے ہر وقت اس بات کی تسلی رہتی ہے ـــ وہ تو ہیں، مجھے یقین ہے، بابوجی کی آتما کو بھی کچھ ہوتا ہوگا۔

میں نہیں جانتا، سر... یہ خالی خولی جذباتیت ہے۔

ہوسکتا تھا ردر دے بھڑک اٹھتا، ہوسکتا تھا وہ جمنا داس، اپنے ملازم کو اپنی فرم سے ڈسمس کر دیتا لیکن آپ کی آنکھوں کے مرم نے اُسے یہ نہ کہنے دیا۔ اُلٹا اس کی آواز میں کہیں سے کوئی کومل سُر چلا آیا اور اس نے بڑے پیار سے کہا ـــ تم کچھ بھی کر لو، جمنا۔ پر ایک بات تو تم جانتے ہو، میں جہاں جاتا ہوں، لوگ مجھے سلامیں کرتے ہیں، میرے سامنے سر جھکاتے ہیں، بچھ بچھ جاتے ہیں۔

ردر دے اس کے بعد ایکا ایکی چپ ہوگیا۔ اُس کا گلا اور اس کی آنکھیں دُھندلا گئیں

سر، میں بھی تو یہی کہتا ہوں ـــ دنیا آپ کے سامنے سر جھکاتی ہے!

اسی لئے...۔ رُدر دے نے اپنی آواز پاتے ہوئے کہا ـــ کہیں میں بھی اپنا سر جھکانا چاہتا ہوں! اتھادے، جمنا داس، اب تم جاؤ پلیز! میری پوجا میں وِگھن نہ ڈالو۔ ہم نے پتھر سے بھی خدا پایا ہے۔

گہری کُنج میں لگے ہوئے آم کے پیڑوں پہ بور پڑا۔ اِدھر پہلی کوئل کوکی، اُدھر گاندھرو داس نے برسوں کے بعد تان اڑائی ـــ کوئیلیا بولے امواکی ڈار...

وہ گانے لگے۔ کسی نے کہا — آپ کا بیٹا آپ سے اچھا گاتا ہے۔

ایسا؟ . . . گاندھرو داس نے بمبیا بولی میں کہا — آخر میرا بیٹا ہے۔ باپ نے میٹرک کیا ہے تو بیٹا ایم اے نہ کرے؟

ایسی باتیں کرتے ہوئے ناسمجھ، بے باپ کے لوگ گاندھرو داس کے چہرے کی طرف دیکھتے کہ اُن کی جھریوں میں کہیں تو جلن دکھائی دے۔ جب کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی تو کسی نے لُقمہ دیا — آپ کا بیٹا کہتا ہے، میرا باپ مجھ سے جلتا ہے۔

سچ؟ — میرا بیٹا کہتا ہے —

ہاں میں جھوٹ تھوڑے بول رہا ہوں۔

گاندھرو داس تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئے جیسے وہ کہیں اندر عالم ارواح میں چلے گئے ہوں اور ماں سے بیٹے کی شکایت کی ہو۔ بڑھیا سے کوئی جواب پاکر وہ دھیرے سے بولے — "اور تو کوئی بات نہیں۔ میرا بیٹا — وہ ہی باپ ہے . . ."

وہ پھر اُن دنوں کی طرف لوٹ گئے۔ جب بیٹے نے کہا تھا — بابوجی! میں بھی شاستریہ سنگیت میں ایک ایسا کمال پیدا کرنا چاہتا ہوں، مگر ڈھیر سارا پیسہ کما کر، اور بابوجی نے بڑی شفقت سے بیٹے کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا — ایسے نہیں ہونا راجو . . . یا آدمی کمال حاصل کرتا ہے یا پیسے ہی بناتا چلا جاتا ہے۔ جب دو بڑے بڑے آنسو ڈھلک کر گاندھرو داس کی داڑھی میں اٹک گئے۔ جہاں ڈرد دے بیٹھا تھا اُدھر سے روشنی میں وہ بے دم ہو گئے۔ سفید روشنی جن میں سے نکل کر سات رنگوں میں بکھر گئی . . . .

ڈرد دے کو نہ جانے کیا ہوا، وہ اُٹھ کر زور سے چلایا۔ گیٹ آؤٹ . . . .

اور لوگ چوہوں کی طرح ایک دوسرے پہ گرتے پڑتے ہوئے بھاگے۔

گاندھرو داس نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور صرف اتنا کہا — نہیں بیٹے نہیں۔

ان کے ہاتھ سے کوئی برستی روئیں نکل رہی تھیں!

ڈِرڈے جب لارسن اینڈ لارسن میں گیا تو فلپ اس کا ورکس مینیجر کمپیوٹر کو ڈیٹا فیڈ کر رہا تھا۔ کمپیوٹر سے کارڈ باہر آیا تو اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ بار بار آنکھیں جھپک رہا تھا۔ ۔ ۔ لارسن اینڈ لارسن کو اکیاسی لاکھ کا گھاٹا پڑنے والا ہے۔ اس گھبراہٹ میں اُس نے کارڈ ڈِرڈے کے سامنے کر دیا جسے دیکھ کر اُس کے چہرے پر شکن تک نہ آئی۔ ڈِرڈے نے صرف اتنا کہا ــــ کوئی انفارمیشن غلط فیڈ ہو گئی ہے۔

نہیں سر ۔ ۔ ۔ میں نے بیسویں بار چیک کر کر اس چیک کر کے اسے فیڈ کیا ہے۔

تو پھر ۔ ۔ ۔ مشین ہی کوئی نقص پیدا ہو گیا ہو گا۔ آئی بی ایم والوں کو بلاؤ۔

موڈِک ــــ چیف انجینئر تو ساؤتھ گیا ہے۔

ساؤتھ کہاں ؟

ترُوپتی کے مندر ۔ ۔ ۔ سُنا ہے اُس نے اپنے لمبے ہپی بال کٹوا کر مورتی کی نذر کر دیئے ہیں۔

ڈِرڈے ہلکا سا مسکرایا اور بولا ــــ تم نے یہ انفارمیشن فیڈ کی ہے کہ ہمارے پیچھے ایک باپ چلا آیا ہے۔

فلپ نے سمجھا، ڈِرڈے اس کا مذاق اڑا رہے ہیں، یا ویسے ہی ان کا دماغ پھر گیا ہے۔ مگر ڈِرڈے کہتا رہا۔ اب ہمارے سَر پر کسی کا ہاتھ ہے، تیر یک ہے اور اس کے نتیجے کا حوصلہ اور ہمّت ۔ ۔ ۔ مت بھولو، یہ مشین کسی انسان نے بنائی ہے جس کا کوئی باپ تھا، پھر اُس کا باپ ۔ ۔ ۔ اور سب کا باپ ــ جہلِ مرکب یا منفرد!

فلپ نے اپنی اندرونی خفگی کا منہ موڑ دیا ــ کیا دیویانی اب بھی بابو جی کے پاس آتی ہے ؟

ہاں

مسز ڈِرڈے کچھ نہیں کہتی ؟

پہلے کہتی تھیں۔ اب وہ اُن کی پوجا کرتی ہیں۔ بابو جی دراصل عورت کی جات ہی سے پیار کرتے ہیں، فلپ ۔ ۔ ۔ معلوم ہوتا ہے انہوں نے کہیں پر کرتی

کے چتون دیکھ لئے ہیں، جن کے جواب میں وہ مسکراتے تو ہیں، لیکن کبھی کبھی بیچ میں آنکھ بھی مار دیتے ہیں۔

فلپ کا غصہ اور بھی بڑھ گیا۔ ۔ ۔

دُردے کہتا گیا۔ بابوجی کو شُبہ ــ بیٹی، بہو، بھابی، چاچی، للی، میا بہت اچھے لگتے ہیں۔ وہ بہو کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پیار سے اس کے گال بھی چوم لیتے ہیں اور یوں قید میں آزادی پا لیتے ہیں اور آزادی میں قید۔ ۔ ۔

دیویانی؟

دُردے نے حقارت سے کہا ــ تم سیکس کو اتنی ہی اہمیت دو، فلپ، جتنی کا کہ وہ مستحق ہے۔ تیتر بیٹر بنے بغیر اسے حواس پر مت چھانے دو۔ ۔ ۔ سنگیت شاید ایک آڑ تھی دیویانی کے لئے۔ ۔ ۔ ۔

میں سمجھا نہیں، سر؟

بابوجی نے مجھے بتایا کہ وہ لڑکی بچپن ہی میں آوارہ ہو گئی۔ اس نے اپنے باپ کو کچھ اس عالم میں دیکھ لیا جبکہ وہ نوخیزی سے جوانی میں قدم رکھ رہی تھی۔ جب سے وہ ہمیشہ کے لئے آپ ہی اپنی ماں ہو گئی۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ گھبرا کر ایک مرد سے دُوسرے، دُوسرے سے تیسرے کے پاس جانے لگی۔ اُس کا بدن ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا مگر رُوح تھی کہ تھکتی ہی نہ تھی۔ ۔ ۔ ۔

کیا مطلب؟

دیویانی کو دراصل باپ ہی کی تلاش تھی۔

فلپ جو ایک کیتھولک تھا، ایک دم بھڑک اُٹھا اس کے ابرو بالشت بھر اُوپر اٹھ گئے اور پھیلی ہوئی آنکھوں سے نارِ جہنم لپکنے لگی۔ اُس نے چلّا کر کہا ــ یہ فراڈ ہے مسٹر دُردے۔ پیور، ان اڈلٹرٹیڈ فراڈ۔ ۔ ۔ ۔ دُردے نے اپنے خریدے ہوئے باپ کی نم آنکھوں کو درشنے میں لئے کمپیوٹر کے پس منظر میں کھڑے فلپ کی طرف دیکھا اور کہا ـــــ آج ہی بابوجی نے کہا تھا، فلپ! تم انسان کو سمجھنے کی کوشش نہ کرو، صرف محسوس کرو اسے۔ ۔ ۔ ۔

احمد ندیم قاسمی

بَین

بس کچھ ایسا ہی موسم تھا میری بچی، جب تم سترہ سال پہلے میری گود میں آئی تھیں بکائن کے اودے اودے پھول اسی طرح مہک رہے تھے اور بیریوں پر گلہریاں تنے سے چوٹی تک اس طرح بھاگی پھرتی تھیں اور ایسی ہوا چل رہی تھی جیسے صدیوں کے سوکھے کواڑوں سے بھی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی۔ جب تم میری گود میں آئی تھیں تو دیئے کی کالی پیلی رُوشنی میں اُونگھتا ہوا کوٹھا چمکنے سا لگ گیا تھا اور دایہ نے کہا تھا کہ ہائے ری، اس چھوکری کے تو انگ انگ میں جگنو ٹکے ہوئے ہیں! اُس وقت میں نے بھی درد کے خمار میں اپنے جسم کے اِس ٹکڑے کو دیکھا تھا اور مجھے تو یاد نہیں پر دایہ نے بعد میں مجھے بتایا تھا کہ میں مسکرا کر، تمہارے چہرے کی دمک میں اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو یوں دیکھنے لگی تھی جیسے کوئی خط پڑھتا ہے۔

اگلی رات جب تمہارے بابا نے موقع پا کر تمہیں دیکھا تھا تو اداس ہو گیا تھا اور میں نے کہا تھا "تم تو کہتے تھے بیٹا ہو یا بیٹی سب خدا کی دین ہے پھر اب کیوں منہ لٹکا لیا ہے"، اور اس نے کہا تھا "تو نہیں جانتی ناں بھولی عورت تو ماں ہے ناں۔ تو کیسے جانے کہ خدا اتنی خوبصورت لڑکیاں صرف ایسے بندوں کو دیتا ہے جن سے وہ بہت خفا ہوتا ہے"۔ اس وقت میرا جی چاہا تھا کہ میں تمہارے بابا کی آنکھیں اس کی کھوپڑی میں سے نکال کر باداموں کی طرح توڑ دوں

کیونکہ میری جان، وہ تو تمہیں اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے چڑیا سانپ کو دیکھتی ہے وہ تمہاری خوبصورتی دیکھ کر ڈر گیا تھا اور پھر اُس نے اپنی عمر کے سولہ سترہ سال تم سے ڈرتے ڈرتے گذار دیئے ۔ وہ اب بھی ڈرا اور سہما ہوا، باہر گلی میں بچھی ہوئی چٹائیوں پر، لوگوں میں گھرا بیٹھا ہے اور آسمان کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے کوئی اس کی طرف آ رہا ہے ۔

تم مجھ پر تو نہیں گئی تھیں میری بچی ۔ میں تو گاؤں کی ایک عام سی لڑکی تھی ۔ میرا ناک نقشہ بالکل سیدھا سادا تھا ۔ ہاں تم اپنے بابا پر گئی تھیں جو بہت خوبصورت تھا ۔ وہ تو اب بھی خوبصورت ہے پر اب اس کی خوبصورتی سولہ سترہ سال کی گرد سے اُٹ گئی ہے ۔ اب بھی اس کی بڑی بڑی چیروں، بادامی آنکھیں ہیں اور اب بھی اس کے چہرے اور مونچھوں کے رنگ میں سونا ہے ۔ پر جب تم پیدا ہوئی تھیں نا تو بالکل مورت تھا ۔ تم آئیں تو وہ ڈر گیا تھا مگر اس ڈر نے اس کی شکل نہیں بدلی ۔ بس ذرا سی بجھا دی تھی ۔ تمہارے آنے کے بعد میں نے اس کے موتیوں کے سے دانت بہت کم دیکھے ۔ اس کے پنکھڑی ہونٹ ہمیشہ یوں بھنچے رہے جیسے کھلے تو کچھ ہو جائے گا ۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ آیا اور اس نے تمہیں دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی بہت بڑے محل کی بنیادیں بیٹھ رہی ہیں ۔ وہ یہاں کھڑے کھڑے ہی ایک دم اندر سے بوڑھا ہو گیا ۔ جب وہ پلٹا تو میں ڈری کہ وہ گلی تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر ہو جائے گا ۔ مگر ابھی ابھی میں نے دیوار پر سے جھانکا ہے تو وہ گلی میں بیٹھا ہے اور جمع ہوتے ہوئے لوگوں کو یوں ڈر ڈر کر، چونک چونک کر دیکھ رہا ہے جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہے ۔

تم جب تین چار سال کی ہو کر بھاگتے دوڑنے لگیں تو دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ مٹی کا بنا ہوا انسان اتنا خوبصورت بھی ہو سکتا ہے ایک بار تم گر پڑیں اور تمہارے ماتھے پر چوٹ آئی تو میں تو روتے روتے نڈھال

ہو گئی پر تمہارے بابا نے جھک کر کہا تھا" خدا جو بھی کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے ہماری رانو بیٹی کے ماتھے پر چوٹ کے نشان نے اس کی خوبصورتی کو داغدار کر دیا ہے۔" پر خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چوٹ کا نشان تو باقی رہ گیا مگر یہ نشان بالکل ننتے ننتے چاند کا سا تھا۔ لال لال سا بھی اور سنہرا سنہرا سا بھی، جو اب میری جان پیلا پیلا سا لگ رہا ہے۔

پھر جب تم پانچ سال کی ہوئیں تو میں نے قرآن شریف پڑھانے کے لیئے تمہیں بی بی جی کے پاس بٹھا دیا۔ تب پتہ چلا کہ تمہاری آواز بھی تمہاری طرح خوبصورت ہے۔ بی بی جی کے گھر کی دیواروں کے اندر سے قرآن شریف پڑھنے والی بچیوں کی آوازیں آتی تھیں تو ان میں سے میری رانو بیٹی کی آواز صاف پہچانی جاتی تھی۔ تمہاری آواز میں چاندی کی کٹوریاں بجتی تھیں۔ ایسی کھنک کہ تم چپ بھی ہو جاتی تھیں تو جب بھی چار طرف سے جھنکار سی اٹھتی رہتی تھی پھر یوں ہوا کہ پہلے تم آیت پڑھتی تھیں تو گلی میں سے گزرنے والوں کے قدم رک جاتے تھے اور چڑیوں کے غول منڈیروں پر اُتر آتے تھے۔ ایک بار مزار سائیں دولھے شاہ جی کے مجاور سائیں حضرت شاہ اِدھر سے گزرے تھے اور تمہاری آواز سنکر انھوں نے کہا تھا ـــ یہ کون لڑکی ہے جس کی آواز میں ہم فرشتوں کی پھڑپھڑاہٹ سن رہے ہیں۔ ـــ اور جب تمہیں معلوم ہوا تھا کہ سائیں حضرت شاہ نے تمہارے بارے میں یہ کہا ہے تو تم اتنی خوش ہوئی تھیں کہ رونے لگی تھیں۔

تب یوں ہوا کہ عورتیں پانی سے بھرے ہوئے برتن لائیں اور تمہاری تلاوت ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتیں۔ تم قرآن پاک بند کر کے اٹھتیں اور "طفیل سائیں دولھے شاہ جی" کہتی ہوئی ان برتنوں پر "چھوہ" کرتیں اور عورتیں یہ پانی اپنے عزیزوں کو پلاتیں تو بیمار اچھے ہو جاتے۔ بُرے نیک ہو جاتے، بے نماز نمازی ہو جاتے۔

ان دنوں مجھے یوں لگنے لگا جیسے تم نور کی بنی ہوتی تو خیر ہمیشہ سے ہو پر اب تم بی بی جی کے ہاں سے واپس گھر میں آئیں تو تمہارے چہرے پر میری نظریں نہ جم پاتیں، جیسے سورج پر نظر نہیں جمتی۔

خدا اور رسولؐ کے بعد تم سائیں دولھے شاہ جی کا نام جپتی رہتی تھیں اسی لیے تو تمہارے بابا ایک بار تمہیں سائیں دولھے شاہ جی کے مزار پر سلام بھی کرا لایا تھا۔

قرآن شریف تم نے اتنا پڑھا میرے جگر کی ٹکڑی کہ اب بھی جب چار طرف سناٹا ہے اور صرف اِدھر اُدھر سے سسکی کی آواز آجاتی ہے، میں تمہارے آس پاس، تمہاری ہی آواز میں قرآن شریف کی تلاوت سن رہی ہوں۔ تمہارے ہونٹ تو نہیں ہل رہے۔ پر میں اپنے دودھ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ یہ آواز تمہاری ہے۔ زمین پر ایسی نورانی آواز میری رانو کے سوا اور کس کی ہو سکتی ہے۔

ایک دن جب تمہارے چاچا دین محمد کی بیوی اپنے بیٹے کے لیے تمہارا رشتہ پوچھنے آئی تو تب مجھے معلوم ہوا کہ تم شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہو۔ مائیں تو بیٹی کے سر پر چنی لیتے ہی سمجھ جاتی ہیں کہ وقت آرہا ہے، پر تمہارے بارے میں تو میں سوچ ہی نہ سکی۔ تم نے سوچنے کی مہلت ہی نہ دی۔ میں نے تمہارے بابا سے اپنی اس بے خبری کی بات کی تو وہ بولا "تو تو سدا کی بے خبری ہے پر میں ایسا بے خبر نہیں ہوں۔ بس یہ ہے کہ مجھے لڑکی سے ڈر لگتا ہے۔ اس سے بھی تو بات کرو۔ اس نے تو جیسے اپنا سب کچھ مولا کی راہ میں تج دیا ہے۔

تب پہلی بار مجھے تم سے خوف آیا۔ میں نے سوچا اگر میں نے تم سے رشتے کی بات کی تو کہیں تم جلال میں نہ آجاؤ۔ مگر پھر اسی شام کو حضرت شاہ کا ایک خادم آیا اور اس نے بتایا کہ کل سے سائیں دولھے شاہ جی کا عرس ہے جو تین دن تک چلے گا اور سائیں حضرت شاہ نے خواب میں سائیں دولھے شاہ جی کو دیکھا ہے اور یہ فرماتے سنا ہے کہ میری چیلی رانو کو بلا کر تین دن تک اس سے میرے مزار

پر قرآن شریف کی تلاوت کراؤ ورنہ سب کو بھسم کر دوں گا۔ تم جانتی تھیں بیٹی کہ سائیں دولھے شاہ جی بڑے جلال والے سائیں تھے۔ زندگی میں جس نے بھی ان کے خلاف کوئی بات کی، اُسے بس ایک نظر بھر کر دیکھا اور راکھ کر ڈالا مرنے کے بعد بھی ان کی درگاہ میں یا اس کے آس پاس کوئی براکام یا بڑی بات ہو جائے تو ان کا مزار شریف سرھانے کی طرف سے کھُل جاتا ہے اور اس میں سے ان کا دست مبارک بلند ہوتا ہے۔ بُرا کام یا بُری بات کرنے والا جہاں بھی ہو کھنچا چلا آتا ہے۔ اپنی گردن سائیں جی کے دست مبارک میں دے دیتا ہے اور پھر وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ سائیں جی کا دست مبارک واپس مزار شریف میں چلا جاتا ہے اور مزار شریف کی دراڑیں یوں مل جاتی ہیں جیسے کبھی کھلی ہی نہیں تھیں۔

کس کی مجال تھی کہ سائیں دولھے شاہ جی کا حکم ٹالتا۔ دوسرے دن صبح کو ہم تینوں ایک اونٹ پر کجاوے میں بیٹھے تھے اور درگاہ سائیں دولھے شاہ جی کی طرف جا رہے تھے۔ میں کجاوے کے ایک طرف تھی اور تم میری جان دوسری طرف تھیں اور درمیان میں اونٹ کے پالان پر تمہارا بابا بیٹھا تھا اونٹ جونہی اٹھا تھا اور چلنے لگا تھا تو تم نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی تھی، اور میری پاک اور نیک بچی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ہمارا اونٹ جہاں سے بھی گزرتا تھا، لوگ دور دور سے کھنچے چلے آتے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور رو رہے تھے اور سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ رہے تھے اور کجاوے کے اوپر چڑیوں، ابابیلوں اور کبوتروں کے جھنڈ کے جھنڈ آتے تھے اور غوطہ لگا کر جیسے میری بچی کی آواز کا شربت پی کر ناچتے تیرتے ہوئے دور نکل جاتے تھے اور میں سوچتی تھی کہ یہ ہم گنہگاروں کی کس نیکی کا بدلہ ہے کہ خدا نے ہمیں ایسی بیٹی بخشی ہے جو زیر زبر پر قرآن شریف کی تلاوت کرتی ہے تو اس کی آواز آسمان تک جاتی ہے۔

آسمان کا خیال مجھے یوں آیا تھا کہ ایک بار تمہارے بابا نے پالان پر سے جُھک کر میرے کان میں ہولے سے کہا ـــــ " اوپر دیکھو ـــــ یہ کیسے نورانی پرندے ہیں جو ہمارے ساتھ ساتھ اڑ رہے ہیں۔ میں نے ان علاقوں میں ایسا پرندہ کبھی نہیں دیکھا کہ ان کے پروں میں ستارے چمک رہے ہوں۔ یہ تو آسمانوں سے اتر کر آنے والے فرشتے معلوم ہوتے ہیں! ـــــ اور میری آنکھوں کا نور بچی، میں تمہاری جاہل ماں بھی قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ وہ فرشتے ہی تھے ـــــ کچھ ایسے جیسے ننھے منھے بچوں کے پر لگ گئے ہوں اور وہ ہوا میں ہمکتے پھرتے ہوں ـــــ وہ میری پہنچی ہوئی بیٹی سے تلاوت سننے آتے تھے۔

پھر جب درگاہ سائیں دولھے شاہ جی کے پاس ہمارا اونٹ بیٹھا تھا تو جیسے تم بھول گئی تھیں کہ تمہارے ساتھ تمہارے ماں باپ بھی ہیں ـــ تم مزار شریف کی طرف یوں کھنچی چلی گئی تھیں جیسے سائیں دولھے شاہ جی تمہاری انگلی پکڑ کر تمہیں اپنے گھر لیے جا رہے ہیں۔ مزار شریف کو بوسہ دیکر اور اس کے ایک طرف بیٹھ کر تم نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی تھی اور تمہاری آواز کی مٹھاس چکھنے کے لیے عرس پر آنے والے لوگ مزار شریف پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ہم دونوں نے مزار شریف کو اپنی پوروں سے چھوا اور پھر اپنی پوریں چوم لیں۔ پھر ہم سائیں حضرت شاہ کی خدمت میں ان کے زانوؤں کو چھونے اور دستِ مبارک کو چومنے پہنچے تھے اور انہوں نے فرمایا تھا " اپنی بیٹی کو سائیں جی کے قدموں میں بٹھا کر تم نے اپنے اگلے پچھلے گناہ معاف کرا لیئے ہیں، تم انشاء اللہ جنتی ہو " یہ سن کر خوشی سے ہماری سانسیں پھول گئی تھیں۔ پھر میں نے اندر جا کر بی بیوں کو سلام کیا تھا اور تمہیں ـــ میری جان ـــ سائیں دولھے شاہ جی اور سائیں حضرت شاہ جی اور ان کے گھرانے کی بی بیوں کی امانت

میں دے کر ہم دونوں یہ کہہ کر واپس گاؤں آگئے تھے کہ عرس کے تین دن گزرنے کے بعد اگلے روز ہم اپنی اس نعمت کو لینے حاضر ہو جائیں گے جو خدا نے اور اس کے حبیب پاک نے ہم غریبوں گنہگاروں کو ہماری کسی سیدھی سادی نیکی سے خوش ہو کر بخشی ہے۔

اے میری بچی، اے میرے جگر کی ٹکڑی، اے میری صاف ستھری رانو بیٹی! پھر جب تین دنوں کے بعد ہم دونوں سائیں دولھے شاہ جی کے مزار شریف پر گئے تھے تو تم وہیں بیٹھی تھیں جہاں ہم تمہیں بٹھا گئے تھے، مگر کیا یہ تمہی تھیں؟ تمہاری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔ تمہارے ہونٹوں پر جمے ہوئے خون کی پپڑیاں تھیں۔ تمہارے بال اُلجھ رہے تھے چادر تمہارے سر سے اتر گئی تھی مگر اپنے بابا کو دیکھ کر بھی تمہیں اپنا سر ڈھانپنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ تمہارا رنگ مٹی مٹی ہو رہا تھا اور ہمیں دیکھتے ہی تم چلا پڑی تھیں ـــ "مجھ سے دور رہو بابا۔ میرے پاس نہ آنا اماں میں اب یہیں رہوں گی۔ میں اس وقت تک یہیں رہوں گی جب تک سائیں دولہا شاہ جی کا مزار شریف نہیں کھلتا اور اس میں سے ان کا دست مبارک نہیں نکلتا۔ جب تک فیصلہ نہیں ہوتا میں یہیں رہوں گی۔ جب تک انصاف نہیں ہوگا میں یہیں رہوں گی اور مزار شریف کھلے گا آج نہیں تو کل کھلے گا۔ ایک مہینہ بعد، ایک سال بعد، دو سال بعد سہی، پر مزار شریف ضرور کھلے گا اور دست مبارک ضرور نکلے گا۔ تب میں خود ہی اپنے بابا اور اپنی اماں کے قدموں میں چلی آؤں گی اور ساری عمر ان کی جوتیاں سیدھی کروں گی اور ان کے پاؤں دھو دھو کر پیوں گی۔ پر اب میں نہیں آؤں گی، اب میں نہیں آسکتی۔ میں گندھ گئی ہوں۔ میں مر گئی ہوں"۔ پھر تمہیں ایک دم بہت سا رونا آگیا تھا مگر تم نے ایک دم اپنے آنسو روک لیے تھے اور تم بھیگی ہوئی

آواز میں تلاوت کرنے لگی تھیں۔ آس پاس کھڑے ہوئے بیسیوں لوگ ہمارے ساتھ زار زار رونے لگے تھے اور کہنے لگے تھے۔ "اثر ہوگیا ہے دن رات مزار شریف پر رہنے سے اس پر اثر ہو گیا ہے۔"

تمہارے بابا نے فریاد کی تھی "یہ اثر ہوگیا ہے؟ دن رات قرآن شریف کی تلاوت کرنے والی لڑکی پر کوئی اثر کیسے ہو سکتا ہے؟ اور اگر تم کہتے ہو کہ اثر ہوگیا ہے تو سائیں حضرت شاہ کہاں ہیں؟" وہ روتا ہوا سائیں حضرت شاہ کی طرف چل پڑا تھا اور میں بلکتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ مگر ہمیں خادموں نے بتایا تھا کہ سائیں جی تو عرس کے فوراً بعد ایک حجرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور کئی دنوں تک وظیفہ فرماتے ہیں اور کسی سے نہیں ملتے۔ پھر میں نے اندر بی بیوں کے پاس جانا چاہا تھا مگر بڑے دروازے پر خادماؤں نے بتایا تھا کہ رانو کی حالت سے بی بیاں پہلے ہی بہت پریشان ہیں اور انہیں اور زیادہ پریشان کرنا گناہ ہے۔

ہم پھر لپک کر مزار شریف کی طرف گئے تھے مگر اب کے میری بچی، تم نے ہمیں دیکھا تو تمہیں جلال آگیا تھا اور تم نے اتنے زور سے چیخ کر کہا تھا کہ "تم چلے کیوں نہیں گئے" کہ مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ چیخ اس حلق سے نکلی ہے جس نے تلاوت کے سوا کبھی کچھ کیا ہی نہیں۔

ہم اجڑے بچھڑے ماں باپ، مزار شریف سے ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئے تھے اور رو رہے تھے اور لوگ ہمیں روتا دیکھ کر رو رہے تھے کہ سائیں حضرت شاہ جی کا خاص خادم آیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ سائیں جی کو بھی رانو کی اس حالت کا بڑا دکھ تھا اور انہوں نے فرمایا تھا کہ یہ لڑکی اچانک جن بھوت کے قبضے میں چلی گئی ہے اور سائیں حضرت شاہ ایک خاص وظیفہ فرما رہے ہیں کہ یہ جن اترے تو اس امانت کو اس کے ماں باپ تک پہنچایا جائے۔ پھر حکم ہوا تھا کہ تم جاؤ اور رانو کو درگاہ شریف کی نگرانی میں

رہنے دو۔

"اب تم جاؤ" ہمارے سروں پر تمہاری آواز آئی تھی اور ہم نے سر اٹھا کر دیکھا تھا کہ تمہاری آنکھیں تالابوں کی طرح بھری ہوئی تھیں۔ "اب تم جاؤ میرے بابا۔ جاؤ میری اماں۔ اب تم جاؤ۔ مزار شریف ضرور کھلے گا۔ دستِ مبارک ضرور نکلے گا۔ فیصلہ ضرور ہو گا۔ فیصلہ ہو جائے تو میں سیدھی تمہارے پاس پہنچوں گی۔ سائیں دولھے شاہ جی خود مجھے تمہارے پاس چھوڑ جائیں گے۔ اب تم جاؤ۔" یہ کہہ کر تم مزار شریف کی طرف پلٹ گئی تھیں اور تم چلتے ہوئے یوں ڈول رہی تھیں جیسے کٹی ہوئی پتنگ ڈولتی ہے۔

میں تم پر سے صدقے جاؤں میری بیٹی۔ ہم تمہارے ماں باپ اس کے بعد بھی بار بار تمہارے پاس پہنچے مگر اب تو تم ہمیں پہچانتی بھی نہیں تھیں۔ ہم تمہیں پکارتے تھے تو تم ہماری طرف یوں خالی خالی آنکھوں سے دیکھتی تھیں جیسے حیران ہو رہی ہو کہ یہ آواز کدھر سے آئی ہے۔ تمہارا رنگ خاکستری ہو گیا تھا۔ تمہارے ہونٹ اکڑ کر پھٹ گئے تھے۔ تمہارے بالوں میں گرد تھی اور تنکے تھے اور ٹوٹے ہوئے خشک پتے تھے۔ ایک بار جب ہم تمہارے لیے کپڑوں کا نیا جوڑا لے کر گئے اور ہم نے یہ کپڑے تمہارے سامنے رکھ دیئے تو تم یہ کپڑے ہاتھ میں لے کر اٹھیں اور ایک طرف چل پڑیں۔ تمہارا ایک بھی قدم سیدھا نہیں اٹھتا تھا۔ پھر تم غائب ہو گئی تھیں اور ہم خوش ہوئے تھے کہ تم کہیں کپڑے بدلنے گئی ہو۔ مگر پھر ایک دم ایک طرف سے شور اٹھا تھا۔ تم اسی رفتار سے واپس آ رہی تھیں اور تمہارے پیچھے درگاہ شریف کے چند خادم تھے جنہوں نے بتایا تھا کہ تم نے نئے کپڑوں کا یہ جوڑا درگاہ شریف کے لنگر کی دیگ کے نیچے بھڑکتی آگ میں جھونک دیا تھا۔

تلاوت تو تم اب بھی کر رہی تھیں مگر آواز میں چاندی کی کٹوریاں نہیں

بجتی تھیں - پھر تم پڑھتے پڑھتے مزار شریف کے سرہانے کی طرف جھک جاتی تھیں۔ جیسے کوئی جھری، کوئی دراڑ ڈھونڈنے کی کوشش میں ہو۔ پھر تم ٹوٹ کر رو دیتی تھیں اور تلاوت کو روک کر ہولے ہولے جیسے خود کو سمجھاتی تھیں ۔ مزار شریف ضرور کھلے گا۔ دست مبارک ضرور نکلے گا۔ فیصلہ ضرور ہوگا۔ انصاف ضرور ہوگا۔ پھر تم آنکھیں بند کر لیتی تھیں اور تلاوت میں مصروف ہو جاتی تھیں۔

ایک بار ہم سائیں حضرت شاہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے اور عرض کیا تھا کہ جن بھوت کلام پاک پڑھنے والوں کے پاس کبھی نہیں پھٹکتے۔ دور سے بیٹھے ہنستے رہتے ہیں اور جھومتے رہتے ہیں اور اگر ہماری ہیرا بیٹی پر ایسے کافر جن آ گئے ہیں جو قرآن شریف کی تلاوت کا بھی لحاظ نہیں کرتے، تو یہ آپ کی درگاہ شریف ہی کے جن ہیں آپ کے حکم سے اتر جائیں گے۔ خدا کے نام پر، رسول پاک کے نام پر، پیر دستگیر کے نام پر، سائیں دولھے شاہ جی کے نام پر ہمارے ساتھ مزار شریف پر چلئے اور یہ جن اتاریئے اور سائیں حضرت شاہ نے فرمایا تھا کہ ہم جن تو اتار دیتے مگر تم نے ٹھیک کہا۔ یہ کوئی بڑا کافر جن ہے اور کافر جن ہمارے قبضے میں نہیں ہیں۔ ہم یہاں دعا کر رہے ہیں۔ تم گھر جا کر دعا کرو۔ ہمارا وظیفہ جاری رہے گا۔

جب ہم ٹوٹے پھوٹے واپس آ رہے تھے تو بی بیوں کی ایک بوڑھی خادمہ نے مجھے ایک طرف لے جا کر بتایا تھا کہ عرس کے تیسرے دن سائیں حضرت شاہ مزار کی طرف آنے تھے تو تمہاری بدنصیب بیٹی نے مزار شریف پر سے گول گول بھرتیے پتھر اٹھا کر جھولی میں بھر لیے تھے اور چیخ چیخ کر کہا تھا کہ سائیں! مزار شریف سے دست مبارک تو جب نکلے گا، نکلے گا۔ اگر تم ایک قدم بھی آگے بڑھے تو میں سائیں دولھے شاہ جی کے دیئے ہوئے ان پتھروں سے تمہارا ناس کر دوں گی۔ خادم تمھاری بیٹی کو پکڑ کر مارنے پیٹنے کے لیے آگے بڑھے تھے تو سائیں جی نے

انہیں روک کر کہا تھا کہ نادانو، یہ لڑکی نہیں بول رہی ہے اس کے اندر کا کافر جن بول رہا ہے۔ جب تک یہ مزار شریف پر قابض ہے ہمیں اور ہمارے خاندان کے کسی مرد عورت کو ادھر نہیں آنا چاہیئے۔ ورنہ کیا خبر یہ جن کیا کر بیٹھے۔

پھر رات درگاہ شریف کا ایک خادم آیا کہ تمہاری بیٹی تمہیں بلا رہی ہے ہم راتوں رات گرتے پڑتے وہاں پہنچے تو تم مزار شریف کی پائنتی لیٹی ہوئی تھیں چراغ کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ تمہاری نظر ٹک گئی تھی اور تمہارے ہونٹ ذرا ذرا سے ہل رہے تھے۔ ظاہر ہے تم اس وقت بھی تلاوت ہی کر رہی تھیں۔ پھر جب میں نے تمہارا سر اپنی گود میں رکھا اور تمہارے بابا نے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر رونا شروع کر دیا تھا تو نہایت ہی کمزور آواز میں تم نے کہا تھا "میری اماں۔ میرے بابا۔ کون جانے مزار شریف کیوں نہیں کھلا۔ انصاف تو نہیں ہوا پر چلو فیصلہ تو ہوگیا۔ چلو میں ہی گنہگار سہی سائیں دولھے شاہ جی آپ نے تو بڑا انتظار کرایا۔ اب قیامت کے دن جب ہم سب خدا کے سامنے پیش ہوں گے — جب ہم خدا کے سامنے پیش ہوں گے — خدا کے سامنے — خدا —! اس کے بعد تم چپ ہوگئی تھیں اور تب سے چپ ہو —"

پھر ہم تمہیں یہاں گھر میں اٹھا لائے اور جب ابھی ابھی صبح سویرے سائیں حضرت شاہ کا خاص ملازم سائیں جی کی طرف سے تمہارے لیے کفن لایا تو تم پر سے اترا ہوا جن جیسے تمہارے بابا پر آگیا۔ اس نے کفن ہاتھ میں لیا اور اسے اس چولھے میں جھونک دیا جس پر تمہیں غسل دینے کے لیے پانی گرم کیا جا رہا تھا۔

اے میرے جگر کی ٹکڑی، میری نیک اور پاک، میری صاف اور ستھری رانو بیٹی! آؤ میں تمہارے ماتھے کے بجھے ہوئے چاند کو چوم لوں دیکھو کہ بکائن کے اودے اودے پھول مہک رہے ہیں اور بیریوں

پر گلہریاں تنے سے چوٹی تک بھاگی پھر رہی ہیں اور ہوا ایسی چل رہی ہے جیسے صدیوں کے سوکھے کواڑوں سے بھی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی اور چار طرف تمہاری تلاوت کی گونج ہے اور سائیں حضرت شاہ کے بھیجے ہوئے کفن کے جلنے کی بو اب تک سارے میں پھیل رہی ہے اور میرے اندر اتنا بہت سا درد جمع ہو گیا ہے جیسے تمہیں جنم دیتے وقت جمع ہوا تھا۔

قرۃ العین حیدر

قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے

(عالمِ آشوب)

وہ آہنی الماریوں میں دراز تھے تلے اُوپر۔ جس طرح اخبارات کے دفتروں کے اندرونی نیم تاریک سیلے ہوئے کمروں اور گوداموں کی کھلی آہنی الماریوں میں OBITS کے گرد آلود فائل۔ اُوپر تلے کولڈ پرنٹ کے سرداب بیرونی دفاتر کی چہل پہل اور روشنی سے معمور۔ دریچوں سے جھانکتا سورج۔ ٹیلی پرنٹر سے متواتر نکلتا ربن بے تحاشا سزائے موت کی مسلسل خبروں سے پُر۔ کولڈ پرنٹ کی چند سطروں میں منتقل ہو کر چھپنے والے وہ نیوز آئٹم آہنی الماریوں میں سرد سرمئی فرش پر قطار اندر قطار مہمول ہیں صحرا میں یا یہ یاں سوری یا مُردے قطار اندر قطار۔ جرنیلی یونیفارموں پیرس کے سلے سوٹوں میں بوٹوں سمیت سرد چند ماہ قبل جب ..ہم ادھر کا چاند طلوع ہوا تھا رسان فرانسسکو میں مہ ناز اپنے ساتھیوں کے ساتھ صبح صبح JOGGING کر کے لوٹتی اور بریکفاسٹ کے ساتھ ساتھ وہ ٹیپ عقیدت سے سنی جاتی جو وہ پیرس سے لائی تھی وہ سر پہ اسکارف باندھنے لگی تھی اور ڈسکو کے بجائے شام کو اب نمازیں پڑھتی تھی۔

"تو وہ عزوجاہ سکندری من و رسم و راہ قلندری"
کیسٹ بدلتے ہوئے وہ زور سے للکارتی۔
تخت سے تختہ نگاہِ مردِ مومن ر

نیو یارک۔ بی بی سی۔ بر او النٹرز سے سوالات کا جواب دیتا۔ نیا جواں سال وزیر

ٹیلی ویژن اسکرین پر متبسم - نازاں۔

بدل جاتی ہیں تقدیریں۔ مقدمے کے فوراً بعد ایک سپاہی آگے بڑھا اُس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ کر۔ جو کوئے یار سے آئے تو۔

مقدمہ چلائے جانے سے لے کر فیصلہ سنائے جانے سے لے کر آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھنے سے لے کر زیرِ دیوار کھڑا کر کے گولی کا نشانہ بنائے جانے کے لمحے تک کے چند گھنٹوں یا چند دنوں کی کیفیت کا بیان مختصر الفاظ میں کرو۔ رواں تبصرہ۔ مختصر الفاظ میں دس نمبر کا سوال۔

خود اعتمادی سے باربرا والٹرز کے سوالوں کا جواب دیتا نازاں، متبسم۔ بدل جاتی ہیں تقدیریں چار دن سے شیو نہیں کیا "عدالت" کے سامنے بھونچکا۔ سرنگوں آنکھوں پر سیاہ پٹی کا منظر۔ ان نینوں کے یہی پسر یکھ وہ بھی دیکھا یہ بھی۔

باربرا والٹرز خندہ زن خندہ زن۔ زیرِ دیوار۔ گولیوں کی باڑھ۔ سرد لپے میں سردِ سرد خاک۔ سرد بچھاڑے اپنی قبریں کھودتے مرد و زن۔ مرد و زن (یہ وزن خندہ زن خندہ زن)

آہ کرنے کا سبب پوچھا تو۔

نشانہ باندھے بندوقچی۔

آہ کرنے کا سبب پوچھا تو۔

کاؤنٹ ڈاؤن۔ دس۔ نو۔ آٹھ۔ سات۔ چھ۔

السلام علیکم یا اہل القبور۔ کھود لیں؟ تو آیئے قطار میں لگ جایئے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے۔ لائن سے۔ لائن سے۔ کیو مت توڑیئے جناب۔

یہاں اس میز سے ایک ایک سیاہ پٹی لیتے جایئے اور اپنی آنکھوں پر باندھتے جایئے ان نینوں نے کبھی یہ پیکھ لائن سے "زمین پر فساد پھیلانے والے" اور "منافقین" اور مرتد اور صدیق "سب ایک طرف ہو گئے" میں اور لڑکیاں دوسری طرف

آہ کرنے کا سبب پوچھا تو شرمانے لگے۔ تازیانوں کے نشاں۔ سب اس قطار میں آجائیں جلدی۔ جلدی۔ افراتفری نہیں۔ سستی۔ ڈسپلن۔ سبب پوچھا تو۔ تازیانوں کے نشان پشت پہ دکھلانے لگے۔ بولی وہ کون ہے عصیاں پہ ملی یہ تعزیز۔ رو کے فرمایا گناہ کچھ بھی نہیں۔ بے تقصیر سلیقے سے۔ پھاوڑے قرینے سے رکھ دیجئے۔ دوسرے آرہے ہیں۔ کچھ کفن کے لئے ہمراہ نہیں لایا ہوں۔ باپ کو چھوڑ کر بے گور وکفن آیا ہوں۔ نکرمت۔ کفن سرکاری ملتے ہیں۔ تشریف لایئے یہ بوترابیوں کی خاک ہے۔ اس میں آپ کی کھودی ہوئی قبریں آپ کی منتظر ہیں منہ پھاڑے۔ گولیوں کی باڑھ۔ گرم خاک۔ سُرخ خاک۔ سرد خاک۔ برف پوش گورستان۔ ان تودہ ہائے خاک کے گرد لالہ کے پھول کھلیں گے؟

جناب تودہ کا ذکر کیا تھا۔

بہارہ آمد نگارہ۔ آمد نگارہ آمد۔

شروع شروع میں ان تصاویر کو دیکھ کر دھکا سا لگا تھا وہ جو انصاف کرنے آئے تھے وہ بھی۔

ET TV

جواباً مہ نارہ غضبناک ہوئی۔ تم مخالفوں میں سے ہو۔ ایجنٹ۔

دنیا میں صرف دو گروہ ہیں۔ موافق اور مخالف۔

مخالفین واجب القتل ہیں

اب عادت سی ہو گئی ان تصویروں اور خبروں کی عادت ہو گئی ہے۔ فسادات اور قتل عام اور اجتماعی سزائے موت کی خبروں کی عادت ہو گئی ہے۔ قحط زدہ بچوں، بمباری اور فسادوں اور جنگوں میں کٹے پھٹے، اعضاء سے محروم اندھے بچوں کی تصویروں کی عادت ہو گئی ہے "یہ بچہ کس کا بچہ ہے" اور فلسطینی بچے کی لوری" جیسی دل دوز نظمیں بے اثر ہو چکیں۔ بندہ بشر عادت

کا پتلا ہے۔

پھانسی سے لٹکتی لاشوں کی تصویروں کی بھی عادت

وہ تصاویر جن کا آپ نے ذکر کیا ہے مندرجہ بالا سطور میں۔ وہ سچی ہیں لیکن موخرالذکر تصاویر اور خبریں سفید جھوٹ۔ جعلی، فرضی، افترا، بہتان، مغرب کا جھوٹا پروپیگنڈا آپ شیطان کی ایجنٹ ہیں۔

اس مشہور سائنس دان نے ایک بڑے چاؤ سے اپنے پوتوں پوتیوں کی تصاویر دکھلائی تھیں وہ بھی آہنی الماری میں دراز ہے اور وہ مادام۔

ان مادام کی ولا میں پھول ہی پھول تھے اندر نفیس الماریوں میں فلسفۂ تعلیم کی فرنچ کتابیں۔ اسکولوں اور کالجوں کی رپورٹیں۔ نماز پڑھ کر سالوں میں آئیں۔ میں نے اپنی ساری عمر تعلیم نسواں کے فروغ کی جدوجہد میں گذاری ہے۔ ہماری پانیر خواتین نے رجعت پسندوں کا مقابلہ کیا۔ بڑی بڑی قربانیاں دیں تاکہ ہماری لڑکیاں پڑھ لکھ سکیں۔ یہ ان کی دھندلی تصاویر دیکھئے آج سے ساٹھ ستر سال قبل انھوں نے دریچے کے باہر سیب سے لدا درخت سرسرایا۔ سالوں کی دیوار پر اس کی ٹہنیوں کا سایہ لرزاں تھا۔ ایک ٹہنی پر ایک بُلبل آ بیٹھی۔ اگست رینوئر کی ایک بڑی پینٹنگ کے عین مقابل جنگل کی کھلی فضا میں دوڑتی بچیوں کی اس تصویر پر سیب کی شاخوں کا سایہ متحرک وہ خوبصورت دیوار اچانک صحن زنداں کا کھردرا بخون آلودہ پُشتہ۔ اب مادام اس سے لگی کھڑی ہیں۔ آنکھوں پہ سیاہ پٹی۔ گولیوں کی باڑھ۔ پل کی پل میں پُل صراط۔

مادام کی ولا سے کچھ فاصلے پر وہ فنکاروں کا قہوہ خانہ تھا۔ اس قہوہ خانے میں ایک شام اس نامور ڈرامہ نگار نے اپنی نئی تمثیل کا پلاٹ سنایا تھا۔ ہال کے ایک گوشے میں ٹیلی ویژن پر جدید PASSION PLAY دکھلایا جارہا تھا۔

"ہمارے ہاں دو زبردست ڈرامہ نگار تھے۔ انیس و دبیر۔ اگر ان کے مراثی کو اسٹیج کیا جاتا۔ ایک اور پہلا نے شاعر کا نوحہ سنیئے،" اس ڈرامہ نگار نے کہا۔

"کیا جانیئے کیا کیا ابھی دکھ پائے گی زینبؑ"،
"گھبرائے گی زینبؑ کہ کیسا یہ بھرا گھر ہوا برباد الہٰی۔ کیا آئی تباہی"،
نامور ڈرامہ نگار مبہوت ہو کر سنتا رہا۔
"پوچھیں گے جو سب لوگ کہ بازو کو ہوا کیا۔ یہ نیل ہے کیسا۔ کس کس کو نشاں رسی کے دکھلائے گی زینب۔ گھبرائے گی زینب۔ لیکن آپ کی زبان میں اس کا ترجمہ مشکل ہے"۔
"ہو سکتا ہے ضرور ہو سکتا ہے۔ ان دونوں زبانوں میں زیادہ فرق نہیں اس کو اسٹیج پر میں پیش کروں گا"۔
جو PASSION PLAY ہم نے جرمنی میں دیکھے پچھلے سال۔ اسی میڈیول سٹینگ میں"۔ ایک اداکار نے اس کی بات کاٹی۔
لیکن انسان کے کرب کو آخری وقت کے کرب کو موت کا سامنا کرنے والے کے کرب کو اسٹیج پر پیش کرنا مشکل کام ہے۔ اس کرب کو وہی جانتا ہے کمیونی کیٹ نہیں کر سکتا کیونکہ مر جاتا ہے"۔ ڈرامہ نگار جوشیلی آواز میں بولا۔ "سنئے میری اس تمثیل کا ایک مکالمہ ہے"،
ساری دنیا کے جدید تھیٹر کے قہوہ خانوں کی طرح یہاں بھی جوشیلی بحثیں جاری تھیں۔ ایک اور بند سنیئے،
ڈرامہ نگار سے کہا "جناب قاسم شہید ہونے کے لیئے جا رہے ہیں۔ ان کی دلہن کہتی ہے۔ رہنے کا ٹھکانہ کہیں بتلا کے سدھارو۔ گوشے میں دلہن کو کہیں بٹھلا کے سدھارو۔ تم چھوٹتے ہو عالم تنہائی ہے اس پر تم چھوٹتے ہو"۔
نامور ڈرامہ نگار بڑے دھیان سے سنا کیا۔
ناظرین و سامعین یہ ایک ایسا PASSION PLAY چار سال سے جاری ہے جس میں انگنت بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں، بچے عیسیٰؑ کے اور حسینؑ کے PASSION-
یہ PASSION کیا بلا ہے؟ جنونِ عشق؟

جی ایسا ہے کہ عیسٰی کی صلیب پہ جانکنی کے کرب کو PASSION کہا جاتا ہے۔

اوہ۔ آئی سی۔ مگر آپ اتنی مغربی اصطلاحات کیوں استعمال کرتی ہیں۔

اس نامور ڈرامہ نگار کی شادی ہو رہی تھی۔ کمرے میں رشتہ دار، مہمان، مولوی گواہ، سفید سروسی لباس میں دلہن۔

دروازے پہ دستک۔

رہنے کا ٹھکانہ کہیں بتلا کے سدھارو۔ گوشے میں دلہن کو کہیں بٹھلا کے آنکھوں پر سیاہ پٹی سدھارو۔ ایک ایک گھٹنا زمین پہ ٹیکے بندوقچیوں کی قطار گولیوں کی باڑھ۔ سدھارو۔ تم چھوٹتے ہو عالم تنہائی بخون میں غلطاں تڑپتی ہوئی لاش کھڑنجی دیوار کے نیچے۔ واجب القتل تھا۔

دیوار کے نیچے PASSION PLAY

سفید جھوٹ ——— سراسر غلط ——— مغرب کا جھوٹا پروپیگنڈہ، بہتان، اخوان الشیاطین کا افترا۔

نوجوان لڑکوں لڑکیوں کی قطاریں گردنوں سے جھولتی۔ مرتانہ بھی گردن سے جھولتی۔

مرتانہ؟ وہ تو سان فرانسسکو سے جوش و خروش کے ساتھ واپس گئی تھی بغرضِ تعمیرِ نو۔

صبح منہ اندھیرے JOGGING کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ سر جھکا۔ آنکھیں اُبلی، زبان باہر، پاؤں بندھے، ہاتھ پشت پر رسی سے جکڑے مزے سے لٹک رہے ہیں۔

ایک صبح دو کھلاڑی لڑکیوں کے مُردہ چہروں پہ سے سفید ٹوپ اتارتے

ہوئے جلاد انہیں پہچان گیا۔ وہ ایک حاملہ عورت کے ساتھ ایک قطار میں آویزاں تھیں چند سال قبل ہزارہا کھلاڑی لڑکیوں لڑکوں کے ساتھ انہوں نے بھی اسٹیڈیم میں ایتھلٹکس کے کرتب دکھلائے تھے ROMAN RINGS پر نوجوانوں نے اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ سب ایک لائن سے آویزاں اس رات پھانسی گھر کے اس انچارج کو عظیم الجثہ کابوس نظر آئے۔ جیسے مقتل میں مردوں کے اولمپکس ہو رہے ہوں پھانسیوں کے پھندے وہ ROMAN RINGS کی طرح استعمال کر رہے تھے۔ قلابازیاں کھاتے، قلانچیں بھرتے، جنگلے پھلانگتے سرپٹ دوڑتے مُردہ لڑکے لڑکیاں۔ انواع و اقسام کے کابوس۔ دراز قد سیاہ پوش جنات، سفید فام جنات۔ جو کبھی اپنی پلکیں نہیں جھپکتے کابوس

شام کا وقت جھٹ پٹے کا بڑا ہی ڈپریسنگ ہوتا ہے گھر کے اندر اور باہر بھی ایسا کیوں ہوتا ہے لوگوں کا دم گھبر آتا ہے اس کی وجہ ایک اللہ والی بی بی نے یوں بتلائی تھی۔ فرمایا مرنے والے کو چاہے وہ صبح صادق کے وقت دنیا چھوڑ رہا ہو یا بھری دوپہر کی تیز دھوپ میں، عالم نزع میں اسے لگتا ہے جیسے دن رات مل رہے ہیں۔ جھٹ پٹے کا وقت ہے۔ فانی زندگی میں روزانہ جب دن رات ملتے ہیں آدمی کو ڈپریشن ہوتا ہے ہلکا سا نامعلوم خوف اور اداسی اور دہشت، خفیف سی۔ کیونکہ اس کی روح پہچان جاتی ہے وہ آنے والا عالم نزع یاد کرتی ہے۔ آخری لمحات کا جھٹ پٹا جب زندگی کی روشنی موت کی تاریکی میں ڈوبے گی۔

وہ اس جھٹ پٹے کو پار کر کے لٹک رہے ہیں یا کھرانچی دیواروں تلے اوندھے پڑے ہیں۔ ڈھیریوں کی شکل میں سرزمین پر۔

سرسوتی زیر زمین بہنے والی جو پہلے محض میری آنکھ رکھنے والوں کو نظر آئی تھی۔ سیاہ دھار والی سرسوتی اوپر نکل آئی۔ بڑے بڑے چمتکار دکھلانے والی سیاہ ندی۔ اس کی موٹی گدلی سیاہ دھارائیں زیر زمین بہہ کر کہیں سے کہیں جا رہی ہیں اندر رہی

کہیں بہہ کر پہنچنے والی بڑے بڑے چمتکار دکھلانے والی سرسوتی۔
اس کے کنارے کہیں پہ تخت کہیں پر تختہ۔

بے پناہ دولت بطورِ مالِ غنیمت آئی تھی۔ اسے دیکھ کر حضرت فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا تھا زر و جواہر اور سونے اور چاندی کے اس انبارِ کثیر میں مجھے اُمت کی تباہی نظر آرہی ہے۔

مزے سے لٹک رہے ہیں، غم دوراں سے آزاد۔ قطعی شاعری نہیں بالکل LITERAL واقعہ یہ ہے کہ جہاں وہ ہیں وہاں دار و رسن کی
اپنے اپنے ملک کی رسم ہے۔ کہیں رسّہ کہیں چھُرا کہیں چھرہ۔ کہیں تلوار، پہلے گیس کا دستور تھا۔

ہزاروں مرتبہ کے اذکار میں سے ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ صنوبروں کے اس گھنے جنگل میں آدھی رات کو ایک بند ٹرین آن کر رکی۔ اس کے مہیب سیاہ انجن کی آتشیں روشنی سے جنگل زرد پڑ گیا۔ انجن شائیں شائیں کر رہا تھا۔ سنئے وہ ٹرین ہوتی ہے نا جس میں مویشی لے جائے جاتے ہیں وہ اسی قسم کی ٹرین تھی لیکن جب وہ اس سنسان چھوٹے سے دیہاتی اسٹیشن پہ آن کر رکی تو ایک گارڈ نے سرخ لالٹین کی روشنی میں اس کے پٹ کھولے اور اس میں سے انسان نمودار ہوئے۔ ان کو اتار کر باہر کھڑے بند ٹرکوں میں سوار کرایا گیا۔ ان سب کے ساتھ ہولڈال سوٹ کیس، اٹیچی کیس، بقچیاں کتابوں کے بنڈل اور وائلن کے کیس تھے۔ جن کو انہوں نے بڑی دقت سے خود اٹھا رکھا تھا۔ عورتوں کی گودوں میں اور کندھوں پہ ننھے بچے۔ کچھ بچے اپنی ماؤں یا دادیوں نانیوں کی انگلیوں تھامے چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے چل رہے تھے۔ شدید سردی کی وجہ سے قافلے والوں نے کنٹوپ اور مفلر اور اوور کوٹ پہن رکھے تھے اور ان کے منہ سے جو بھاپ نکل رہی تھی وہ ریلوے اسٹیشن کی مدھم روشنیوں میں

صاف نظر آتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک پورے محلے کی آبادی ہجرت کر کے کہیں جا رہی ہے وہ سب آپس میں ہنس بول بھی رہے تھے۔ چند ایک نے سردی فراموش کرنے کیلئے گنگنانا شروع کر دیا تھا۔ وہ پیشہ ور موسیقار معلوم ہوتے تھے۔

بڑی برفیلی رات تھی۔ کہرہ پڑ رہا تھا جنگلوں میں جو تیز ہوائیں سیٹیاں بجا رہی تھیں اُن میں دور سے آتے ہوئے شوپاں کے سر بھی مل گئے تھے جو بہت فاصلے پر کسی تفریح گاہ میں بجا رہے تھے۔

یہ وہی گھنے خوبصورت پُر فضا رومینٹک جنگل تھے جہاں پچھلی صدی میں گرِم برادران نے پریوں کی کہانیاں ڈھونڈی تھیں اور جہاں سب سے پہلے "خاموش رات مقدس رات" کے سُر گونجے تھے جب ننھے منے جرمن بچے لالٹین سنبھالے گھر گھر جا کے دروازوں کے باہر برف باری میں کھڑے ہو کر یہ نغمہ الاپتے تھے۔ یہیں سے ولادت مسیح کا وہ گیت مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر ساری دنیا میں گایا گیا تھا۔ SILENT NIGHT HOLY NIGHT جو آج تک گایا جاتا ہے۔

اس خاموش رات میں ٹرک ایک میدان میں پہنچ کر ایک بڑی عمارت کے سامنے جا رکے۔ مردوں نے عورتوں لڑکیوں اور بچوں کو اُترنے میں مدد دی۔ سپاہیوں کی قیادت میں برف پر چلتے وہ عمارت کے بیرونی ہال میں داخل ہوئے اپنے شہر سے روانہ ہوتے وقت ان سے کہا گیا تھا کہ ان کو ایک حفاظتی کیمپ میں چند روزہ قیام کے لئے لے جایا جا رہا ہے۔ جہاں سے کچھ عرصے بعد ان کو واپس ان کے گھروں کو بھیج دیا جائے گا وہ سب یونیورسٹیوں کے پروفیسر، قانون دان فلسفی، ماہر لسانیات، سائنسدان، موسیقار اور ادیب تھے اور ان کی بیویاں اور بچے اور ماں باپ دادا نانا پورے کنبے۔

ہال میں ان سے کہا گیا کہ آپ سب غسل کر لیجئے اس کے بعد آپ کو آپ کے کمروں میں پہنچا دیا جائے گا اور قہوہ اور ڈنر پیش کیا جائے گا۔ بوڑھے پروفیسروں نے فوراً وہیں ایک میٹنگ بلائی اور اپنے تین بزرگ ترین نمائندے چنے۔ وہ تینوں اولڈ ورلڈ کرٹسی کے ساتھ کیمپ کے انچارج کے پاس گئے اور اس سے

مودبانہ درخواست کی۔ "ہم سب کو ایک ایک پیالی گرم کافی پہلے پلوا دیجئے اس کے بعد ہم لوگ غسل کر لیں گے۔ بڑی سردی ہے۔" ایک معمر ماہر لسانیات جسے زکام ہو رہا تھا زور سے چھینکا اور فوراً معذرت چاہی۔

متبسم اور خلیق کمانڈانٹ نے اسی اخلاق سے جھک کر جواب دیا "جی نہیں! پہلے غسل بعد میں کافی۔"

وہ سب دو بڑے بڑے کمروں میں لے جائے گئے۔ مرد ایک طرف عورتیں دوسری طرف۔ جہاں انہوں نے اپنے کپڑے اتارے۔ بچوں نے گیلری میں اپنے منے منے جوتے اتار کر سلیقے سے ایک قطار میں رکھے۔ کنٹوپ اور دستانے، کوٹ اور کپڑے اتار کر کھونٹیوں پر قرینے سے ٹانگے، جس طرح ان کو ان کے گھروں پر اور اسکولوں میں سکھایا گیا تھا۔ کپڑے اور جوتے اتارتے وقت بچے آپس میں ہنستے اور لڑتے بھی جاتے تھے۔ ایک بچے نے اپنی ننھی بہن کی چٹیاں کھینچیں۔ ایک بڑی لڑکی نے اسے ڈانٹا۔ نرسوں کی سفید پوشاک میں ملبوس چند فربہ عورتیں اندر آئیں اور ان سب کو ہنکال کر ایک بڑے ہال میں لے گئیں۔ مرد اور عورتیں دوسرے دروازوں سے اس ہال میں داخل کئے گئے۔ پھر سارے دروازے بند کر کے گیس کے سلنڈر کھول دیئے گئے۔

چالیس سال بعد ان مظلوم دانشور بوڑھوں اور فن کار نوجوانوں اور معصوم بچوں کے رشتے دار جو اور جگہوں پر زندہ بچ گئے تھے انہوں نے فریاد کی۔

وہ پہاڑیاں بے حد حسین ہیں جن پر سیدار اُگتے ہیں وہاں خلیل اپنے المصطفیٰ کے لئے گیت لکھتا تھا۔ نیلا سمندر اور سر سبز کوہسار۔ اور افسانوی قلعے۔ صلیبی جنگوں کے زمانے کے اور جدید ترین جھلجھلاتی عمارتیں

کوفے سے ایک ناقہ سوار۔

گیس میں نہانے والوں کی باقی اولاد اور باقی ماندہ رشتہ داروں کی اولاد پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں طیاروں کے پرے بنا کر آئے۔

ناقہ سوار آیا ناگہاں

مرجی، بمبار، عنتری بکتر بند دستے۔ آیئے۔ ان لشکروں کے نام رکھیں۔ ابوالخنوق، ازرق۔ نوفل، ابن زیاد، سنان بن انس، حنظلہ، خولی۔ انہوں نے خوشنما بم گرائے جنہیں معصوم بچوں نے کھلونے سمجھ کر اٹھایا اور بھسم ہوئے۔ رافع۔ مرہ مصراع ابن غالب بکتر بند دستے۔ بمبار طیارے۔ مشین گنیں۔ صرصر کا ادھر طور ادھر راکھ کا عالم۔

۱۹۸۰ء میں دجلہ کے کنارے ہارون الرشید کے شہر میں ایک فلم بنائی گئی تھی۔ جنگ قادسیہ کی فتح کے متعلق نہایت جوشیلی فلم قوم پرستی کے غرور میں شرابور ساتویں صدی عیسوی کی اس قومی فتح کے متعلق جس میں انہوں نے آل ساسان کو شکست فاش دی۔ دجلہ کے کنارے نوجوان لڑکیاں اپنے مرحوم بابوں، شوہروں بھائیوں بھتیجوں کے سوگ میں سیاہ ماتمی پٹیاں بازوؤں پر باندھے، راہگیروں کے ہجوم میں جابجا نظر آرہی ہیں ان سوگ واروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ محاذ جنگ سے لائے ہوئے فوجیوں کے تابوتوں کا جلوس روضۂ حسینؑ میں طویل ہوتا جارہا ہے۔ قومی پرچموں میں ملفوف ان جنازوں کا مزار امامؑ کے گرد طواف کرایا جاتا ہے۔ قبرستان قبروں سے بھر گئے۔ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی۔ ننھے بچے اسکول کے کمسن لڑکے بندوقیں دے کر محاذ پر بھیجے جارہے ہیں۔ دونوں طرف سے ـــ واجب القتل ہیں۔

قرطبہ ہند میں مسجد کے پھاٹک پر ایک پوسٹر چسپاں ہے۔ ایک پیاری بھولی نٹی بچی ردا میں لپٹی۔ ہاتھ میں مشین گن سنبھالے کھڑی ہے۔

اس جگہ پر سورج ڈوبنے کا سماں بے حد سہانا معلوم ہوتا ہے (لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب) مسجد کو جانے والا ایونیو گھنے سایہ دار درخت سرسبز میدان کرکٹ پویلین، محرابوں والی ایک پرانی عمارت جس کے کمروں میں ان بزرگوں کی دھندلی تصاویر آویزاں ہیں جنہوں نے عالم اسلام کی تجدید و اتحاد کے خواب دیکھے۔ حسین مسجد (تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل وہ بھی جلیل و جمیل)

صحن میں اس مرد خدا کا مزار۔ مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب

فروغ۔عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام (اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب، عہد کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل)

وہ ساری دھندلی تصاویر کن لوگوں کی ہیں؟

اجی تھے مرمرا گئے کب کے۔

مسجد کے پھاٹک کے پوسٹر پر وہ ننھی بچی مشین گن سنبھالے۔

فلسطینی بچی ہے؟

جی نہیں غور سے پڑھئے۔ نیچے عبارت عربی میں نہیں۔

ایک بارِیش ہندی نوجوان پوسٹر پر فخریہ نظر ڈالتا نماز کے لیے مسجد کے اندر چلا جاتا ہے۔ ایک سورل مسلم حرم کی۔ واجب القتل ہیں۔

قرطبۂ ہند فی الوقت مشرق کی بہترین اور برِّصغیر کی متمول ترین درسگاہوں میں سے ایک ہے۔ سرسبز و شاداب نئے نویلے تروتازہ ایونیو اور چمن زاروں سے معمور اُس کے الزبیراب یوکلپٹس کی خوشبو سے مہکتے ہیں۔ سڑکوں کے دونوں جانب ستارہ سحری اور گل اشرفی کے تختے لہلہا رہے ہیں گلِ مہر اور املتاس اور ساگوان اور کتیر ورنا اور اکیشیا اور شیشم اور چینی چمپا کی فراوانی سے یہ درسگاہ رشکِ فردوس ہے۔ (تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز۔ اس کے دنوں کا گداز) اس کا کتب خانہ مشرق کے عظیم ترین کتب خانوں میں شامل نئی عالی شان عمارات اور افسانوں اور روایات سے معمور اس کی سرخ پرانی عمارتیں اور راس کے اَن گنت نئے بنگلے۔ اور اگر کیمپس کے باہر ڈھابوں اور شکستہ سڑکوں اور مدقوق بوڑھے اور کمسن رکشہ والوں کو (ان کی اُمیدیں قلیل) جھاڑو سے سمیٹ کر قالین کے نیچے سرکا دیا جائے تو بے شک ہر صبح ہے صبح مصر یہاں ہر شب ہے شب شیراز یہاں۔ سینکڑوں بیرونی لڑکا لڑکی جوق در جوق یہاں پہنچ کر یہاں کے اٹھارہ ہزار لڑکا لڑکے کے انبوہ کثیر میں شامل ہو جاتا ہے اور وہ جو ایک دور افتادہ سطح مرتفع کے دامن سے آئے تھے اور مخالفین میں سے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کو ریفیوجی اسٹیٹس مل گیا ہے۔ ان کو پانچ سو روپیہ مہینہ یو۔این سے ملتا ہے اور وہ

نہیں جانتے کہ یہاں سے کہاں جائیں گے۔ واجب القتل ہیں۔

بہت سے اپنے گرم کوٹ اور دوسرا سامان فروخت کرکے گزر کرتے ہیں اور وہ فلسطینی جو مرجی اور عنتری حملے کی اطلاع ملتے ہی اپنی کتابیں اور اسباب فروخت کرکے دفاعی جنگ میں شامل ہوئے دوسرے روز یہاں سے روانہ ہوئے اور وہاں نہ پہنچ سکے یا پہنچ گئے تو مارے گئے۔ وہ خوبصورت اور ذہین فلسطینی نوجوان بڑی مصیبتوں سے پیسہ حاصل کرکے یہاں پڑھنے آئے تھے۔ اور وہ جوشیلے طاقتور موافقین جو کمزور واجب القتل مخالفین کو مار ڈالتے ہیں دونوں اپنے نوجوان شہیدوں کی تصاویر کے پوسٹر لگاتے ہیں اور —— دیواروں پہ لکھتے پھرتے ہیں۔ مرگ بر فلاں —— مرگ بر ——

آج کی نسل اس لفظ مرگ سے مسحور ہے۔ ان سب کو مرگ پسند اور BRUTALISE کس نے کیا۔ آپ نے۔ اور آپ نے۔ اور آپ نے۔ آپ سب مجرم ہیں راحت کے محلوں کو بلا پوچھ رہی ہے۔ واجب القتل ہیں۔ بستی کے مکانوں کو فنا پوچھ رہی ہے سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ تقدیر اپنی عمر قضا پوچھ رہی ہے قتل کر دیئے گئے ان نوجوانوں کی مرگ کی طرح طرح کے بھیسوں میں آرہی ہے بندوقچیوں کی باڑھ۔ شہری فسادی کا چھرا۔ پولیس کا "این کاؤنٹر" اور خانہ ساز پستول (مجھ کو تو خانہ ساز دے) اور کیسری وردیوں میں ملبوس پریڈ کرتے نوجوان ان سب کو ان مرجیوں اور عنتریوں کو جن کے باپ دادا خود مظلوم شہید ہوئے ان سب کو کس نے BRUTALISE کیا۔ آپ نے اور آپ نے اور آپ نے آپ سب مجرم ہیں۔

کون سب —— ؟

خلفائے اندلس کا آیاتِ قرآنی سے منقش قصر الحمرا اب ایک فائیو اسٹار ہوٹل ہے اس کے کمرے میں دیوار پہ کندہ قرآنی آیات کے عین نیچے بار ہے۔ نہ صرف یہ کہ آج تک کسی مسلم حکومت نے یا کسی ملک کی مذہبی اسلامی جماعت نے اسپینش گورنمنٹ سے اس کے خلاف احتجاج نہیں کیا کہ کم از کم وہ شراب خانہ اس جگہ سے منتقل کر دیا جائے بلکہ نئے ارب پتی کلمہ گو جوق در جوق وہاں جاتے ہیں۔

ریاست مہاراشٹر کے شہر اکولہ میں مسلم نوجوانوں کی ایک تنظیم نے حکم دیا ہے کہ مسلمان عورتیں سینما نہ دیکھیں۔ خلافِ شرع ہے (مردوں کے لئے خلافِ شرع نہیں) تو اکولہ میں ایک بیچارے میاں بیوی سینما دیکھنے گئے۔ ان غیور اور خلاترس نوجوانوں نے بیوی کی ناک کاٹ لی۔ میاں کی زبان کاٹی اور آنکھیں پھوڑ دیں۔ جزاک اللہ۔

آنکھیں تو خیر بہار میں بھی پچھلے دنوں کافی پھوڑی گئی تھیں۔ شعلے سے استفادہ کر کے ڈاکٹر صاحبان پورے پورے کنبوں کو پھوڑنے ڈال رہے ہیں۔ اچھا بتائیے آپ کس قسم کی اعضاء تراشی اور اذیت اپنے لئے پسند فرمائیں گے آپ کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں ، یا ناک کاٹ دی جائے ؟

اعضا تراشی بھی اچھا لفظ ہے۔

پہلے کیا بادشاہ لوگ آنکھوں میں تیل کی سلائیاں نہیں پھروا تے تھے۔

میرے شاہوں کی تعداد کچھ زیادہ ہے۔

تو یہ بیچارے جو مر جاتے ہیں (ہم تو کبھی مریں گے ہی نہیں) ان کی روحیں یا جو کچھ وہ ہے یا نہیں ہے وہ آس پاس منڈلاتی ہیں یا خلاء میں نالہ کناں رہتی ہیں۔ اتنا بڑا خلا۔ اُف وہ "بلیک ہول" کروڑوں اربوں نظامِ شمسی۔ ایک بیچاری چھوٹی سی منّھی روح کہاں بھٹکتی پھرے گی۔ کہیں راستے ہی میں تحلیل ہو جاتی ہو گی۔

شہید ہوئے تو جنت وگرنہ چاہ ہب ہب۔ ہم تو سیدھی بات جانتے ہیں۔

آپ کو ایک حیرت انگیز واقعہ سناؤں ، وہ پارٹی ورکر تھی نا ایک زمانے میں کیلاش رانا۔

کیلاش اور اشیش رانا دونوں پارٹی ورکر تھے۔

بالکل وہی۔

اشیش تو کوہ مر ا گیا کب کا۔

ہاں۔ وہ تو مر گیا کب کا۔ وہی تو قصہ ہے۔ بڑا کامیاب ڈاکٹر تھا۔ ہارٹ اسپیشلسٹ وہ سویڈن گیا ہوا تھا۔ وہیں اچانک ہارٹ فیل۔ ان کے گھر میں بڑے نایاب مجسمے تھے۔

کاٹھیا واڑی وردار بال۔ ساؤتھ کے برونز اور زبردست لائبریری اس بے چارے کی راکھ لاکر کیلاش نے ایک مراکو لیدر کے کتابچے نما صندوقچے میں اس کی عالیشان رائیٹنگ ٹیبل پر رکھ دی۔ قلم دان اور گلدان کے پاس۔ اور خود پوجا پاٹ میں لگ گئی۔ اشیش کی موت سے قبل تک ملحد تھی۔ اب ایک کمرے میں ایک بڑا سا گن پتی اور انواع واقسام کی مورتیاں سجالیں۔ صبح شام پوجا۔ کسی نے بتایا گرگام میں ایک بائی رہتی تھی۔ میناکشی بائی پاؤنڈورنگ۔ شاید اب بھی موجود ہو۔ میڈیم تھی۔

میڈیم ——؟

جی نہیں۔ میڈیم MEDIUM عامل۔ کیلاش فوراً اس کے پاس جانے کو تیار۔ کہا تم بھی ساتھ چلو۔ پتہ لے کر گنجان گرگام کی ایک جھال پال چال کا بوسیدہ چوبی زینہ طے کر کے چھٹے مالے پر اس کی کھولی میں پہنچے۔ وہ ایک معمر سیدھی سادی مراٹھی ہاؤس وائف نکلی۔ یہ بے چاری جس طرح ترکاری مچھلی بیچنے والیوں کو بلاتی ہو گی اس طرح کیا روحیں بلائے گی۔ چلو واپس۔ میڈیم تو وہ ہوتی ہیں تصویروں میں دیکھا ہے۔ روسی ناموں والی پر اسرار نازک اندام حسینائیں۔ پیشانی پر ریشمی فیتہ۔ کانوں میں بالے۔ لمبی مخروطی انگلیاں دبیز قالینوں اطلسی پردوں سے آراستہ نیم روشن کمرہ۔

چاروں طرف نظر ڈالی۔ میلی دیواروں پر گن پتی اور دتاتریہ کے پرنٹ۔ ایک پرانی لیکن آرام کرسی۔ ایک الماری۔ ٹیپکل نچلے متوسط کے مرہٹوں کا گھر۔

لیکن وسط میں پلانچیٹ کی میز جو زندگی میں پہلی بار دیکھی۔ کیلاش رانا نے میناکشی بائی کو بتایا کہ وہ کون ہے اور کیوں آئی ہے۔

میناکشی بائی نے بتایا اس کا شوہر بڑا نامی میڈیم عامل روحانیات وغیرہ تھا۔ وہ اس کے ساتھ یورپ بھی گھوم آئی تھی۔ عرصہ چالیس سال کا ہوا وہ مر گیا تب سے تنہا اس کمرے میں رہتی ہے لاولد ہے تھوڑی سی آمدنی ہے۔ اسی میں گزر کرتی ہے قانع اور پر سکون۔ اس نے ایک گروپ فوٹو دکھایا۔ پیرس۔ ۱۹۲۷ء میڈیم لوگوں کا نفرنس کا گروپ وہ بھی ایک جوان لڑکی ریشمی کاشٹے میں ملبوس بیٹھی تھی۔ ساتھ مسٹر گوپال راؤ پانڈورنگر

آنجہانی دونوں میاں بیوی اسکول ٹیچر سے معلوم ہو رہے تھے کیلاش مایوس نظر آئی۔ شاید ہم لوگ غلط خاتون کے پاس آ گئے تھے یہ بیچاری کیا اتیش رانا جیسے دبنگ آدمی کی سرکش روح بلا پائے گی اور پہلی بات تو یہ کہ روح کا کوئی وجود ہی نہیں۔ وہ پوجا پاٹ تو میں من شانتی کی خاطر کر لیتی ہوں۔

تب دیوار پہ ایک اور گروپ فوٹو گراف دکھلائی پڑا۔ جس میں دھندلی دھندلی شکلوں کے بہت سے گورے فوجی وردیوں میں ملبوس ایک ہجوم کی صورت میں جمع کیمرے کو دیکھ رہے تھے۔ دھندلے ہیولے سے۔ چند کی صورتیں ذرا نمایاں تھیں۔

میناکشی بائی نے سادگی سے کہا فرسٹ ورلڈ وار جو ہوئی تھی نا بائی اس میں ایک برٹش پلٹن کے سارے فوجی فرانس کی ایک خندق میں ایک ساتھ ہلاک ہو گئے تھے ایک یورپین میڈیم نے ایک کیمرہ ایسا ایجاد تھا جو روحوں کے فوٹو کھینچ لیتا تھا۔ اس نے اس رجمنٹ کو خاص کلیات کے ذریعہ اکٹھا کر کے ان کا فوٹو لیا تھا۔

کیلاش چہرہ دوسری طرف کر کے مسکرائی۔ میناکشی بائی نے اپنی بات کا یقین دلانے کی کوشش نہیں کی اور آ کر پلانچٹ کے گرد رکھی تین کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی میز پر انگریزی حروفِ تہجی چھپے ہوئے تھے ایک سے دس تک اعداد۔ اس نے کیلاش سے اس کا اور اس کے شوہر کا نام پوچھا۔ صاف لگتا تھا کہ اس نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ کیلاش کو جس شناسا نے اس کا پتہ بتایا تھا وہ بھی اس سے نہیں ملی تھی۔ بائی کے پاس ٹیلی فون بھی نہیں تھا۔ پھر اس نے کوئی منتر ونتر نہیں پڑھا۔ آنکھیں بند کر کے چند سیکنڈ چپ رہی اور جس طرح بچے کو پیار سے اپنے پاس بلاتے ہیں اس نے کہا بیٹا اتیش رانا آجاؤ۔ آ گئے؟ آجاؤ۔ رانا جی اگر آ گئے ہو تو میز ہلاؤ۔ آ گئے نا؟ ایک دم ہوا کا جھونکا سا آیا اور میز زور سے ہلی۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ میں نے غور سے میز کے نیچے دیکھا۔ میناکشی بائی نے کوئی برقی پنکھا ٹیپ ریکارڈر وغیرہ چھپا رکھا ہو۔ وہاں کچھ نہ تھا۔ اب اس نے کہا۔ تم سوال کرو ٹھاکر صاحب جواب دیتے جائیں گے۔ کیلاش بولی۔ "از اٹ ٹرو اتیش از اٹ یو؟" پنسل انگریزی حروف کی سمت کی۔ میناکشی بائی اور کیلاش نے اس پر انگلیاں ٹکا رکھی تھیں۔ اس نے جو پیغام دیا وہ

لکھتی گئی اشیش انگریزی کے وہی الفاظ اور ایکسپریشن استعمال کر رہا تھا جو اس کی عادت تھی۔ (کیلاش وتی رانا کے تحت الشعور کی طاقت) نیچے گڑگام کی سڑک کے ٹریفک کا بے پناہ شور وغل اور اشیش مہی پت رانا جس نے اسٹاک ہوم کے ایک ہسپتال میں پران تجے تھے تو وہ "پران" گڑگام کی اس چال میں موجود۔ اور اس طرح نارمل باتیں کرنے میں مصروف اور اس کی باتیں ئیں کاغذ پر جلدی جلدی اس طرح لکھتی جا رہی تھی جیسے ٹیلی فون پر کسی کا پیغام نوٹ بک میں لکھا جاتا ہے ناقابلِ یقین۔ اچانک پنسل نے لکھا "KAILO YOU ARE A FOOL" اور جائیداد کے کسی معاملے کے متعلق ہدایات۔ کیلاش نے بعد میں کہا اشیش کبھی کبھار اسے غصے میں کلو پکارتا تھا۔ گو عرصے سے اس نے کلو نہیں پکارا تھا۔ (کیلاش رانا کے تحت الشعور کی زبردست طاقت)

کیلاش اس سے متواتر سوالات کر رہی تھی۔ وہ انگریزی میں زبانی "اس" سے کچھ پوچھتی اور پنسل رواں ہو جاتی۔ چند منٹ بعد اشیش نے حسب عادت ذرا ڈانٹ کر "لکھا" مجھ سے زیادہ سوال نہ کرو میں اپنی اچانک موت کی وجہ سے اب تک بھونچکا ہوں۔ کیلاش نے پوچھا تم وہاں کیا کرتے رہتے ہو "لکھا" ہم لوگ یہاں PRAYERS کرتے رہتے ہیں۔

پکا دہریہ اشیش اور عبادت کر رہا ہے۔ العجب اور وہاں بھی کیا مختلف مذاہب کے الگ الگ عبادت خانے ہوں گے؟ کیا پتہ کنفیوژن میں آ کر اشیش کسی آسمانی چرچ میں جا کے عبادت میں جٹ گیا ہو۔ اس کو فرصت ہی فرصت ہے اس نے چند گھریلو مسائل کے بارے میں کیلاش کو ہدایات دیں اور "گڈ بائی" لکھا۔ پھر ہوا کا جھونکا سا آیا۔ میز ہلی۔ میناکشی بائی نے اس سادگی سے کہا۔ "رانا صاحب واپس گئے۔"

جائیداد کے متعلق کچھ قانونی دستاویزیں اشیش نے "لکھا" فلاں کاغذات فلاں الماری میں رکھے ہیں۔ فلاں وکیل کو بلا لینا۔ وغیرہ۔ وہ سب صحیح نکلا تیسری بار جب گئے اشیش نے اطلاع دی۔ "اب میں چوتھے لوک پہنچ چکا ہوں۔"

یعنی چرچ چہارم؟

مگر اشیش بڑی تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ وفات کے دو ماہ کے اندر اندر چھپ تھے لوک پر جا پہنچا۔ کہنے لگا کیلاش تمہارا بھائی گیانند بھی یہیں پر ہے۔ اس سے ملاقات ہوئی تھی

"اب یہ بات ذرا عجیب سی ہے" وہ خطرناک چوبی زینہ اترتے ہوئے کیلاش نے اظہارِ خیال کیا۔

(گو باقی باتیں عجیب نہیں تھیں) کہنے لگی "کروڑوں اربوں تو آتمائیں پرلوک میں FLOAT کر رہی ہوں گی۔ بھیّا اس بھیڑ بھڑکے میں اور آتنا بڑا آتارا منڈل جس کا نہ اور نہ چھور اسے کہاں مل گئے، گپ ہانک رہا تھا۔ پرلوک میں بھی اس کی گپاسٹک کی عادت نہیں چھوٹی۔"

چند روز بعد کیلاش کا لڑکا امریکہ سے واپس آیا۔ اس نے کہا کن خرافات میں پڑی ہو۔ اپنا دماغ مت خراب کرو۔ چنانچہ اس کے بعد وہ گرگام نہیں گئی۔

مینا کشی بائی پانڈورنگ فیس نہیں لیتی تھی اور کوئی اس کے ہاں جاتا بھی نہیں تھا۔ جانے کیا چکر تھا۔

مگر سوال جوں کا توں موجود ہے کہ سویڈن کے اس ہسپتال میں مرتے وقت بیچارہ اشیش رانا کیا سوچتا ہوگا۔ اور وہ سب سولی چڑھنے والے اور گولی سے اُڑائے جانے والے اور جنگوں میں ہلاک ہونے والے ان کے آخری لمحات۔

فریقِ مخالف کی جو سب مرین ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ڈبو دی گئی۔ ایک مرہٹی شاعرہ نے بحرِ عرب کے کنارے والی تفریحی سڑک پر سے گزرتے ہوئے کہا تھا آج صبح یہ خبر پڑھ کر میرا حلق خشک ہو گیا جیسے میرے منہ میں ریت بھر گئی ہو ——

ٹھیک ہے لیکن وہ روحانی کیمرے کا قصّہ بالکل فراڈ ہے۔

جو بات مَیں کہہ رہی ہوں وہ آپ لوگ سمجھتے ہی نہیں۔

آپ بالکل بیکار لایعنی بات کہہ رہی ہیں۔ آپ کے خیالات قابلِ اصلاح ہیں۔ یعنی ذہن شوئی کے قابل —— اچھا آپ نے کسی ایسے شخص کو دیکھا ہے جو عنقریب مارا جانے والا ہو۔ دہشت سے دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ بعض ہسٹریکل ہوتے ہیں۔ ان کو انجکشن دیا جاتا ہے بعض زار و قطار روتے ہیں اور دو زانو ٹھلا کر

تلوار سے جن کی گردن اڑائی جاتی ہے بچوں اور بچیوں کا کیا حال ہوتا ہے؟ این فرینک تھی۔

اجی وہ تو مر گئی کب کی۔

بچے سامنے صحن میں کھیل رہے ہیں کچھ درختوں پر چڑھے امرود توڑ رہے ہیں اور شور مچا رہے ہیں۔ گارجین کے بین الاقوامی ایڈیشن میں شاید ایمنسٹی انٹرنیشنل کی طرف سے ایک اشتہار چھپا کرتا ہے۔ جنوبی امریکہ کی کسی فسطائی ریاست کے ایک ننھے مظلوم بچے کی تصویر اور کچھ اس طرح کا مضمون۔ "انہوں نے میرے اماں اور ابا کو مار دیا باقی سب کو پکڑ کر لے گئے۔ گھر میں میں اور بے بی اکیلے باقی بچے۔ میں بے بی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا کیونکہ میں پانچ سال کا ہوں"۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل سامراجیوں کی کمیٹی ہے۔

تو آپ اس طرح کی ایک کمیٹی بنا لیجئے۔ اللہ نے چھپر پھاڑ کے آپ کو بہت دولت عطا کی ہے۔

ہم تو فلم بنانے والے ہیں۔ دلیپ کمار کو لے کر۔ وہ چمڑے کے کروڑپتی کاروباری دو بھائی ہیں نا بشیر اور ایاز۔ کیا دھانسو فلمیں بنا رہے ہیں دلیپ کمار کو لے کر۔

ملگجی سیاہ سوتی ساڑھی پہنے ایک برقعہ پوش خاتون، سرخ جارجٹ کی کڑھی ہوئی ساڑھی میں ایک نوجوان لڑکی برقعہ پوش، ایک منحنی سا آدمی، پلاسٹک کے بیگ میں زادِ راہ۔ باہر پچھلے بڑے پھاٹک پر رکشا سے اترے۔ قصبے کی اس اٹھارویں صدی کی محل سرا کے وسیع پائیں باغ سے گزرتے اندر آئے۔ سیاہ ساڑھی والی خاتون نے سراسیمگی سے چاروں طرف دیکھا۔

بھائی راشد ہیں؟

وہ تو کنیڈا گئے ہیں مشاعرہ پڑھنے۔

اور بھائی انور۔

تشریف رکھئے۔ بھائی انور شہروں کی BEAUTIFICATION کے سلسلے میں آرکی ٹیکٹس کی ایک کانفرنس ہو رہی ہے —— کہاں ہو رہی ہے بھائی ——؟

لاس اینجلز میں۔

اچھا ایل ہیں؟ MY FEAVOURITE CITY تو وہ تو صاحب وہاں گئے ہوئے ہیں کہیئے سب خیریت؟ آپ کے ہاں تو بڑی گڑبڑ رہی۔

سیاہ ساڑھی والی خاتون نے بہت مایوسی سے چاروں کی طرف نظر ڈالی سب کاروبار بند ہے قینچی۔ کپڑا۔ ہر چیز کا کاروبار ٹھپ۔" ساتھ والے منحنی شخص نے کہا۔

"صبح دس بجے کرفیو کھلا تو بس پر بیٹھ کر آئے۔ ہمارا کارچوبی ساڑھیوں کا کارخانہ ہے۔ سوچا دو ساڑھیاں یہاں بک جائیں تو شام سے پہلے واپس چلے جائیں۔ چار بجے سے کرفیو پھر لگ جائے گا۔ دولہن وہ ساڑھیاں تو نکالو"

کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجئے مول۔

لڑکی نے فرش پر اکڑوں بیٹھ کر پلاسٹک کا بیگ الٹا پلٹا۔

اُرے وہ تو گھر ہی رہ گئیں"

مایوس پریشان۔ سراسیمہ وہ تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"واپس جاتے ہیں۔ آدمی نے کہا۔ خیال تھا یہاں سے اجمیر نکل جاؤں۔ یہاں نہ بکیں تو وہاں بیچ لوں۔ اب واپس چلو"

کھانا تو کھاتے جایئے۔

"جی نہیں وہاں کرفیو لگ جائے گا۔ چھ گھنٹے کا سفر ہے۔

سنہری آیات قرآنی سے منقش شادی کا ایک سنہرا دعوت نامہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ لڑکی نے اسے آنکھوں سے لگا کر میز پر رکھا۔ پلاسٹک بیگ کی چیزیں سمیٹ کر اٹھی دونوں ماں بیٹیوں نے برقعے اوڑھے۔ وہ مایوس دل شکستہ پریشان حال قافلہ آہستہ آہستہ چلتا پھاٹک سے نکل گیا۔

کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجئے مول:

پڑوس میں پرسوں بڑی دھوم دھام کی شادی تھی۔ دوسرے شہر سے زبردست بارات آئی تھی۔ دولہا باقاعدہ جڑاؤ کلغی والا صافہ باندھے ہاتھی پر سوار دلہن کی کوٹھی پر

پہنچا۔ بعد نکاح مقامی بینڈ نے "زمبا ہو ہو سمبا ہو ہو" بجایا۔ دعوتِ ولیمہ تو نئی دہلی اشوکا میں کریں گے۔ دولہا کی بہن نے اطلاع دی۔

آپ کیا ایکسپورٹ کرتے ہیں۔

چند آئٹم سیکرٹ ہیں ورنہ دوسرے تاجر ان کی نقل کر لیں گے۔ مگر زیادہ تر مغلِ اعظم اور الف لیلیٰ علی بابا چالیس چور ٹائپ صراحیاں اور طشت۔ وہ زینت امان کی فلم تھی۔ علی بابا یہ سامان باہر شیخ لوگوں کے لئے جاتا ہے میرے بہنوئی کا کارخانہ فیروز آباد میں ہے۔ جھاڑ فانوس اور بلور کا دوسرا سامان وہ بھی زیادہ تر مڈل ایسٹ اور یورپ والوں کے آرڈر پر بنتا ہے۔

کوٹھی کے باہر چند نوعمر براتی سو سو کے نوٹ لئے جوا کھیل رہے تھے۔ جو کاریں پھاٹک میں داخل ہوتیں ان کی نمبر پلیٹ پر آخری عدد جفت نکلا تو سو میرے طاق نکلا تو سو تو سو تمہارے اپنے شہر میں بھی ان سب کا مشغلہ ہے۔

ماشاءاللہ ان اضلاع میں مسلمانوں کے نئے تمول کے ساتھ تشدد بڑھ گیا ہے۔ سیاسی اور ذاتی مناقشوں کی بناء پر بات بے بات طمنچہ، قتل خون، نئی پکچروں کے نام سنئے۔ خون خرابہ، لوٹ مار، خون کا بدلہ، انتقام، بدلے کی آگ۔

کیسری وردی والے لڑکے بھی صبح کو پریڈ شام کو یہ فلمیں۔ ان سب کو کس نے BRUTALISE کیا ہے؟

آپ نے اور آپ نے اور آپ نے۔

فرمائیے آپ کس قسم کی اذیت اور موت اپنے لئے پسند فرمائیں گے؟ بڑی ورائٹی ہے آج کل چند آئٹم سیکرٹ ہیں۔

محلسرا کے پچھلے پھاٹک کے باہر بقر عید کی قربانی کے بکرے بندھے ہوئے تھے اندر ایک خیمہ نشیں میں فلمی گیت بج رہے تھے۔ ارہر کے کھیتوں کے پرے ایک عمارت میں تعزیہ بنایا جا رہا تھا۔

دنیا کا بلند ترین تعزیہ۔ سو سال سے یہ ہر سال بنتا ہے۔ سُنیوں کا تعزیہ ہے۔ اس

کی تصویر کسی نے اخباروں میں کبھی نہ چھپوائی۔ صبح صبح ایک غریب کاشتکار عمارت میں موجود تعزیے کے بانسوں میں کیلیں ٹھونک رہا تھا۔ غریب لوگ ہیں۔ سنی۔ ان کھیتوں کے وقف کی آمدنی سے ایک لاکھ روپے کے صرفے سے سال بھر تک یہ تعزیہ بنتا رہتا ہے۔ اس کے لئے انگریز کے زمانے میں بیرسٹر صاحب مرحوم نے خاص طور پہ اجازت لی تھی۔ عشرے کے روز بجلی کے تار اس کے لئے کھول دیئے جاتے ہیں۔ آج تک میرا ایک پہلوان دوست تھا پچھلے سال یہاں بھی آیا تھا۔ مجھ سے ملنے۔ میں اسے تعزیہ دکھانے لے گیا۔ وہ یہاں آیا تھا دنگل میں اپنے وطن کی نمائندگی کرنے۔ واپس جاتے ہی پکڑا گیا اور گولی مار دی گئی۔

کیوں ——؟

وہاں ہر کام رضائے الٰہی سے کیا جا رہا ہے۔

خدا خود میر مجلس ——؟

کیوں نہیں اور تو اور بفضلِ خدا سی پی آئی بھی سو فیصدی طرف دار ہے اور سی پی ایم خاموش۔

لینن گراڈ میں لینن کی دفتر کی دیوار پہ ان لوگوں کی تصاویر ہیں جو انقلاب میں مارے گئے گول گول عینکیں لگائے سنجیدہ شکلوں والے انٹلکچوئیل نیچے نیچے دبیز سائے بھدے کوٹ پہنے کھنچے ہوئے جوڑے باندھے انٹلکچوئیل عورتیں۔ جھکی ہوئی مونچھوں والے فوجی سویلین سب۔

تو ——؟

تو کیا کچھ نہیں۔ اچھا سوچئے آپ خود اگر زنداں میں ہوں۔ سب اپیلیں مسترد۔ صبح چار بجے دروازہ کھلا۔ فرض کیجئے آپ محض شدید مداح اور ہمدرد ہونے کے بجائے اس مومن ملک کے شہری ہوتے اور کچھ ایسا اتفاق ہوتا کہ آپ کی آنکھوں پر سیاہ پٹی —— یا آپ کی بیوی بیٹی بھائی بہن —— اس کی آنکھوں پر —— مگر آپ ایک اور ملک کے شہری ہیں اور آرام سے دھوپ میں بیٹھے قہوہ پی رہے ہیں اور آپ کے کھیتوں میں ٹریکٹر چل رہے ہیں اور آپ کی زمینوں میں پنا کی کانیں نکل آئی ہیں۔

درست مگر اس دور سے پہلے جو ہزاروں کو مارا گیا آپ نے اس وقت احتجاج نہیں کیا۔

آپ کو کیا معلوم کہ نہیں کیا۔

کسی نے نہیں کیا۔ رہی ایمنسٹی انٹرنیشنل تو وہ سامراجیوں کی جماعت ہے معاف کیجئے گا کیا آپ بھی شیطان عظیم کی ایجنٹ ہیں؟

زرمبا ہو ہو سمبا ہو ہو۔

آدھی رات کو ریڈیو پر عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں۔ خلائے بسیط کے نقار خانے میں ہر ایک اپنی اپنی بولی بول رہا ہے۔ کوہستان چلتان کے پرے سرحد کے اُس پار سے مغربی آرکسٹر مغربی فوجی دھن پر رجز۔ جوشیلی تقاریر۔ ایک مرتبہ اسی زبان کی ایک گمنام نشرگاہ پر سوئی لگ گئی۔ فریاد فریاد فریاد ہم مارے جا رہے ہیں۔ سوئی لگنے ہی کی تو بات ہے۔ طاقتور آواز پر سوئی لگ جاتی ہے۔ کمزور آواز پر نہیں لگتی۔ فریاد، فریاد فریاد۔

استخوانوں کے لرزنے کی صدا آتی ہے قید خانے میں تلاطم ہے —— کہ ہند آتی ہے —— بالکل نہیں آتی —— اب تک تو آتی نہیں —— بدلی نگاہبانوں نے چوکی، بجا پہر تاریک خلاء میں یہ آوازیں ایک دوسرے سے ٹکراتی نہیں یا JAM کر دی جاتی ہیں۔ سب بلیک ہول ہے۔ سب ہو گئے خاموش اسیران نوحہ گر۔

وہ ہولناک شب وہ اندھیرا کہ الحذر۔ سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا۔

استخوانوں کے لرزنے کی صدا۔

سزا دے دی گئی۔ واجب القتل تھے۔

جنگل جنگل صحرا صحرا رات کے اندھیرے اور دن کی چلچلاتی دھوپ میں جنگلی شہد کھاتا بھیڑ کی اُون کا لبادہ پہنے یحییٰ جلتی ریت پر چلتا پھرتا۔ خبردار وہ آ رہا ہے۔ وہ آ رہا ہے۔

لکھا ہے حسینؑ نے دشتِ کربلا جاتے ہوئے چار ماہ کے کٹھن سفر کے دوران یحییٰ کو اکثر یاد کیا۔

نہایت سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم۔

نجرانیوں کا ساتواں بیڑا نیلے پانیوں پر ہوتا ہے پھر رواں۔

وہ بڑا ہی حسین دیس ہے۔ ہرے بھرے کوہستان۔ سیدارہ کے جھرمٹ خوبصورت مسجدیں۔ قدیم خانقاہوں کی راہداریوں میں سایوں کی مانند چلتے راہب رات کے آسمان پر پورا چاند باغوں میں صنوبر۔

صنوبر چاند کنول بارش پھوار گلاب مور چاندنی قمری بہار شمشاد دیکھئے ان چیزوں کے نام بھی اردو میں لکھے ہوئے کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔

گنگا جمنا سنگم۔

سنگم کے شہر میں پچھلے دنوں صنوبروں کے اس کوہ الم وروادیٔ محن کے محصور مظلوموں کی امداد کے لئے جلسہ تھا جو لوگ اس شہر کے چند با اثر مقتدر اہل ایمان کے پاس گئے انہوں نے جواب دیا آپ لوگ افغان مجاہدین کے لئے کیوں نہیں جلسہ کرتے۔

گزشتہ سال لب آب گنگ بجے جل ترنگ۔ پاٹلی پتر کے نکٹ، آستانہ شرف الدین یحییٰ منیری کے جوار میں مرمریں بلند و بالا راج بھون کی چھت پر وہ مرد خود آگاہ دھوپ میں نیم دراز تھا (سنیں گے میری صدا خان زادگان کبیر؟ گلیم پوش ہوں میں صاحب کلاہ نہیں) پوچھا لالہ گل سے تہی نغمۂ بلبل سے پاک اس منزل شاہیں وچراغ اس کوہستان عظیم کی جہاں آپ مقیم ہیں، اصل صورتِ حال کیا ہے؟

فرمایا بیٹی بے شمار مارے جارہے ہیں۔ جب وہ زندہ ہی نہ بچیں گے تو اس سے کیا غرض کہ ــــ

کہ زاغ رہے یا ہمارے . . . . . .

دکھ سے فرمایا "جوان مارے جارہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں ان بے خانماں عورتوں کا کیا ہوگا وہ کہاں جائیں گی جن کے مرد بے دریغ مارے جارہے ہیں۔"

رہنے کا ٹھکانہ کہیں بتلا کے سدھارو۔ گوشے میں دلہن کو کہیں بٹھلا کے سدھارو ــــ فاقہ کش آشنہ ذہن کشتۂ غم لٹتے ہیں ــــ شور برپا ہے یہ رانڈوں میں کہ ہم لٹتے ہیں۔

دیکھو خونخوار عدو برچھیاں دکھلاتے ہیں ——— تیغ کھینچو کہ لعیں گھر میں گھسے آتے ہیں ——— ننھے بچوں کا یہ عالم ہے کہ گھبراتے ہیں۔ گود میں ماؤں کی دہشت سے چھپے جاتے ہیں۔ گولیاں جو جسم میں سوراخ بناتی ہیں روحیں اس میں سے یا قبر کے غار سے نکلتی ہوں گی یا راکھ دان سے (معاف کیجئے بلیک جوک ہو گیا) کہاں جاتی ہیں۔ اگر وہ ہیں ماہرین مابعد الطبیعات۔ جنریٹ فادرز۔ علماء و صوفیاء ویدانتیوں گیان مارگی جوگیوں JET-SET رشیوں سے ایک مؤدبانہ سوال۔ کہاں جاتی ہیں۔ بتائیے کہاں جاتی۔ جلدی بتائیے۔ گنہگاروں کے لئے چاہ ہبہب۔ شہداء کی روحیں جا کے سدرہ و طوبیٰ کی شاخوں پر بیٹھ گئیں۔

قریہ ہند کا ایک بوڑھا مونگ پھلی بیچنے والا تہجد گزار فصیح و بلیغ اردو بولنے والا ایک روز وثوق سے بتا رہا تھا۔ حوض کوثر کے کنارے جو جنتی پرندے بیٹھے رہتے ہیں۔ جب ایک مومن کی دعا آسمان پر پہنچتی ہے وہ حوض میں غوطہ لگاتے ہیں۔ ان کے پروں سے جو بوندیں گرتی ہیں وہی دعائیں ہیں جو موتی بن گئیں۔

سامنے سے ایک بس آ رہی ہے۔ گرد اڑاتی۔ ڈباٹی کی سمت رواں۔ اس نے گھبرا کر اپنا ٹھیلہ ایک طرف کو کیا۔ دوسری بس گزرتی ہے لدی پھندی سجی سجائی۔ اس پر پوسٹر چسپاں ہیں RASHID WEDS JAMILA چھت پر جہیز کا قیمتی بے تحاشا سامان۔ یہ بسیں اور یہ پوسٹر مسلمان کاروباریوں کے نئے تمول کے معلن ہیں سہالگ کا موسم گزر گیا لیکن ایک اور بس نکلتی ہے پوسٹر:- MOHAN WEDS KAMLA چھت پر کا جہیز بے تحاشا سامان۔ دلہن واجب القتل ہے۔

مجھ مفلوک الحال آدمی کو بھی یتیم نواسی کے جہیز میں ریڈیو سائکل برقی پنکھا سب چیز دینی پڑی۔ لڑکا تو ہیرو موپڈ مانگ رہا تھا۔ میں کتنا قرض لیتا، ٹھیلے والے نے کہا۔

• درگاہوں پر بھیڑ بس ایک کلر ٹی وی سیٹ، ایک وی سی آر، ایک پریمیر پدمنی کار کا سوال ہے بابا۔ •

پچھلے دنوں ہم پدمنی کے دیس گئے تھے۔ کھچا کھچ بھری عوامی بس پر راستے ہی میں

پہاڑیوں کے قریب ۔ رُکی۔ چند غریب ہندو عورتیں اتر کر تانگے میں بیٹھیں۔ تانگہ طویل سڑک پر پہاڑیوں کی سمت ٹخ ٹخ کرتا چل دیا۔ بس کے اندر ایک غریب ہندو عورت نے کہا "وہاں پہاڑیوں کی پرلی طرف بالاجی کا مندر ہے۔ کسی نے کچھ کیا ہو دھرا ہو سب وہاں اُتر جاتے ہے۔"

برابر کی سیٹ پر ایک یکہ قصاب رونق افروز کلائی پہ رنگین الیکٹرونک گھڑی۔ ہاتھ میں کیسٹ پلیئر "یہ کیا جگہ ہے دوستو یہ کون سا دیار ہے" بڑے انہماک سے آنکھیں بند کیے سُن رہا تھا۔ دوسری طرف ایک نوجوان فربہ لالہ جی۔ ایک برقعہ پوش عورت اور اس کا شوہر ہیر کورا اور چمکیلی الیکٹرونک گھڑیوں سمیت۔ وہ سب گانا سننے میں مشغول تھے بابا جی کے نام پر لالہ جی متوجہ ہوتے بولے "ایک یہ بالاجی کا مندر جب حکم ہوتا ہے تبھی کوئی ان کے دوار پہنچ سکتا ہے۔ اور ایک۔

"دشمنوں نے ہزاروں من گھی جلوا ڈالا پر بابائی ٹس سے مس نہ ہوئی" سفید مونچھوں اور بھاری پگڑ والے ایک بوڑھے نے کہا اس نے کانوں میں سونے کی مندریاں پہن رکھی تھیں۔

"دیوی کا بردان ہے۔ مہارانی سے چکی پسوادی" لالہ نے کہا۔

قصائی نے چھانکاری سے سر ہلایا۔ خواجہ صاحب کے دربار میں حاضری دیویں ہیں برتر"

"نیم والے بابا کے دھورے منتریوں کی موٹریں پہنچ گئیں۔ الیکشن آنے والا ہے۔"

"بادشاہی کھیل ہیں۔ ذرا راجپوت فلم کا گانا لگیو ماسٹر۔ تیری گلی سے جب میں نکلا۔"

نیم والے بابا بڑے غصیلے آدمی ہیں ڈانٹ دیں تو سمجھو بیڑا پار۔

"آدمی ـــ؟ ذرا زبان سنبھال کر بات کر و لالہ۔ اتنے بڑے اولیاء اللہ کو آدمی کہو ہو، جلالی بزرگ کہو" یکہ قصاب نے طیش سے جواب دیا اور دوسرا کیسٹ لگایا آنکھیں بند کر لیں "تیری گلی سے جب میں نکلا سب کچھ دیکھا بدلا بدلا میرے سنگ سنگ آیا تیری یادوں کا میلہ ـــــ تیری یادوں کا میلہ۔"

پنک سٹی کے ایک بازار میں مغلیہ پوشاک میں ملبوس چند طویل القامت مسلمان عورتیں بے پردہ۔ سرخ نیم جامہ۔ نیلی پشواز مغل راجستھانی تصاویر میں سے گویا کود کر باہر آگئیں۔ سڑک پہ چلی جارہی ہیں۔ مزید اسی حلیے کی عورتیں جگہ جگہ۔ اے لو وہ تو سینما گھر میں گھس گئیں نہ ان کو ناک کان کٹوائے جانے کا ڈر نہ خوفِ خدا۔ یہ کون لوگ ہیں دوستو یہ کون سا دیار ہے ——؟

"نیلگر قوم۔ سابق میں" دکاندار نے لاکھ کے میناکاری کڑوں کا بنڈل بناتے ہوئے جواب دیا" راجگان مغل دارالسلطنت سے ان کے اجداد کو اپنے ساتھ لائے تھے یہاں کی ساری مشہور صنعتیں بندنی، چھپائی، میناکاری، سب ہم اہلِ اسلام کاریگروں کے آبائی پیشے ہیں —— وہ دیکھئے راج ماتا تشریف لے جارہی ہیں۔ آپ نے میناکاری کے تعزئے دیکھے ہیں؟ اب کے محرم پہ تشریف لائیے۔ یہاں کا محرم بہت شاندار" راج ماتا گائتری دیوی کی طویل کار سامنے سے زن سے گذر گئی،

گبریل اور نورما کوہن شاہاں مغلیہ کے راجپوت جنرنیلوں کے بنوائے ہوئے قلعہ آمیر کے دلارام باغ کی ایک بارہ دری میں بیٹھے تھے۔

"کریم خاں پنڈاری" —— ڈاکٹر نورما کوہن نے کہنا شروع کیا" برکلے میں مجھے کسی نے بتایا کہ کریم خاں پنڈاری کی اولاد اس شہر میں موجود ہے ان کے پاس بڑے نایاب مخطوطے ہیں۔ میں ان لوگوں سے ملنے یہاں آئی تھی" اچانک اس نے کہا" آپ کو معلوم ہے سرمد یہودی نژاد تھا؟"

واجب القتل تھا قتل ہوا۔

"میں مڈل ایسٹ کے وار تھیٹر سے سیدھا یہاں آرہا ہوں۔ میں جرنلسٹ ہوں موجودہ قتل و غارت کا مطالعہ کرنے سے فرصت نہیں ملتی کہ ماضی کے قتل و غارت کا مطالعہ کروں یہ کام نورما کا ہے" گبریئل نے کہا۔

ٹیکسی کوتح امیر سے چل کر گلابی شہر اور اکبرآباد کے آدھوں آدھ فاصلے پر ایرکنڈیشنڈ "مڈوے ہاؤس" کے سامنے رکی۔

"میں میرٹ بھی گیا تھا۔ دن بھر کے لئے سیڈ۔ ویری سیڈ۔" گیبرئیل کوہن نے خنک نیم تاریک ڈرائننگ ہال میں داخل ہوتے ہوئے اطلاع دی۔

گبرئیل کوہن یعنی جبرئیل کاہن یعنی موسیٰؑ کے بھائی کاہن اعظم ہارونؑ کی اولاد یا نام لیوا نصف دنیا کے میڈیا پر قابض۔ سدرہ کی شاخ پر تو یہ جبرئیل چڑھا بیٹھا ہے۔

نچلے متوسط طبقے کے MOHAN UEDS KAMLA قسم کے دولہا دلہن مع دو براتیوں کے قریب کے صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔ دلہن نے کارچوبی نائیلون کی سرخ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ دولہا کے ماتھے پر تلک، گلے میں ٹائی کے اوپر موتیوں کا ہار۔ باہر ان کی ٹیکسی کھڑی تھی یہ دونوں اس ورگ سے تعلق رکھتے تھے جو عوامی بس میں سفر کرتا ہے اور ایر کنڈیشنڈ روڈ ہاؤس میں تازہ دم ہونے بجائے راستے کے گندے ڈھابوں میں کر ٹک جائے اور مونگ پھلی کھاتا ہے مگر یہ ان کی شادی کا دن تھا اور وہ ٹیکسی میں سفر کر رہے تھے دلہن حیرت اور مسرت سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ نورما کوہن کو اپنی طرف متوجہ پا کر شرمائی۔ یقیناً وہ ایم۔ اے یا ایم۔ ایس۔ سی پاس تھی اور خود ملازمت کرکے اور اس کے باپ نے پیسہ جوڑ کر یا قرض لے کر بعوض بھاری جہیز یہ لڑکا حاصل کیا تھا۔ اچھا بھورا تی۔ تم بتاؤ تم کس طرح کی موت پسند کرو گی۔ اسٹوو کا دھماکہ مٹی کے تیل کا چھڑکاؤ یا معمولی طریقے سے گلا گھونٹ کر مارے جانے کو ترجیح دو گی یہ معصوم لڑکی عین ممکن ہے کہ بہت جلد قتل کر دی جائے۔ اس کے ممکن قتل کا ذمہ دار کون ہے۔

آپ اور آپ اور آپ اور آپ۔

"گرم ہوا" کے شہر میں ڈسکو میوزک کی ایک دکان کے آگے ایک سفید پوش لڑکی اس کے کچھ فاصلے پر ایک لفنگا سا گورا غیر ملکی ایک رکشا والے سے معارف ربا دست و شنید۔ ناقابلِ یقین بات ہے مگر اس لڑکی نے منٹو کی سلطانہ کی طرح کالی شلوار پہن رکھی تھی۔ ماہِ محرم شروع ہو چکا۔

پہلے انہوں نے بجلی گھروں پر قبضہ کیا پھر دوا و غذا کی ناکہ بندی۔ پھر پانی بند کیا۔

بیکس ہیں مسافر ہیں وطن دور ہے گھر دور۔ ہفتم سے ہمیں گھیرے ہے یہ لشکر مقہور تھا۔ شور کہ پیاسوں کو نہ پانی کا ملے جام۔ دم لینے کی مہلت نہ ملے بے وطنوں کو۔ مرتے ہیں زبانوں کو نکالے ہوئے بچے۔ ہے ہے میری آغوش کے پالے ہوئے بچے۔

مرحب نے اس گھڑی کیا سامان رزم گاہ۔ شعلے نے الحذر کہا بجلی نے الاماں۔ دہشت سے تھرتھرا گیا مریخ آسماں۔ کشتوں کو اپنے فوج عدو روندنے لگی۔ جنگل میں برقِ قہرِ خدا کوندنے لگی۔

اب دشت و دریا پر ۱۴۰۳ھ کا نیا چاند طلوع ہو رہا ہے۔ ہجرت کا نیا چاند۔ شہر بنارس میں استاد بسم اللہ خاں نے اپنے آبائی امام باڑے کے تعزیوں کے سامنے بیٹھ کر شہنائی پر غمگین راگ چھیڑ دیئے۔ امام باڑہ حسین آباد لکھنؤ کے پھاٹک پر نوبت بج رہی ہے۔ ہندوستان و پاکستان کے جگمگاتے، انگلستان و کینیڈا اور امریکہ کے سینٹرلی ہیٹڈ نفیس اعزا خانوں میں مرثیہ خوانی شروع ہو چکی۔ جاتا تھا یوں غضب میں صفِ اہلِ کید پر۔ شیر زیاں جھپٹتا ہے جس طرح صید پر۔ نکلا ادھر سے جو وہ اجل کا شکار تھا۔ پیدل ہو یا سوار وہ دو تھا کہ چار تھا۔ کوسوں لہو سے دشتِ ستم لالہ زار تھا۔ ایک شور تھا کہ موت کا عرصہ قلیل ہے پیاسو پیو کہ تیغ کا پانی سبیل ہے۔

یوں تھرتھرا رہے تھے ہر اک ناتواں کے پاؤں اٹھ اٹھ گئے سپاہِ ضلالت نشاں کے پاؤں۔ اک تہلکا سا پڑ گیا کون و مکان میں۔ کس طرح آسکے وہ شجاعت بیان میں ایسا لڑا انہیں کوئی پیاسا جہان میں۔ گوشوں میں جا چھپے تھے کمان دار دس ہزار۔ چادر ہلا رہے تھے سجاعان نامدار۔ خود صاحب کمند اسیرِ کمند تھے دم خنجروں کے تیغ کی دہشت سے بند تھے۔

لیکن وا محمدا! وا حسینا! کوئی ان کی مدد کو ؟ ہیہا۔ اب وہ سب بندوقیں سنبھالے دشتِ غربت میں منتشر کئے جانے کے لئے ٹرکوں پر سوار کئے جا رہے ہیں۔ وہ بندرگاہ لے جائے گئے۔ ایک اور ہجرت پر مجبور۔ بتیس سال بعد ایک اور ہجرت۔

جگمگاتی مراد آبادی صراحیوں اور فیروز آبادی جھاڑ فانوس سے آراستہ طلائی محلوں

میں کشمیری قالینوں پر نیم دراز شیوخ الف لیلیٰ جدید نے ہاتھ بڑھا کر رنگین ٹی وی پر دوسری چینل لگائی۔ محاصرے قتل و غارت قید و بند اور ہجرت کے مناظر غائب۔ اب وہ نامور بیلی ڈانسر نبیلہ کا نیم عریاں رقص ملاحظہ کر رہے ہیں ان کے ذاتی طیارے باہر موجود ہیں جو کل سویرے ان کو مونٹے کارلو اور پیرس لے جائیں گے۔ جہاں قحبہ خانے ان کے منتظر ہیں۔

ہے کوئی مائی کا لال جو انہیں سنگسار کر سکے؟

جہازوں نے لنگر اٹھائے۔ کشتی نوحؑ چھوڑ کر طوفان ہوا رواں۔ ماہی نے الحفیظ کہا مہ نے الاماں۔ پرواز شاخ سدرہ سے کی جبرئیل نے محراب سے بلند کیا سر خلیلؑ نے۔

وہ سرفروش جانباز حقیقی مجاہد، اپنی بندوقیں ہوا میں سر کرتے ایک اور ہجرت پہ مجبور ہوئے۔ شکستہ دروازوں میں ان کے بوڑھے ماں باپ بیویاں اور بچے سرنگوں۔ رہنے کا ٹھکانہ کہیں بتلا کے سدھارو۔ گوشے میں دلہن کو کہیں بٹھلا کے سدھارو تم چھوٹتے ہو عالم تنہائی ہے اس پر —— تم چھوٹتے ہو۔ واجب القتل ہیں۔

حیا کے مارے کٹے گردنوں کو خم آئے قدم قدم پہ اٹھاتے غم والم آئے۔ بلاکشوں نے مکاں رہنے کو نہ پایا تھا۔ بجز فلک نہ شجر. . . . .

پڑھنے لگا رجز کے ہوں حیفہ کا پہلوان۔ نوکوں سے برچھیوں کی کلیجہ نکال لوں نوکوں سے۔

استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی ہے۔

واجب القتل ہیں۔

جلاد آستین پہ بڑھاتا ہوا چلا۔ خنجر پہ انگلیوں کو پھراتا ہوا چلا مجمع کو اس وچپ سے ہٹاتا ہوا چلا "آسمان سے یہاں مسلسل چار ماہ تک آگ برسی ہے آسمان کی آگ اور زمین کی آگ" گبرئیل کوہن اسٹوری فائل کرتا ہے۔ عمر میں پہلی بار دیانتداری سے۔

فاقہ کش تشنہ دہن کشتہ غم لٹتے ہیں۔ دشت غربت میں گرفتار ستم لٹتے ہیں۔ قتل وارث ہوئے سامان گرفتاری ہے یا علیؑ آیئے سامان۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہے یہ فریاد کسی کی کہ برادر دوڑو۔ کوئی چلاتا ہے عباسؑ دلاور دوڑو۔ دیکھو خونخوار عدو برچھیاں دکھلاتے ہیں۔ تیغ کھینچے کہ لعیں گھر میں گھسے آتے ہیں۔

اس مصیبت میں نہ آئے تو کب آؤ گے۔ سر سے چادر میری چھن جائے گی تب آؤ گے۔

کوئی نہیں آیا مدد کے لئے کوئی نہیں آیا۔

گبرئیل کوہن اسٹوری فائل۔

پرمیا نبی نے تین ہزار سال قبل نوحہ کیا تھا۔ کہ نل ڈویہ یرمیا ہو آج نوحہ گر۔ ان گنت یتیم ولسیر معذور اور زخمی بچے ـــ ہند نے پوچھا مرض کیا ہے کہا بے پدری رو کے پوچھا کہ دوا کیا ہے کہا نوحہ گری۔

انہوں نے میرے ابا اور اماں کو مار دیا۔ باقی سب کو پکڑ کر لے گئے۔ گھر لوٹ لیا گھر میں میں اور بے بی اکیلے باقی بچے ہیں۔ میں بے بی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا کیونکہ میں پانچ سال کا ہوں۔

دہشت زدہ متحیر بے خانماں بے سہارا بچے۔ ہند نے پوچھا مرض کیا ہے کہا بے پدری گھر جو دریافت کیا کہنے لگے در بدری۔ بول لیتا ہے خبر کون کہاں بے خبری۔

بول لیتا ہے خبر کون کہاں بے خبری۔

مکانوں پر بل ڈوزر چل گئے۔ مکانوں پر بل ڈوزر برسوں سے چل رہے ہیں۔

گبرئیل کوہن آج ان کے متعلق اسٹوری۔

ملبے کے ڈھیر لاشوں کے انبار۔ جلے ہوئے گھر ـــ غل تھا کہ ایسے گھر بھی الٰہی جہاں میں ہیں ثابت نہیں کہ قبر میں ہیں یا مکان میں۔

وہ شب کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں۔

ہر دم زمیں سے واں کی نکلتا تھا یوں بخار جیسے دھواں تنور سے اٹھتا ہے بار بار۔

نہ تو کر سکتے ہیں فریاد نہ رو سکتے ہیں۔ چپکے سہمے ہوئے اک ایک کا منہ تکتے ہیں۔ ملبے میں ہر طرف کھلونے اور ننھے منے جوتے اور ننھے منے کپڑے۔

کل مجھے لوٹ کا اسباب جو دکھلایا تھا۔ ایک پھٹے کپڑے پر حاکم کو بھی غش آیا تھا۔ ایک علم تھا اسی اسباب میں خورشید نشان۔ مشک پنجے میں بندھی، خوں میں پھریرا افشاں۔ ایک گہوارے کی خوشبو سے یہ ہوتا ہے عیاں کہ ابھی اُٹھ کے سدھارا ہے کوئی غنچہ دہاں۔

بیچ میں تکیوں کے ننھا سے شلوکہ دیکھا۔ دودھ اگلا ہوا اور داغ لہو کا دیکھا۔

ایک سات سالہ بچی دہشت زدہ اپنے کھنڈر مکان میں لاشوں میں گھری ایک خالی ٹین کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ بلک بلک کر رو رہی ہے۔

اچھی نہیں عادت نہ یوں رویا کرو۔ بی بی۔ پہلو میں کبھی ماں کے بھی سویا کرو، بی بی۔

کیا ہوتے جو ہم گھر میں کسی شب کو نہ آئیں۔ مجبور ہوں ایسے کہ تمہیں چھوڑ کر جائیں۔

جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی۔ برسوں جو رہے ساتھ وہ چھٹ جاتے ہیں بی بی۔

ہزاروں ہزار یتیم بے خانماں بچے۔

بیٹی کے سوا آپ کا کوئی نہیں بابا۔ شب بھر میں اسی خوف سے سوئی نہیں بابا۔

میں بے بی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ میں صرف پانچ سال کا ہوں۔

بچوں کے سر اب کٹ کے نشانوں پہ چڑھیں گے۔

استخوانوں سے لرزنے کی صدا آتی ہے۔

ٹیلی وژن کی چینل بدلئے۔

مگر اس چینل پر کوئی تصویر نہیں سناٹا ہے۔

سناٹا؛ جی نہیں۔ یہاں سب خیریت ہے بر ضائے الٰہی۔ منافقین اور زمین پر فساد پھیلانے والوں کو چن چن کر ختم کر دیا گیا۔ واجب القتل تھے۔ جو باقی

ہیں انشاءاللہ ان کو بھی۔

قید خانوں میں اسیر منتظر اجل بیٹھے ہیں۔ آنکھوں پر سیاہ پٹی اور بندوقچیوں کے گولیوں کی باڑھ۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کے نمائندوں کو آنے کی اجازت نہیں۔ وہ شیطان عظیم کے کارندے۔

قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہنسا آتی ہے؟

ہنسا ہر کز نہیں آئے گی۔ کاہے کو آنے لگی۔ سب کو اپنے اپنے قومی مفاد کا خیال ہے صاحب۔ لائن سے اپنی قبریں کھود کر سب اس قطار میں آجائیں۔ جلدی جلدی افراتفری نہیں سنتی نہیں ڈسپلن آخر دم تک ضروری ہے۔ کچھ کفن کے لئے ہمراہ نہیں لایا ہوں۔ باپ کو چھوڑ کے بے گور و کفن آیا ہوں۔

فکر مت کرو کفن سرکاری ملیں گے۔ پھاوڑے قرینے سے رکھ دیجئے۔ دوسرے آرہے ہیں۔

کاؤنٹ ڈاؤن دس، نو، آٹھ، سات، چھ، پانچ، چار، تین۔

قید خانوں میں کمسن لڑکے لڑکیاں منتظر اجل بیٹھے ہیں۔ دنیا کے ایوانوں میں اقتدار کی راہداریوں میں ان کی آواز نہیں پہنچتی کوئی ان کو چھڑانے نہیں آتا۔

بولا نہ جب کوئی تو ہوا غم زیادہ تر، دیوار پکڑ کے پکڑے گئی وہ قریب در۔ پٹ کو ہلا ہلا کے پکاری وہ نوحہ گر۔ دربانو جاگتے ہو کہ سوتے ہو بے خبر۔ بے کس ہوں تشنہ لب ہوں فلک کی ستائی ہوں، کچھ تجھ سے اپنا حال میں کہنے کو آئی ہوں۔

چھوٹے سے سن میں قیدیٔ زندانِ شام ہوں۔ میں دختر حسین علیہ السلام ہوں۔ کہتی نہیں میں یہ کہ کرو قید سے رہا۔ چھوٹ جائیں گے کبھی کہ اسیروں کا ہے خدا۔ کھانے کو کچھ طلب ہے نہ پانی کی التجا۔ ہاں قفل کھول دو گے تو دوں گی تمہیں دعا۔

جائیں گے ہم کہاں کہ تمہارے حوالے ہیں۔ بابا حسینؑ آج کی شب آنے والے ہیں۔ اصغرؑ ہیں ان کے ساتھ۔ یقین ہے کہ جلد آئیں۔ ایسے نہیں ہیں کہ وہ مجھے رات بھر رلائیں۔ چوکی کے لوگ سوتے ہیں در پہ مجھے بٹھائیں۔ دھڑکا مجھے یہ ہے کہ کہیں آکے پھر نہ جائیں۔

نیند آئے گی نہ مجھ کو بہت بے قرار ہوں۔ بھاگے کوئی اسیر تو، میں ذمہ دار ہوں۔

موقوف ان پہ میری حیات و ممات ہے آنے کا ہے یہ دن یہی وعدے کی رات ہے۔

بولے لگا ہاں کہ تیرا دھیان ہے کدھر۔ جا ماں کے پاس بیٹھ، کہاں تو کہاں پدر۔ دن کو بھی روتی رہتی ہے شب کو بھی روتی ہے نہ ہم کو سونے دیتی ہے نہ آپ سوتی ہے بلوائیں شمر کو تری تعزیر کے لئے رونا نہ کم کرے گی تو شبیرؑ کے لئے ماں سے چھٹے تو اور بھی ضد دو چند ہو۔ ایسا نہ ہو جدا کسی حجرے میں بند ہو۔

یہ بات سن کے سہم گئی وہ جگر فگار۔ دروازے سے سرک کے لگی رونے زار زار دلان سے پکاریں۔ یہ بانوئے نامدار۔ بی بی کدھر گئیں ادھر آؤ یہ ماں نثار کھولے گا کون در کسے چلاتی پھرتی ہو۔ واری کہاں اندھیرے میں ٹکراتی پھرتی ہو۔

زنجیر در نہ رات کو کھولیں گے یہ لعیں۔ ماں صدقے گئی گھرکیاں کھانے کو کیوں گئیں پست و بلند خانۂ زنداں کی ہے زمین۔ گھبرا کے گر پڑو نہ اندھیرے میں تم کہیں۔

روتی ہوئی یہ کہہ کے اٹھیں بانوئے حزیں۔ بیٹی کو ڈھونڈھتی ہوئی دروازے تک گئیں۔

روتی ننھی منہ کو کرتے سے ڈھانپے وہ مہ جبیں۔ پاس آکے ماں نے سر سے قدم تک بلائیں لیں۔

ننھے بچوں کا یہ عالم ہے کہ گھبراتے ہیں گود میں ماؤں کے دہشت سے چھپے جاتے ہیں۔ ننگی تلواریں جو ظالم انہیں دکھلاتے ہیں بس تو چلتا نہیں۔ اشک آنکھوں میں بھر لاتے ہیں۔

سر کو جھکا کے پہلے تو وہ پیچھے ہٹ گئی
پھر ننھے ہاتھ اٹھا کے گلے سے لپٹ گئی

جبرئیل لرزتے ہیں سمٹے ہوئے پیر کو۔

ماہ محرم ۱۴۰۳ھ

(شکریہ افکار، علی گڑھ)

انور عظیم

گورستان سے پرے

ابھی قبر کا منہ کھلا ہوا تھا۔

مٹی کے ساتھ شام کا سُرمئی رنگ بھی قبر کے کھلے منہ میں اُتر رہا تھا

سرد ہوا سرسرا رہی تھی اور بھیگی مٹی بھی۔

جھکے ہوئے لوگوں کے ہاتھ۔ دیو قامت سیاہ کیکڑوں کے پیروں کی طرح، مٹی کو قبر میں دھکیل رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں مٹی کوہاں کی طرح اوپر اٹھنے لگیں۔ گورکنوں نے کدالیں پھینک دیں اور پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ مٹی کی خوشبو ہوا میں بکھر گئی۔ ہزار پا پیرسائے پیچھے ہٹنے لگے۔ درختوں کے جھنڈوں میں نارنجی روشنی کے جال لرز کر بجھ گئے اور گورستان کے فصیل کے باہر قدموں کی آہٹ ہوا کو شہر کی طرف لے چلی۔ ہوا کے ساتھ کافور اور لوبان کی خوشبو سفر کر رہی تھی اور کفن کی سفیدی بھی۔

شہر میں روشنیاں جھلملانے لگیں۔

ہوا دور تھی

روشنیاں دُور تھیں

آہٹیں دُور تھیں

اب سب کچھ دُور تھا

وہ فصیل کے پاس پڑے سے کائی زدہ پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس نے جوتے ہوا میں اُچھال دیئے۔ اس کی کائی جرسی، ہکان سانسی کی طرح، بدن سے چپکی ہوئی تھی۔

جیکٹ وہ پہلے ہی کہیں اتار کر پھینک چکا تھا۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکالی جو ماں کے پرس سے چرائی تھی۔ پہلے کش کے بعد وہ رُکا ہی نہیں۔ دھواں پیتا چلا گیا۔ جب، جلد ہی سگریٹ جل گئی اور اس کی انگلیوں میں ایک چھوٹی سی چنگاری دم توڑنے لگی تو اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر سگریٹ کی چنگاری کو بھی ہوا میں اچھال دیا۔ شیشے کی طرح شفاف سیاہی کی وسعتوں میں چنگاری تیرتی چلی گئی۔

تاریکی کا پگھلا پگھلا شیشہ ہوا کے ساتھ بہہ رہا تھا۔
ہوا کے سیاہ ہاتھ اس کے چہرے کو چھو رہے تھے۔
اسے ابکائی آ رہی تھی۔
اس کا سر جھک گیا۔
جُھکا رہا۔

وہ صدیوں بعد، آہستہ آہستہ اٹھا اور پتھر پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مڑ کر فصیل کے اس پار دیکھا۔ قبریں ابھر ابھر کر درخت بن گئی تھیں جن میں ہوا پھڑ پھڑا رہی تھی سیاہ درخت آسمان کی طرف اُڑ رہے تھے اور ان کے پتوں اور شاخوں کے اس پار ستارے جھلملا رہے تھے۔

سب کچھ دُور تھا
آدھا چاند بھی، تارے بھی

صرف قدموں کے نشان چمک رہے تھے۔ یہ جنازہ لانے والوں کے قدموں کے نشان تھے جب وہ آئے تھے تو ان کے کندھوں پر بوجھ تھا۔ جب واپس گئے تو ان کے ہاتھ خالی تھے۔ کندھوں پر ہوا کے سوا اور کسی چیز کا بوجھ نہیں تھا۔

دھوپ تیز ہو گئی تو موسم ہی بدل گیا۔
اس کے قدم تیز ہو گئے
شہر اب بھی دُور تھا

البتہ گھر نظر آرہا تھا۔
بڑا سا پھاٹک کھلا ہوا تھا اور سوگ منانے والے، جو دوسرے شہروں سے آئے تھے، رخصت ہو رہے تھے۔ وہ ان کے پاس سے گزر گیا۔ اس نے کسی کو نہیں پہچانا۔ کسی نے اس کو نہیں دیکھا۔

خدا حافظ!

خدا حافظ!

صدائیں کہیں کھو گئیں

وہ باہر والے برآمدے میں کھڑا تھا۔ وہ جلتی آنکھوں سے ڈرائنگ روم کے آدھے کھلے ہوئے دروازے کے اندر دھوپ چھاؤں میں لحافوں کی دھند کو پھیلتے اور مٹتے دیکھ رہا تھا۔

یکایک دروازہ پورا کھل گیا۔ دروازے میں ماں کھڑی تھی۔ اس کے خضاب سے رنگے ہوئے سیاہ چمکتے بال سڈول شانوں پر جھول رہے تھے۔ وہ مسکرائی اور اس کی آنکھوں سے روشنی چھلک پڑی۔

"اچھا تو تم جاگ گئے! اتنا سویرے؟"

ماں کتنی خوبصورت ہے!

اس کی آنکھوں میں چنگاریاں تڑ پیں، ہونٹ آہستہ آہستہ پھیلے۔ پپڑیاں پھٹ گئیں اور زبان پر نمک کا مزا مری ہوئی چیونٹیوں کی طرح چپک کر رہ گیا۔

کسی ماتم گسار نے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کچھ پھنکارنے کے انداز میں کہا "باپ مر جاتا ہے۔ بیٹا زندہ رہتا ہے۔ یہی ہوتا آیا ہے۔"

ماں نے جانے والے کو بڑی شکر گذار نظر سے دیکھا اور مسکرائی۔ اس کی آنکھیں اب بھی روشن تھیں، "کبھی کبھی لگتا ہے کہ زندگی یہاں ختم ہوگئی۔ لیکن زندگی جہاں ختم ہوتی ہے وہاں ختم نہیں ہوتی۔ اس سے آگے جاتی ہے۔"

ماں نے اس کے گال پر ہاتھ پھیرا اور کہا "اوپر جاؤ۔ جا کر شیو کر لو۔"

وہ اوپر گیا اور اپنے باپ کے سیفٹی ریزر سے، جو ہفتوں سے استعمال نہیں ہوا تھا اور جس پر پرانا بلیڈ چڑھا ہوا تھا، ہفتوں کی داڑھی کو کھرچنا شروع کر دیا۔

"میرا باپ خدا کا بیٹا تھا۔ میں خدا کا پوتا ہوں۔"

اس کے ہونٹ پھیل گئے۔ پپڑیوں سے رستا ہوا خون شیونگ کریم کے خوشبودار جھاگ میں گھلنے لگا۔

ماں نہا کر باتھ روم سے نکلی تو نیلا ٹرکش باتھ تولیہ اس کے بھیگے ہوئے جسم سے چپکا ہوا تھا۔ وہ پنجوں کے بل چلتی ہوئی کمرے کے دروازے تک گئی۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے چند لمحے کو رکی۔ دور کے کمرے سے گٹار کی گونج اور بھنسا بھنسا مدہوش لحن سنائی دے رہا تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اور دروازہ بند کر دیا۔ سنگار میز کے سامنے تولیہ اس کے شانوں سے سرک گیا۔ وہ تھوڑی دیر آئینے کے سامنے ششدر کھڑی رہی۔ وہ بار بار نظر کو چہرے پر جمانا چاہتی تھی اور بار بار اس کی نظر پھسل کر اپنی ناف کے نیچے جھریوں سے منڈھے ہوتے ڈھیلے ابھار پر جم جاتی تھی۔ کبھی یہ لڑکا اسی چھوٹے سے جال میں بند تھا۔ مگر اب دیکھو، اس نے جھک کر ولایتی برش اٹھایا اور بھیگے ہوئے لمبے بالوں کو سر کیا۔ ولایتی خوشبو کے چھڑکاؤ سے جسم کے نازک گوشوں کو مہکایا۔ جب اس نے کپڑے پہنے تو گدے دار نیلے بریسرز کا گہرا گلابی رنگ ہلکے گلابی بلاؤز سے چھن رہا تھا۔ چہرے پر ولایتی پوڈر کی تہیں جب گہری ہو گئیں تو آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی غائب ہو گئے اور بے نیند آنکھوں کی تھکن بھی۔ ہونٹوں پر سرخی پھیر کر اس نے کئی بار ہونٹ چپکائے اور کھولے اور ایڑیوں سے ساری کے کنارے کو دبا کر کئی بار آئینے میں دیکھا، مسکرائی، چہرہ دمک اٹھا نچلا ہونٹ ہونٹوں میں دباتے ہی اس کی عمر کوئی پندرہ سال کم ہو گئی اور وہ یہ جانتی تھی جلدی جلدی عینک اٹھاتی، دو تین کاپیاں سمیٹیں اور زینے سے ہوا کی طرح اتری۔ کار

میں بیٹھتے ہوئے ایک بار دُور کے کمرے کی طرف دیکھا جہاں سے گٹار کی دھن، سنائی دے رہی تھی۔

"جانے یہ بدکا ہوا گھوڑا کب قابو میں آئے گا۔"

کار کی دور جاتی ہوئی غراہٹ کے ساتھ ٹیپو کی نسوں کا تناؤ کم ہونے لگا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا "چلو چھٹی" اور گٹار ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے ننگے جسم پر پسینہ چیونٹیوں کی طرح دوڑ رہا تھا۔ میلے لمبے ناخنوں سے اُس نے میلی ناک کو کریدا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ لمبے لمبے قدم سے کھڑکی کے پاس پہنچا، آہستہ سے کھڑکی کا پٹ کھولا۔ نیم وا آنکھوں کو چھوتی ہوئی دھوپ کی لہر کھڑکی سے باہر چھننے لگی۔ دھندلکے میں دیوار پر اس کے ہاتھ کے ابھارے ہوئے نقوش کچھ گڈمڈ سے ہونے لگے۔ اس کے جسم کا پسینہ فرش پر اس کے قدموں کے نشان چھوڑتا ہوا پھیل رہا تھا۔

دیواریں طرح طرح کے نقوش اور خاکوں سے جنی ہوئی تھیں۔ جیسے جیسے کمرے میں دن کی روشنی رسنے لگی، ویسے ویسے ان میں جان پڑھنے لگی۔

رینگو۔ تم بھی رینگو، دھوپ بھی رینگتی ہے۔ تو بھی
مونا لیزا کی بچی۔

وہ آہستہ آہستہ انگلیوں کو مسلتا ہے۔ رانوں کو سہلاتا ہے اور ناچتا ہے جیسے اس کے پاؤں زمین پر نہ ہوں۔ خود اس کے ہاتھوں کے کھینچے ہوئے نقوش بھی ناچتے ہیں۔ چہرے، ٹانگیں، پھیلی ہوئی، گتھی ہوئی، اکڑی ہوئی، مڑی ہوئی۔ چہرے جن پر کیکٹس کے کانٹے اُگے ہوئے ہیں، پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان ایٹم بم طلوع ہو رہا ہے۔ پستانوں پر نیل چٹے پتنگوں کی طرح اُڑ رہے ہیں۔ کتا ایک ٹانگ اٹھائے ہوئے ہے اور زمین پر کیڑوں کے چاٹے ہوئے پھول جھڑ رہے ہیں۔

مونا لیزا کی بچی!

اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ وہ رانوں کو سہلاتا ہے اور آہستہ آہستہ جھکتا ہے، جھکتا ہے، بھیگے ہوتے درخت کی شاخ کی طرح۔ ہتھیلیوں پر تھوکتا ہے اور ناف کے نیچے گدگداتا ہے۔ اس کا جسم جلنے لگتا ہے۔ وہ مال کے چھوٹے سے کیبنٹ میں ایک کیسیٹ ڈالتا ہے اور بٹن دباتا ہے۔ ٹھنڈی سانسوں کی آہنگ میں پاگل بنا دینے والا اضطراب ہے۔ وہ ناچ رہا ہے اور اس کی باہوں میں کوئی لچک رہا ہے۔

آجا

آ

لے دے

دے لے

ہائے

بس

بس

بس

وہ افریقہ کی جنگلی دھن پر ناچ رہا ہے۔ اس کا تپتا چہرہ مسخ ہو رہا ہے۔ اس کے جسم میں بے شرم جارحیت پیدا ہو رہی ہے۔ تناؤ، لعاب سے بھیگی ہوئی مٹھی اس دھن پر گدگدی کا میٹھا زہر نچوڑ رہی ہے۔ ایک ایک روئیں سے، آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔ جسم کی حرکتوں کا آہنگ سورج کی طرح اڑ رہا ہے۔ اپنے جلتے پروں سے۔ اور سورج مٹھی میں بند ہے۔ وجود کی ساری آگ اگلنے کو بیقرار۔ کوئی اس کے جسم سے چپک رہا ہے۔ اس کا دوسرا ہاتھ ہونٹ کھولتا ہے اور آگ کے پیکر کو چومتا ہے۔ یہاں، یہاں، یہاں۔ مونالیزا کی بچی ۔۔ وہ آگ کی لپٹوں کو باہوں میں سمیٹے ہوئے فرش پر گر جاتا ہے۔ نڈھال، خاموش۔ وہ اب بھی ایک جسم کو سہلا رہا ہے جو فرش کی طرح ٹھنڈا ہے۔ اس کی ہتھیلیاں بھی ٹھنڈی ہیں جو ایک ٹھنڈی کمر کو سہلا رہی ہیں

بازو بھی ٹھنڈے ہیں جو ٹھنڈی ہڈیوں کو توڑ رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہر چیز ٹھنڈک میں لپیٹ کر سو جاتی ہے۔

جانے کب سے میں اسی طرح سو رہا ہوں۔ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ دیواریں مجھ پر اپنا ٹھنڈا دباؤ ڈال رہی ہیں اور دیواروں پر میرے ہاتھوں کے ابھارے ہوئے بیکر سب مجھے کاٹ رہے ہیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے ڈنک، ٹھنڈی ٹھنڈی سرسراہٹ ٹھنڈی ٹھنڈی رگیں، ٹھنڈی ٹھنڈی رگیں، ٹھنڈی ٹھنڈی خاموشی، ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی، ٹھنڈے ٹھنڈے سائے، ٹھنڈی ٹھنڈی کاٹ، ٹھنڈی ٹھنڈی ٹیس۔ سب کچھ ٹھنڈا، سب کچھ مرا ہوا۔ میں یہ سب محسوس کر سکتا ہوں۔ اور وہ؟ جس کی ٹھنڈک نے مجھے جینے پر مجبور کیا۔ وہ ہزاروں من مٹی کے نیچے کیا کر رہا ہے؟ وقت کے کیڑوں نے کچھ چھوڑا ہے۔ بے ہنگم، لحیم شحیم ہڈیوں کے سوا؟ لو یہ ہڈیاں ہیں ٹیڑھی میڑھی۔ ملی۔ مٹی کھائی ہوئی۔ ٹوٹی پھوٹی۔ چاہو تو تم ان ہڈیوں کو اپنے سوٹ کیس میں رکھ کر دنیا کے سفر پر نکل سکتے ہو۔ میرے باپ نے یہ سوٹ کیس اپنی ہڈیوں کے لیے نہیں دیا تھا۔ جانتا ہوں۔ میں تو ایک بات کہہ رہا ہوں سوٹ کیس خالی ہے۔ میں بھی اور سوٹ کیس کو یا اپنے آپ کو ہڈیوں سے بھرنے سے فائدہ؟ اٹھنا چاہیئے۔ نکلنا چاہیئے، دیکھنا چاہیئے۔ کیا سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا تھا، کیا کچھ بدلا بھی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے سب کچھ میں، میں بھی شامل ہوں۔ جیسے میں کوئی کمبل ہوں۔ کوئی جوتا، کوئی ٹوتھ پیسٹ، کوئی درخت، کوئی ہوا کا جھونکا یا کوئی تھوکا ہوا بلغم۔ گاڈ! اُٹھنا ہے۔ کھڑا ہونا ہے۔ باہر نکلنا ہے۔

اُس نے پھر شیو نہیں کیا۔ وہ پھر نہیں نہایا۔ نیکر پہنا اور کندھے پر تولیہ رکھا، لیکن اس سے آگے جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ماں کے کمرے کے باہر مستطیل برآمدے میں، جس کا رُخ کھلی ہوئی چھت کی طرف تھا، چھوٹی سی میز پر اس کا ناشتہ روز کی طرح رکھا ہوا تھا۔ دودھ کے ٹھنڈے گلاس کے کنارے پر مکھیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ توس پر مکھن پھیل کر گھی کی طرح چکنا ہو گیا تھا۔ ایسی

ہی چکناہٹ اسے اپنی ماں کے میک اپ کیے ہوئے چہرے پر نظر آئی تھی۔ توس اور ماں کا چہرہ! وہ دبے پاؤں فریج کے پاس گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی اور نہیں تھا گھر میں۔ دُور سے جھاڑو کی آواز یوں سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی سسکیاں بھر رہا ہو۔ اس نے فریج سے پانی کی ٹھنڈی بوتل نکالی اور دکھڑا کھڑا پی گیا۔ جیسے جیسے اس کی پیاس بجھ رہی تھی اس کی رگیں، پھولتی جا رہی تھیں۔ وہ میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹانگیں اٹھا کر اس نے میز پر رکھ لیں۔ اس کے کالے میلے ناخنوں کی قربت سے مکھیاں اڑ گئیں۔ اس کا لمبا ہاتھ اور لمبا ہو گیا اور وہ بغیر مُنہ دھوئے دودھ پینے لگا۔ توس کو اس نے چھوا بھی نہیں۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ بہت دیر سے توسوں پر مکھیوں کو اترتے اور پھر میلے کالے ناخنوں کی جنبش سے اڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور گلا خشک ہوا جا رہا تھا۔ دور بڑے بڑے درختوں کو ہوا جھنجھوڑ رہی تھی۔ جھاڑو کی آواز دوپہر کے سناٹے میں کھو چکی تھی۔

کب تک میں پیچھے کے زینے سے آتا جاتا رہوں گا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا "ٹیپو آؤ۔" میرے پاس آؤ۔ مجھے دیکھو۔ میں کہیں نہیں گیا۔ میں یہیں ہوں بھاری آواز سے دوپہر کا گھر بھر گیا۔ اسے لگا کہ اس کے سینے میں کوئی بڑی سی چٹان پھنس گئی۔ وہ کھڑا ہوا تو ہانپ رہا تھا۔ گلاس لڑکھڑاتا ہوا گلدان سے ٹکرایا۔ مکھیاں بے خبر رہیں۔ اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

نہیں یہ سب..... نہیں میں اس آواز کو نہیں پہچانتا ہوں۔

اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا

بھری دوپہر کو اس کا گھر رات کے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ سائے سایوں میں ڈوب رہے تھے۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ دیواریں دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔

وہ کھڑا ہو گیا اور راستے ڈھونڈنے لگا۔

کدھر جاؤں۔ کہاں جاؤں

سیالوں میں ایک سیاہ ہیولا ذرا خم کھائے ہوئے زینے کے نیچے کھڑا تھا اور اُس کو اشارے سے بُلا رہا تھا۔

ڈراکولا!

ماں نے کہا تھا ڈراکولا اُس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ بھاگتی ہے اور یہ سیاہ ہیولا ہاتھ بڑھا کر اسے دبوچ لیتا ہے اور اپنے دانت اس کی گردن میں پیوست کر دیتا ہے۔ ماں اس کے دانت کہاں ہیں۔ یہی تو بات ہے اس کے دانت دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن میں جانتی ہوں یہ دانت کتنے لمبے اور کتنے تیز ہیں اور جتنی بار یہ دانت میری گردن میں ڈوبتے ہیں کھولتے ہوئے زہر کی زبانیں خون میں لپکتی ہیں۔ یہ ڈراکولا مجھے کھا گیا ماں۔ مجھے یاد ہے جب میں بہت ہی چھوٹا تھا تو میں نے اس لحیم شحیم ڈراکولا کو تمہارے بستر پر دیکھا تھا۔ وہ سو رہا تھا چھت پر دھوپ چمک رہی تھی اور تم اسے چاٹ رہی تھیں اور وہ سو رہا تھا اور تمہارے دو دانت اس کی گردن میں چبھے ہوئے تھے۔ تم سو رہی تھیں اور وہ مزے میں سو رہا تھا۔ میں بھاگ کھڑا ہوا۔

آواز بہت قریب آگئی تھی۔ وہ تھرتھراتی ہوئی ٹانگوں سے اترا۔ وہ اتر رہا تھا اور زینہ بڑھتا جا رہا تھا اور جہاں زینہ ختم ہونا تھا وہیں وہ کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ زینے کی ریلنگ پر تھا اور دوسرا عینک کی کمانی پر۔

آؤ۔ آؤ۔ بیٹے آؤ۔ مجھے بچا لو

میں تیزی سے اترنے لگتا ہوں۔ میں زینے کا فاصلہ کم کرنا چاہتا ہوں۔ مہینوں بعد اس زینے سے اُتر رہا ہوں جو گھر کے اندر اترتا ہے اس کمرے کے پاس جو موت کا کمرہ ہے۔ جب بھی کوئی مرنے لگتا ہے اس کمرے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ڈراکولا بھی اسی کمرے میں ڈال دیا گیا تھا۔ لیکن اب مجھے کچھ یاد نہیں دوپہر کا سناٹا رینگ رہا ہے، سرسرا رہا ہے اور اب میں نیچے آگیا ہوں۔ میرا مہینوں کا پالا خوف میرے سینے میں کتے کی طرح بھونک رہا ہے۔ یکا یک ریلنگ پر سے

ہاتھ ہٹا۔ عینک ناک پر سے پھسل اور ہیولا، سیدھا، پشت کی طرف آن پڑا اور ہوا میں تیرتا ہوا موت کے کمرے میں غائب ہوگیا۔ میں کمرے کے اندر دیکھ رہا ہوں۔ قبر کا منہ کھلا ہوا ہے اور وہ چت لیٹا ہوا ہے۔ کمرے میں روشنی بھی ہے اور اندھیرا بھی۔ دونوں ایک دوسرے کو چاٹ رہے ہیں۔ روزن بند ہے ہوا بند ہے۔ اس کا گنجا سر چمک رہا ہے جس پر پسینے کی بوندیں تیر رہی ہیں اس کا پورا جسم بے حرکت ہے لیکن خون اس کے منہ سے ابلتا ہے اور اس کی گردن پر پڑی ہوئی چادر کو بھگو دیتا ہے۔ وہ آنکھ کھولے بنا مجھے دیکھتا ہے ہونٹ جمے ہوئے خون سے چپک گئے ہیں۔ مگر وہ ہونٹوں کو کھولے بنا مسکراتا ہے۔ ماں ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہی ہے اور کہہ رہی ہے۔ میں ایک ایسے آدمی پر سب کچھ لٹا دوں جو مر رہا ہے؟ اسے تو مرنا ہے مگر ان کا کیا حال ہوگا جو زندہ ہیں اور جو زندہ رہیں گے۔ I AM NOT A SENTI — MENTAL FOOL' اور ہیولا، جو اب ہڈیوں پر لپٹی ہوئی بے رنگ کھال کے سوا اور کچھ نہیں، آنکھیں کھول دیتا ہے۔ وہ مجھے دیکھتا ہے۔ اس کے دیدے کن گہرائیوں میں غرق ہیں۔ ان میں چنگاریاں جھلملاتی ہیں۔ پھر منہ خون سے بھر جاتا ہے اور تھکے ہوئے پپوٹے چنگاریوں کو بجھا دیتے ہیں۔ گھر میں اطمینان کی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ عذاب کٹا۔

ٹیپو۔۔ تم کہاں ہو؟ ماں پکار رہی ہے۔ بہت دور سے آواز دے رہی ہے۔ شاید کسی جنگل میں کھو گئی ہے اور اب ڈر رہی ہے۔ اسے راستہ نہیں مل رہا ہے۔ بڑی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ درخت پانی کے بوجھ سے زمین پر گر پڑے ہیں۔

"ٹیپو۔۔ تم کہاں ہو؟"

میں کہیں نہیں ہوں۔ میں جاگتا ہوں اور گھر کے سارے دروازے بند کر دیتا ہوں اور بھاگ کر زینے کے پاس لوٹ آیا ہوں اور موت کے کمرے کی طرف

گیا ہوں۔ ڈرائنگ روم سے شراب کی بُو قہقہوں کی گونج کے ساتھ آ رہی ہے زندگی کب کسی کا غم کھاتی ہے۔ کوئی خون تھوکتا ہے۔ کوئی وہسکی پیتا ہے۔

"اس کی گردن موٹی ہی نہیں ریڑ کی بنی ہوئی ہے۔ بہت سارے ربڑ کی۔ اور وہ اس پر ٹائی باندھتا ہے۔"

ڈراکولا کا منہ کھلتا ہے مگر دانت دکھائی نہیں دیتے۔ وہ آہستہ آہستہ کالر کو سہلاتا ہے اور ٹائی کی موٹی گرہ کو ٹٹولتا ہے۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

میں سہم جاتا ہوں

"میں مردہ بادشاہ کا بھوت نہیں ہوں اور تم ہملٹ نہیں ہو۔ پھر بھی مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

میرا گلا خشک ہو جاتا ہے اور میں چیخنا چاہتا ہوں۔ بچاؤ! بچاؤ! اس کا ہاتھ بڑھتا ہے اور میرے پاؤں زمین میں گڑ گئے ہیں۔

یہ کس کا ڈراکولا ہے۔ بھاری بھرکم ہیولا، نرم ہاتھ، لجلجی مسکراہٹ، بڑا سا چہرہ، بڑا سا سر۔ میں جا رہا ہوں۔ میرا کچھ نہیں ہے۔ نہ وہ عورت نہ یہ گھر، نہ یہ کار، نہ وہ باغ، جہاں کیاریوں کے پاس جھولتی ہوئی شاخوں پر چڑیاں چہچہا رہی ہیں، نہ وہ گملے ہیں جن میں، میں پانی ڈالتا رہا ہوں، نہ یہ چقیں جن کو میں گرمیوں میں گرا دیتا تھا اور جاڑوں میں اٹھا لیتا تھا، نہ یہ ڈرائنگ روم جہاں تمہاری ماں کے دوست وہسکی پی رہے ہیں اور اپنے کیریئر کو نکھارنے کے لیے اپنے حریفوں کے خلاف زہر اُگل رہے ہیں، مجھ پر جملے چست کر رہے ہیں اور تمہاری ماں کی آنکھوں میں اپنا اپنا عکس دیکھ رہے ہیں، بڑے اچھے لوگ ہیں، جو یہاں سے نکلتے ہی اپنی یا کسی اور کی بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈالیں گے اور رکشا میں چپک کر بیٹھیں گے اور کہیں گے "کیا مردمار عورت ہے۔ مجھے تو اس آدمی پر بڑا ترس آتا ہے جس میں،

اتنی سی خود داری نہیں، مَیں ہوتا اُس کی جگہ .... یہی تو بات ہے کہ تم سب
کم بخت اس کی جگہ ہونا چاہتے ہو حالانکہ وہ کم بخت خود اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ وہ
سالی عورت ہی کچھ ایسی ہے۔ چھلکتی ہوئی۔ چھوٹے سے گلاس میں شراب بہت زیادہ
انڈیل دی گئی ہے۔ نہ وہ طوطے جو کب کا پنجرہ کھول کر کھلی ہوئی ہواؤں میں اڑ گئے،
نہ وہ بلیاں جو ہر وقت جمائیاں لیتی رہتی ہیں، اور نہ وہ کتے جو میری طرح مر رہے ہیں
ان کے کیڑے بھی دکھائی دیتے ہیں اور زخم بھی۔ میرے نہیں دکھائی دیتے۔ یہی تو
فرق ہے۔ ویسے یہ کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ چائے کی وہ ٹرے بھی نہیں جو
مَیں ہر صبح نماز کے بعد اوپر لے جاتا ہوں جہاں وہ عورت اپنی بسین دوست
کی آغوش میں دبی دبائی پڑی رہتی ہے۔ ریشمین نائٹی۔ نہ وہ میٹھی تھکن جو میں
اس کی کچھ سوتی کچھ جاگتی آنکھوں میں دیکھتا ہوں۔ نہ وہ سڑک جس کے آخر میں
ایک پھاٹک ہے اور جسے میں روز صبح کھولتا ہوں اور رات کو بند کر دیتا ہوں
تاکہ صبح کو اس عورت کی کار گرد اڑاتی ہوئی نکل جائے اور رات کو کوئی چور نہ آنے
پائے۔ حالانکہ کار پھاٹک سے نکلنے سے پہلے بھی غراتی ہے اور چور پھر بھی آتے
ہیں۔ یہ کتے مجھے کچھ عجیب نظروں سے دیکھ رہے ہیں جیسے یہ معلوم ہو گیا ہو کہ
مَیں اب کے جاؤں گا تو لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ اُن کے سوا کسی کو بھی میرے سفر کا
احساس نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا سفر اتنا آسان ہو گیا ہے۔ رات
بھیانک ہے اور کتے رو رہے ہیں۔ وفاداری کتوں کو رُلاتی ہے۔ مجھے اس کا
غم ہے کہ تم سب مجھے قبر میں ڈالتے ہی بھول جاؤ گے لیکن یہ کتے مجھے یاد کریں گے
اور رو رو کر مر جائیں گے THEY ARE SUCH SENTIMENTA FOOLS تمہاری
آنکھیں پھیل رہی ہیں۔ تم پہلی بار مجھے پہچان رہے ہو۔ میں سو نہیں رہا ہوں
اور تم چرس کے نشے میں نہیں ہو۔ اس کو موت کے کمرے میں پڑے پڑے
بہت دیر ہو چکی ہے۔ اس کی لاش سر سے پاؤں تک سفید چادر سے ڈھکی
ہوئی ہے۔ آنگن میں میت کو نہلانے کا انتظام ہو رہا ہے۔ خدا ترس لوگ بہت

مصروف ہیں۔ اتنے سارے لوگ کہاں سے آ گئے ہیں۔ پورا لان بھر گیا ہے۔ وہ تو بڑا گمنام سا شخص تھا۔ لوگ تو اس کو محض عورت کے دُم چھلے یا غلام کی حیثیت سے جانتے تھے۔ پھر بھی کچھ لوگ رو رہے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے۔ خود عورت کتنی حیرت زدہ ہے۔ سب ایک دوسرے کے کان میں منہ ڈال کر کچھ کہہ رہے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے۔ مردہ یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے اور لہو لہان، خشک، ٹھنڈے ہونٹوں سے مسکرا رہا ہے، اب اس مسکراہٹ پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ہے۔ مُردہ اٹھتا ہے اور سب کی نظر بچا کر پورے گھر کے چکر لگاتا ہے۔ ویسے جب وہ زندہ تھا تب بھی سب کی نظر بچا کر ہی جیتا تھا۔ مگر وہ اب ان سب کمروں میں جا رہا ہے جہاں وہ برسوں سے نہیں گیا تھا۔ اوپر سنگار میز پر کنگھے میں الجھے ہوئے بالوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ آئینے میں اس نے اپنا عکس دیکھنا چاہا۔ لیکن اب اس کا کوئی عکس نہیں تھا۔ پہلی بار اسے اس تبدیلی کا احساس ہوا۔ اس کا وجود اب زندگی کے ہر آئینے سے اپنا عکس چھوڑے بنا چھن رہا تھا۔ ساری کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ بہت سی ان میں ایسی تھیں جو کبھی کھلی ہی نہیں تھیں، مگر تھیں۔ اسکاچ کی ایک خالی بوتل سنگار میز کے پاس کونے میں رکھی تھی۔ وہ دیر تک اس بوتل کو دیکھتا رہا۔ جیسے اپنے آپ کو دیکھ رہا ہو۔ ماضی سے ایک قہقہہ اڑتا ہوا آیا اور اس پر پھٹ پڑا۔ یہ ماں کا قہقہہ تھا۔ ڈرائنگ روم سے اڑ کر آیا تھا۔

"جب اسکاچ سامنے ہو تو ٹھرا کون پیئے؟" اس نے سُرخ ڈورے ڈال بھری سوجی ہوئی آنکھوں سے ڈرا کولا کی طرف دیکھا تھا۔ اس شخص میں اتنا سا سنس آف ہیومر نہیں ہے۔ بے غرق مرا ہوا ٹٹو۔ جب دیکھو جب مٹانے کی بات، جب دیکھو جب ان چھوٹی چھوٹی حکایتوں کا قصّہ جو اس نے بچوں کی ہدایت کے لیے لکھی تھیں۔ یا یہ ذکر کہ خانصاحب کے بیٹے کی شادی میں قورمہ مغلئی شان کا تھا اور زردے میں خوشبو واجد شاہی پان کی تھی۔ آم تو اصل رام پور میں ہوتے ہیں گٹھلیاں برائے نام اور مزا تم بہشت کا۔ جب دیکھو جب دوسروں کی عقیقہ یا ختنہ کا انتظام کیا جا رہا ہے

یہ جوش کبھی اپنی شادی میں نظر نہیں آیا۔ ساری سرگرمی خلوت میں۔ سارا خون پسینہ بستر پر۔ باہر وہی جانماز، وہی تسبیح، وہی وظیفہ خوانی۔ آدمی ہے یا گھن چکر۔ اور میں زندگی سے ایک ایک بوند نچوڑ لینا چاہتی ہوں۔ میں تمام روایتوں کو توڑ کر زندہ رہنا چاہتی ہوں اور یہ شخص ایک بھاری چٹان کی طرح میری گردن میں بندھا ہوا ہے۔ اگر میں چٹان ہوں تو مجھے پھینک دو، دور اپنے وجود کی حدود سے باہر۔ حرام زادے پھینک تو دوں، اپنی پرانی سینڈل کی طرح۔ مگر میرے کیریر کا کیا ہوگا بدنام ہو جاؤں گی۔ چلو تمہاری یہ بزدلی مجھے سوٹ کرتی ہے۔ اس چٹان کو گردن سے لٹکنے دو۔ میں تیل چٹے کی طرح رات کے اندھیرے میں تمہارے وجود کے ارد گرد رینگتا رہوں گا۔ اکیلے تم ہو جس کو چھوڑنے کا مجھے غم ہے۔ تم میں کوئی ایسی بات ہے جو مجھے جینے پر مجبور کرتی ہے۔ تمہاری نرمی اور سفاکی۔ کیا تم نے اس وقت بھی چرس پڑھا رکھی ہے۔ تمہاری آنکھیں میرے چہرے پر کچھ عجیب طرح سے گڑی ہوئی ہیں۔ تمہارے الجھے ہوئے بال مجھے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں اس لیے گھنے بال میری کمزوری ہیں۔ کبھی میرے بال بھی بڑے گھنے تھے مگر زندگی نے چپت مار مار کر صفایا کر دیا۔ تم اتنے بلیے ہو میری طرح۔ اور چھریرے، جیسا میں کبھی نہیں تھا۔ میری سیاہی اور تمہاری ماں کی دمک نے مل کر تمہارا رنگ کتنا نکھار دیا ہے اور میں حیران ہوں کہ اگر زندگی میں پہلی اور آخری بار میں نے تمہاری ماں سے بغاوت نہ کی ہوتی تو تم کہاں ہوتے۔ میں مرتا تو یہ جانے بنا مرتا کہ کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں نے زندگی میں ایک ہی سازش کی ہے تب تم خون کی جیلی بن چکے تھے اور تمہیں آپریشن ٹیبل پر قتل کرنے کا انتظام ہو چکا تھا اور تب میں نے ڈاکٹر کو رشوت دی تھی اور تمہاری ماں کو شکست۔ خون کی جیلی کو جاگنا تھا، باہر آنا تھا۔ دھوپ میں اب میں اس دھوپ کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم کیوں چرس کے کش اڑاتے ہو۔ تمہیں یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ یہ سب بھول جاؤ۔ میں چلا جاؤں گا۔ پھر نہیں آؤں گا

پر جاتے جاتے ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ تم ان سب باتوں سے بھاگتے بھاگتے اب اپنے آپ سے بھاگ رہے ہو۔ کوئی اپنے آپ سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے ڈراکولا کی آواز بھرا جاتی ہے۔ بہت عمدہ کاک ٹیل ہے۔ مائی گاڈ۔ آہستہ آہستہ پیو۔ گھونٹ گھونٹ، اس کو لیکچر دینے میں مزا آتا ہے۔ اس لکچر میں وہ اپنا سارا فرسٹریشن نچوڑ دیتا ہے۔ ٹھس کہیں کا۔ آپ کس سے و بلیوز کی بات کر رہے ہیں جناب؟ آپ کا چہرہ ڈوبتے چاند کی طرح سفید ہو گیا ہے۔ سفید یا سرخ؟ چڑھ رہی ہے۔ چڑھنے دو۔ تھوڑی اور، بس ذرا سی۔ دیکھئے آپ چوٹ کر رہے ہیں۔ میں روایتی و بلیوز کو گرد سمجھتی ہوں۔ میری و بلیوز ہیں وہ لمحے جو میں جیتی ہوں۔ جن کا میں تجربہ کرتی ہوں جو میرے وجود میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس شراب کی طرح، جی ہاں، بڑے اسمارٹ ہیں آپ۔ آپ کو پائریا تو نہیں؟ وھاٹ اے بور! ڈیم اٹ۔ پھر وہی و بلیوز کا قصہ، مادام۔ آپ تو ذرا سی بات پر بپھر جاتی ہیں۔ دیکھئے نا پینے کے بعد INHIBITIONS ختم ہو جاتی ہیں۔ اور وقت سوال، مُردوں کی طرح، قبر سے نکل پڑتے ہیں۔ ہا ہا ہا! قیامت کے دن بھی ہو گا۔ قیامت کا کوئی دن مقرر نہیں ہے۔ ویسے یہ قیامت اصل میں آپ کا ضمیر ہے اُتر آیئے نا کلیشے پر۔ اس کی آنکھیں چڑھ رہی ہیں۔ ہونٹ بھیگے بھیگے، سوچے سوچے دکھائی دے رہے ہیں۔ میں تو صرف یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ___ باقی سارے کام تو آپ اُسی طرح کرتی ہیں جس طرح دوسرے لوگ کرتے ہیں، مگر جیتی ہیں آپ بالکل دوسری طرح ___ کیریئر، عشق، جائیداد، جھوٹ۔ کیا یہ سب وہی لمحہ لمحہ، میرا مطلب ہے چڑھ گئی۔ تم گھر جاؤ، اس کے ہونٹ چپک گئے ہیں بلاؤز کے گول گریبان میں سنہرا انلاطم پیدا ہو گیا ہے۔ سب خوش ہیں لطیفوں پر ہاتھ ہلا رہے ہیں۔ صرف وہ اکیلا کھڑا ہے۔ سہما ہوا، خوف زدہ اتنا لحیم شحیم جسم اور موجودگی اتنی، تھرمس۔ ڈراکولا کونے میں ہے اور اس کا منہ دیوار کی طرف ہے۔ موڈ سے کار کی غرّیوں کا سنائی دیتی ہے۔ ڈراکولا ہوا میں پگھل جاتا ہے۔

میں موت کے کمرے میں جھانک کر دیکھتا ہوں۔ وہاں نہ وہ پلنگ ہے نہ خون سے بھری ہوئی سلفچی، نہ دوائیں، نہ اکتائی ہوئی آنکھیں، نہ موت کا خاموش انتظار وہاں کچھ نہیں۔ کم از کم مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ باہر کے برآمدے میں اونچی ایڑیوں کی کھٹ کھٹ ابھرتی ہے اور میں زینے پر اوپر بھاگتا ہوں۔ یکایک میں کتنے خطروں میں گھر گیا ہوں۔ اب ہر طرف سے دھوپ حملہ کر رہی ہے۔ دروازے میں کنجی گھومتی ہے اور دروازہ چرچراتا ہے۔ مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور میں لرزے کو دبانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اپنے کمرے میں بند ہو جاتا ہوں۔ کمرے میں بند ہوتے ہی میں ہر خطرے سے محفوظ ہو جاتا ہوں۔ یہاں بہت مانوس سی بو بسی ہوتی ہے۔ دیواروں پر میرے بناتے ہوئے ڈرائنگ اپنی تمام خباثتوں اور بھیانک پن کے ساتھ اینٹھتے چکراتے ہیں اور مجھے گلے لگا لیتے ہیں۔ I AM AT HOME، وہ سب منڈلا رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ وہ بکھر رہے ہیں اور چیخ رہے ہیں۔ آنکھیں جو نیزوں اور سانپوں سے بھرے ہوئے پاتال کی طرح ہیں ہوا میں اپنے سیاہ پروں سے اڑ رہی ہیں۔ کٹے ہوئے بازو، کٹے ہوئے سر، بہتی ہوئی ناکیں، اندام نہانی میں ڈنک مارتے ہوئے بچھو، سب ہوا میں اڑ رہے ہیں، ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ میں گٹار اٹھا لیتا ہوں۔ میری انگلیاں جلنے لگی ہیں۔ میری انگلیوں سے آگ ٹپکتی ہے، بوند، بوند اور گٹار کے جاتے ہوئے تاروں پر دوڑتی ہے۔ بوند بوند!

اونچی ایڑیاں بہت قریب آگئی ہیں۔ یہ کھٹ کھٹ مجھے ڈراتی ہے اور میں گٹار کے تاروں کی گونج کو بڑھا دیتا ہوں۔ اونچی ایڑیاں اپنے کمرے میں جاتی ہیں۔ پھر باتھ روم میں۔ پھر میرے دروازے پر دستک۔ زور دستک زور دستک۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔

"ٹیپو۔ جانتے ہو تم کتنے دنوں سے کمرے سے نہیں نکلے ہو"

میں اپنی انگلیوں کو اور تیز کر دیتا ہوں۔ لیکن اب اور زیادہ تیزی ممکن نہیں

میں گٹار پر جھک جاتا ہوں اور کمرے میں اڑتے ہوتے ڈرائنگ بھی اپنی اپنی دیواروں پر چپک جاتے ہیں۔

"ٹیپو دروازہ کھول دو۔"

ٹیپو اٹھتا ہے۔ ہانپتا ہوا۔ اس کا رنگ زرد ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیتا ہے۔

دیکھتے ہو تمہارا کیا حال ہو گیا ہے۔ کیا اسی لیے میں اسی لیے اننت دُکھ جھیلتی ہوں کتنا دکھ ماں؟ کیب دکھ کو کبھی ناپا اور تولا جا سکتا ہے؟ تم پوچھتے ہو کتنا دکھ۔ نو مہینے میں جب خون کی جیلی انسان کا دل بن کر دھڑکتی ہے تو جانتے ہو ماں پر کیا بیتتی ہے۔ ماں مجھے ڈراکولا تے بابا لوجی پڑھائی ہے۔ کون ڈراکولا۔ کیا بنایا ہے اس نے؟ ماں کی آنکھیں کاجل سے بھر گئی ہیں اور اب پتلیوں میں کسی چیز کا عکس نہیں ہے۔ ٹیپو چیونگ گم چبا رہا ہے۔ اس کا منہ ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ اس کی کمر میں خم پیدا ہو گیا ہے۔ ٹانگوں اور سینے پر گھنے بال پسینے میں شرابور ہیں۔ وہ چنگھاڑے کے انداز میں ہنس رہا ہے۔ تم ہنستے ہو۔ تم کتنا گھر گئے ہو۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں۔ سب کچھ بکھر کر رہ گیا ہے۔ سب کچھ کس نے بکھیر دیا ہے' ماں۔ وہ کاجل بھری آنکھوں سے جس میں کسی چیز کا عکس نہیں ہے ٹیپو کو گھورتی ہے۔ اس کے جبڑے تھکے ہوئے مینڈک کی طرح جلدی جلدی سانس لے رہے ہیں۔ وہ چباتے ہوتے چیونگ گم کو اپنی ہتھیلی پر تھوکتا ہے۔ پھر گلا پھاڑ پھاڑ کر گانے لگتا ہے۔ فریڈم، فریڈم! چیونگ گم کی گولی بناتا ہے اور پھر منہ میں رکھ لیتا ہے۔ گھن آتی ہے ٹیپو! تمہارے دل میں گرہ پڑ گئی ہے میں اسے کھولنا چاہتی ہوں۔ تم جانتے ہو سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں میں اکیلی ہوں اور جب تک یہ گرہ نہ کھل جاتے تم نہیں کھل سکتے۔

ٹیپو دیوانوں کی طرح قہقہے لگاتا ہے اور دیواروں سے ٹکراتا ہے۔ وہ ایک بڑی سی پنسل اٹھاتا ہے۔ اس کی لکڑی کو دانت سے نوچتا ہے، سیاہ

نوک پر تھوکتا ہے اور سامنے کی دیوار پر تیزی سے ایک لمبی سی ناک بناتا ہے۔ میلوں لمبی ناک۔ بار بار خطوط پر پنسل دوڑاتا ہے۔ ناک الجھتی جاتی ہے اور الجھی ہوئی لکیروں سے ایک خوف زدہ شکل ابھرتی ہے۔ جس طرح منہ کھلا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے چیخ کانٹے دار گیند کی طرح گلے میں پھنس گئی ہے۔ پن کشن ایک بار گلے میں پھنس جاتے تو نہ اگلا جائے نہ نگلا جائے۔ پن کشن گلے میں پھنسے کیوں۔ وہ صبح سے شام تک لکیریں کھینچتا رہتا ہے اور لکیروں پر لکیریں ڈالتا رہتا ہے اور وقت ان لکیروں کے جال میں نہیں آتا۔ ماں دروازے پر کھڑی انتظار کرتی رہتی ہے۔ اس کے انڈرویئر سے کیسی بدبو اٹھ رہی ہے۔ مگر وہ انتظار کرتی رہتی ہے۔ وہ جائے گا اور نہائے گا۔ وارڈروب سے صاف چمکتی ہوئی لندن والی قمیض پہنے گا۔ نیا انڈرویئر پہنے گا اور اس پر نیلی پتلون کا زیپ زن سے کھینچے گا۔ گھنگھریالے بالوں کو چوڑے کنگھے سے گردن تک سجائے گا۔ قیمتی سگریٹ کو ہونٹوں میں دبائے گا۔ صبح کو کالج جائے گا اور شام کو بیڈمنٹن کھیلے گا۔ ماں کے ساتھ کافی پئے گا اور جب اس خوبصورت ادھیڑ عورت کے دوست ڈرائنگ روم میں اسے بھی وہسکی آفر کریں گے تو وہ ایڑیوں پر گھومے گا اور بڑی فراخدلی سے انکار کر دے گا اور پڑوس کے گھر میں جا کر امیر خاندان کی بد دماغ لڑکی کو شیشے میں اتارے گا۔ رات کو سونے سے پہلے ماں کو غیر ملکی رسالوں میں پڑھے ہوئے جوک سنائے گا دونوں ہنسیں گے۔ پھر ماں کو جمائیاں آئیں گی۔ ٹیپو اشارے کو سمجھ جائے گا۔ اور بڈلیمپ کا بٹن دبا کر اپنے کمرے میں چلا جائے گا اور رات گئے تک ناولس کی کتابیں پڑھتا رہے گا اور خوبصورت اور ادھیڑ عمر عورت دوبارہ بڈلیمپ روشن کرے گی اور اپنے عاشق کے تازہ خطوط پڑھے گی اور سر دھنے گی۔ تھک رہا ہے۔ خبیث تھک رہا ہے۔ لیکن بے چارہ کیا کرے، مجبور ہے۔ اس کی بھی اجنبی وابستگیاں ہیں۔ ہم دونوں انوکھی ہستیاں ہیں لیکن زمانہ انوکھی

کو کسی نہ کسی ڈراکولا کے حوالے کر دیتا ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ جھک مارو، دو چار ہم آغوشیاں، دو چار بغل گیریاں، دو چار ہوٹل بازیاں، جھیل میں دو چار کشتی رانیاں، جھولوں میں دو چار پینگیں، دو چار بوتل شراب کی، پھر تھکن پھر فرار۔ اور کیا، اور کیا۔ قصہ ختم۔ بڈلیمپ جلتا رہتا ہے۔ آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ نیند آتی ہے تو گہری نیند آتی ہے اور سفر میں زندگی کا سفر لمبا ہو جاتا ہے۔

جانتا ہوں، ماں، کس بات کا انتظار ہے تمہیں۔ ہوا یہ ہے کہ ڈراکولا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے اور میں صاف دیکھ سکتا ہوں۔ سفید آپریشن ٹیبل پر تم پڑی ہو۔ یہ سفیدی مجھے اپنے باپ کے کفن کی یاد دلاتی ہے۔ ایک خوبصورت عورت آپریشن ٹیبل پر پڑی ہے۔ اس کی ٹانگیں پھیلی ہوئی ہیں اور سرخ سرخ جیلی بہہ رہی ہے۔ میں بہہ رہا ہوں۔ یکایک جیلی کی آنکھ کھل جاتی ہے اور ڈراکولا ڈاکٹر کے کان میں کچھ کہتا نظر آتا ہے۔ ڈراکولا اپنی لکیر دار پیشانی سے پسینہ پونچھ رہا ہے۔ اس کے ہونٹ سوکھے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر اپنے دستانے اتار دیتا ہے اور سرخ جیلی واپس ناف کے جال میں چلی جاتی ہے اور جب صدیوں بعد میں روشنی میں تیرتا ہوں تو روتا ہوں اور ہنستا ہوں ہنستا ہوں اور روتا ہوں SO YOU KNOW MOM میں کیوں روتا ہوں، میں کیوں ہنستا ہوں۔ تم انتظار کر رہی ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم تھک رہی ہو۔ پہلے تم نے کسی کا، کسی چیز کا انتظار نہیں کیا تمہیں فرصت ہی کہاں تھی۔

گھر پر رات کا سناٹا چھا گیا ہے۔ بلیاں بوڑھی ہو گئی ہیں۔ کتے اپنی کھال نوچ نوچ کر مر چکے ہیں۔ خوبصورت ادھیڑ عورت، لیمپ کی جھریوں بھری روشنی میں لیٹی ہوئی ہے، سگریٹ پی رہی ہے اور پلان بنا رہی ہے۔ اگر میں پلان نہ بناتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ میں نے وقت کے دریا کو اپنی پلاننگ سے نہ پاٹا

ہوتا تو مجھے اس طرح سگریٹ کے مرغولے بنانے کی، ٹھنڈی آہیں بھرنے کی، فرصت ہی کہاں ملتی۔ اب چین ہی چین ہے۔ جو کچھ زندگی نے مجھے دینے سے انکار کیا میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ میں نے پلاننگ کی اور ڈراکولا کے دانت توڑے۔ کسی ڈنٹسٹ کے یہاں جانے کی بھی ضرورت نہیں پڑی۔ میں نے پلاننگ کی اور عشق کیا۔ میں نے پلاننگ کی اور سب کو اپنے اپنے راستے پر ڈالا، سب اپنے اپنے راستے پر چل پڑے اور اب میں چپ چاپ رات کی خوشبو بھرے سناٹے میں اپنی خوشبو کے بارے میں سوچ سوچ کر جگالی کر رہی ہوں۔ سارے بیوقوف مجھ سے جل رہے ہیں۔ ایک تم ہو جو مجھ پر ترس کھا رہے ہو۔

کچھ ہو رہا ہے۔ رات ہے، سناٹا ہے، جیسا ہر رات ہوتا ہے۔ پھر بھی کچھ ایسا لگتا ہے کہ آج کی رات باقی تمام راتوں سے الگ ہے۔ آؤ چلیں، نیچے چلیں، رات ڈھل چکی ہے۔ اب کون ہوگا۔ موت کے کمرے میں جھانک کر دیکھ چکا ہوں۔ جنازہ جا چکا ہے اور وہاں کچھ نہیں ہے۔ کوئی نہیں، لاش بھی نہیں۔ ماں کے کمرے میں بیڈلیمپ بجھ چکا ہے۔ جانی واکر اپنا کام کر رہی ہے۔ اب کوئی نہیں جاگے گا۔ صبح تک کسی کی آنکھ نہیں کھلے گی۔ زینہ کتنا لمبا ہو گیا ہے اترتا ہی چلا جا رہا ہے۔ میری ٹانگوں کو گرم ہوائیں چاٹ رہی ہیں اور کوئی ٹھنڈے ناخنوں سے میرے سینے کے بالوں کو کھرچ رہا ہے۔ سوکھی ہوئی گھاس کی طرح۔ مارو گولی۔ چلتے ہیں اور نیچے چلتے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں تو بڑی ہلچل ہے۔ دیکھیں، کونے میں فریج پر بیٹھی بلیاں جمائیاں لے رہی ہیں۔ سائے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے ہیں۔ میز پر کھانا لگا ہوا ہے۔ سب آخری گھونٹ پیتے ہیں اور میز کی طرف آتے ہیں، مدھم روشنی میں بلیاں جمائیاں لیتی رہتی ہیں اور کتے میز کے نیچے دُم ہلا رہے ہیں۔ کوئی انہیں نہیں دیکھتا۔ سب اپنی دُم ہلا رہے ہیں اور کھا رہے ہیں خوبصورت

عورت، جس نے دھندلکے میں جھریوں کو مٹا کر اپنی دلربائی بڑھالی ہے۔موم بتی کی طرح جل رہی ہے۔ ڈراکولا چپ چاپ کونے میں کھڑا ہے۔ آج اس نے پوری شام نہ مٹانے کی بات کی ہے نہ حاکم اعلےٰ کی مہربانیوں کی اور نہ شادی کی دعوت کی۔ وہ چپ چاپ بیٹھا ان لوگوں کو دیکھتا رہا ہے جنہوں نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اور اب خوبصورت عورت ہر بار پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لیتی ہے اور کہتی ہے "تم کو کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم ویسے ہی بہت موٹے ہو" وہ مسکراتا ہے اور پھر کونے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دائیں پاؤں کا جوتا اُسے کاٹ رہا ہے، کیونکہ یہ اس کے بیٹے کا جوتا ہے جو اس نے اس دعوت کے لیے چپکے سے پہن لیا ہے۔ لیکن ڈرائنگ روم میں چلنا ہی کتنا پڑتا ہے اور جب منہ چلتا ہے تو جوتے نہیں کاٹتے۔ سب کھانا کھا کر اور خوبصورت عورت کا ہاتھ دبا کر اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے جا چکے ہیں۔ اب سناٹا ہے اور چاندنی کھڑکیوں سے آرہی ہے اور قالین پر پھیل رہی ہے۔ اس نے اب تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ وہ سب کی پلیٹیں جمع کرتا ہے اور سب کی پلیٹوں سے ہڈیاں اٹھاتا ہے اور میز کے نیچے پھینک دیتا ہے۔ کتوں کے جبڑوں میں ہڈیاں ٹوٹ رہی ہیں اور خوبصورت عورت میوزک سن رہی ہے خمار سے آنکھیں بند ہوتی جارہی ہیں۔ تم ہڈیاں چبا رہے ہو؟ نہیں تو۔ تو پھر یہ آواز کیسی آرہی ہے؟ کتے ہڈیاں چبا رہے ہیں۔ خوش ہیں۔ اتنی بڑی دعوت اور اتنی ساری ہڈیاں۔ مَیں میوزک سن رہی ہوں اور تم کتوں کو ہڈیاں دے رہے ہو۔ ڈراکولا تم بہت احمق ہو۔ وہ تو ہوں۔ لیکن میں کیا کروں۔ مَیں چھوٹی ہڈیاں تو نہیں چاٹ سکتا۔ جو ہڈیاں میں نہیں چاٹ سکتا وہ کتے کیوں نہ چاٹیں۔ جب کتے چھوٹی ہڈیاں چاٹتے ہیں تو مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ بکواس! مجھے میوزک سننے دو۔ تم جاؤ اور اپنے کتے بھی لے جاؤ۔ یہ کتے تو تمہارے ہیں۔ میں تو صرف ان کی دیکھ بھال کرتا

ہوں۔ ماں کی سرخ ڈوروں والی آنکھیں خمار کے جالے میں جھکتی ہیں ۔ وہ اٹھتی ہیں اور اوپر چلی جاتی ہیں ۔ میں احتیاطاً موت کے کمرے میں جھانک کر دیکھتا ہوں وہاں کوئی نہیں ہے ۔ وہاں نہ اندھیرا ہے نہ اجالا — ڈراکولا سر جھکا کر اور تحیر بمہ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے ۔

ٹیپو اور ماں، صدیوں بعد، رات کے کھانے پر میز کے دو سروں پر بیٹھے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے ۔

ماں نے سوپ کا پیالہ، جس سے پھیکی دار بھاپ اٹھ رہی تھی، بیٹے کی طرف بڑھایا۔ بیٹے نے پیالہ اس کے ہاتھ سے نہیں لیا۔ ماں کی تیوریاں چڑھ گئیں لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔

ماں نے سوپ کا چمچہ منہ میں لیا اور کہا

"کتنے عرصے بعد ہم انسانوں کی طرح ایک ہی میز پر کھانا کھا رہے ہیں۔"

ٹیپو نے ٹھوڑی کھجائی اور کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم کم عمر ہو، مگر گہرے ہو۔ تم جینئس ہو میری طرح ۔ باقی سب گھاس نگل گئے ۔"

ٹیپو نے ٹھوڑی کھجائی اور کوئی جواب نہیں دیا ۔ سوپ کے پیالے کو اور دُور کھسکا دیا ۔

"کیوں تم سوپ کیوں نہیں پیتے ؟"

"بُو آتی ہے ۔"

"بُو — کاہے کی بُو ؟"

"تازہ خون کی ۔"

"پگلے ۔ مرغی کا سوپ ہے ۔"

"مرغی کا خون تازہ نہیں ہوتا کیا؟"
ماں اور بیٹے کی آنکھیں اوپر اٹھیں
"ماں جب ڈراکولا مر رہا تھا تو تم کہاں تھیں؟"
ماں کی آنکھیں بجھ جاتی ہیں اور ہونٹ بھنچ جاتے ہیں اور چہرہ ہلکا سے جاتا ہے۔

PIG! YOU'RE A BLOODY PIG"

ماں تم کتنی نرم دل ہو۔ تمہارے ہونٹوں سے شہد ٹپکتا ہے۔ یہ ساری روشنی سورج کی نہیں تمہاری ہے۔"

FOR ME, YOU'RE TELLING THE TRUTH

"ماں! ڈراکولا بالکل گدھا تھا۔"
"تھا"
"اچھا ہوا ہم نے اسے دفن کر دیا۔"
ماں کھانے کی میز سے اٹھ جاتی ہے اور ڈرائنگ اور ڈائننگ روم کے درمیان ٹہلنے لگتی ہے۔ کبھی قالین پر، کبھی ننگے فرش پر۔
وہ یونہی اپنے طوفان کو دبانے کی کوشش کرتی رہے گی۔ پنڈولم بائیں سے دائیں اور دائیں سے بائیں ڈول رہا ہے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے اور اب کمرے میں زیادہ بند نہیں رہ سکتا۔ میں نے سب کر کے دیکھ لیا بات نہیں بنتی کسی چیز سے۔ میں جتنا ہاتھ پاؤں مارتا ہوں دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہوں۔ وہ یکایک رک جاتی ہے۔ جیسے اس نے بیٹے کے دل کی گونج سن لی تھی۔
تم چرس، بھنگ، ایل ایس ڈی، سب مزے چکھ چکے۔ ہاں ٹھیک ہے چکھ چکا اور اب تم تھک چکے لیکن موم تمہیں یاد ہے جب میں نیپال جا رہا تھا تو تم نے کیا کہا تھا۔ میرے لیے بھی لانا کوئی چیز۔ تب

ہم دونوں ساتھ جائیں گے ٹرپ پر۔ اور ہم گئے تھے ایک ساتھ ٹرپ پر، اور ڈراکولا رات بھر ہماری نجات کے لیے دعا مانگتا رہا تھا اور روتا رہا تھا۔ جب میں گیا تھا تو تم نے کیا کہا تھا اور سچ کہتا ہوں میں تمہارا مشورہ نہیں بھولا۔ وہ وہاں کا ٹھنڈا ساحل اور بیئر کی بوتلیں۔ میں جا رہا تھا تو تم نے کیا کہا تھا۔ GO, MY BOY ENJOY YOUR SELF اور میں نے کہا تھا GOD BLESS YOU, MOM! ۔ کیا میں نے تمہیں مایوس کیا تھا؟ نہیں بیٹے تم نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ مگر اب کر رہے ہو۔ وہ کیسے؟ تم اُس دُنبے کو ڈراکولا کیوں کہتے ہو؟ وہ ٹھس بکرا۔ موم، تم میں بڑا سنس آف ہیومر ہے۔ تم نے اس کو پہچاننے میں بہت دیر کر دی۔ موم، لیکن تم نے نہ جانے کتنی بار رو رو کر اپنے جسم اور روح پر جو زخموں کے نشان دکھائے ہیں، وہ سب لمبے لمبے خون آلود دانتوں کے لگائے ہوئے تھے، ایسے دانت صرف ڈراکولا کے ہوتے ہیں۔

وہ پھر کبھی قالین پر اور کبھی ننگے فرش پر ٹہل رہی تھی اور ہاتھ مل رہی تھی۔ ٹیپو اٹھا اُس نے ماں کے سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکالی، سلگائی اور ماں کے ہونٹوں میں تھما دی۔ ماں کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ پھر ٹہلنے لگی جب رکی تو اس نے دیکھا کہ وہاں ٹیپو نہیں ہے۔ وہ آہستہ آہستہ، تھکے تھکے قدموں سے اوپر چڑھی۔ کمرے میں پہنچکر اس نے بڈلیمپ جلایا۔ پرانے خط پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھیں بوجھل ہو گئیں۔ ان باتوں میں کچھ نہیں ہے۔ بہلاوے کی باتیں۔ اس نے بڈلیمپ بجھا دیا اور اندھیرے میں آنکھیں کھولے پڑی رہی۔ پیر سے پیر کو ملتی رہی۔ اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ رہی تھی اور گلا خشک ہوا جا رہا تھا۔ کوئی پرندہ آن کر چھت پر گرا۔ تھوڑی دیر تو پھڑپھڑایا، پھر خاموش ہو گیا۔ بلی نے دبوچا ہو گا۔ کبوتر بے چارا، اسکی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور سینہ پُھنک رہا تھا۔ کبوتر۔ بے چارا عیسائی بلی بڑھیا چڑیل

وہ اٹھی اور کھڑکی پر گئی۔ دُور دُور تک اندھیرے میں خاموشی کے جال چمک رہے تھے۔ ریلوے اسٹیشن کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ گورستان کے درختوں میں بھی سناٹا تھا۔ کہیں دور اُلّو چیخ رہا تھا۔ گھر کا پہلو وال دروازہ کھلا اور کوئی نکلا۔ سائے نے احتیاط سے دروازہ بند کیا۔ کھڑا کھڑا کچھ سوچتا رہا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھاٹک سے نکلا اور گورستان کی طرف مڑ گیا۔

یہ ڈراکولا کے لیے جان دے رہا ہے۔

آہستہ آہستہ سایہ گورستان کے سایوں میں کھو گیا۔ وہ اس طرح کھڑی اس کے واپس آنے کا انتظار کرتی رہی۔ سایہ واپس نہیں آیا۔ کمرے میں روشنی بھر گئی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھایا رہا۔ دُور ٹیلے پر سایہ ابھرا اور اس راستے پر غائب ہو گیا جو اسٹیشن کی طرف جاتا تھا۔

اُس نے زور سے کھڑکی بند کر دی۔ اسے اپنے بیڈ لیمپ کے پاس وان گوخ کے ایک کارڈ پر جس پر پُل کی تصویر چھپی ہوئی تھی، کچھ لکھا ہوا نظر آیا۔

ٹیپو کی آواز گونج رہی تھی۔

"موم ـــ گورستان سے گورستان تک کا فاصلہ بہت کم ہے۔ ایک قدم، مَیں نے جو راستہ چنا ہے، بہت لمبا ہے، بہت دور جانا ہے"

ماں دیر تک کارڈ کو دیکھتی رہی۔ سامنے کا کمرہ کھلا تھا۔ اس میں دھوپ بھری ہوئی تھی اور دیواروں پر بنائے ہوئے ڈرائنگ لکیروں کے جال میں سانس لے رہے تھے۔

"جاؤ، جاؤ، لوٹ کر تم یہیں آؤ گے"

ٹیپو نے بھاگتی ہوئی گاڑی کی کھڑکی پر سر رکھ دیا۔ ہوا اس کے بالوں کو نوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ اس کا سر کٹ کر ہوا میں اڑا چلا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور صدیوں بعد اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ ابھری اس کا بوجھ اسے محسوس نہیں ہوا۔

انتظار حسین

سفرِ منزلِ شب

"اچھا؟ ... تو؟ ... تو وہ تُو تھا؟"

ہاشم، حیدر، عبید، حمید چاروں کی نظریں حبیب پر جم گئیں۔ ان پر یہ انکشاف بجلی بن کر گرا تھا۔ وہ تو سکتہ میں آ گئے۔ کتنی دیر تک پتھر بنے بیٹھے رہے۔

"مگر ..." حیدر نے زبان کھولی۔ کچھ کہنے لگا تھا۔ کیا کہنے لگا تھا۔ کہتے کہتے جیسے الجھ گیا ہو، چُپ ہو گیا۔

پھر حمید نے جھرجھری لی "مجھے یقین نہیں آ رہا" ـــــ اور اس نے حبیب کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ بولے۔ شاید یہ کھلے کہ وہ کوئی اور تھا۔ وہ نہیں تھا مگر حبیب نے تو جیسے ہونٹ سی لیے تھے۔

حمید نے پھر اس کی طرف غور سے دیکھا۔ لہجہ میں تھوڑا سا تحمل پیدا کرتے ہوئے بولا "تُو اس سے انکار نہیں کرے گا؟"

پھر سب کی متجسس نظریں اس پر جم گئیں۔ شاید اب وہ کچھ بولے گا۔ اپنی صفائی میں کچھ کہے گا، مگر ہونٹ سل گئے تھے، سلے رہے۔

"تو ہم یہ سمجھیں کہ" آخر عبید نے قطعی لہجہ میں زبان کھولی۔ "وہ تُو ہی تھا۔"

ذرا جو اس نے جنبش کی ہو۔

رفتہ رفتہ حیرت اور بے یقینی کے لمحے گزر گئے۔ رفتہ رفتہ انہیں یقین آ گیا کہ وہ شخص وہی ہے اور ان کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔

چاروں نے اُسے خونخوار نظروں سے دیکھا جیسے وہ ان میں سے نہیں ہے۔

وہ جو انہیں میں سے تھا۔ اچانک ان میں سے نہیں رہا تھا۔ کتنی سرعت سے وہ ان کے لئے بیگانہ ہوا۔ کتنی عجلت کے ساتھ وہ ان سے جدا ہو ئے۔

پہلے ہی وہ گھٹ چھنٹ کر پانچ رہ گئے تھے۔ اب چار رہ گئے۔ جبیب ان سے کٹ چکا تھا۔ جبیب سے وہ کٹ چکے تھے۔ اب وہ ان کے لئے ایک اجنبی تھا۔ پہلے بھی تو یہی ہوتا رہا تھا۔ ساتھی ان سے کٹتے گئے اور اجنبی بنتے گئے۔ بس اچانک کوئی ایک کٹتا اور اجنبی بن جاتا۔ مگر جب پانچ رہ گئے تو یوں نظر آرہا تھا کہ یہ یک جان پانچ قالب ہیں۔ کتنے کتنے مشکل مرحلوں میں وہ قدم سے قدم ملا کر چلے تھے۔ کتنی دیر کتنی دور ساتھ چل کر ایک پھر ٹوٹ گیا اور وہ جب سے پختہ دکھائی دیتا تھا۔

"عجیب بات ہے" حمید بولا۔ "ہم یہ سمجھتے رہے کہ سب کچھ باہر سے ہو رہا ہے۔ یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ ہمیں میں سے ایک۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں ہمیں سے ایک" عبید نے افسوس بھرے لہجے میں کہا "اور وہ جس پر ہمیں سب سے زیادہ اعتبار تھا"

"مگر ۔ ۔ ۔ ۔" حیدر پھر کہنے لگا تھا۔ کتنی دیر بعد اس نے زبان کھولی تھی۔ مگر کہتے کہتے پھر رک گیا۔ شاید پھر الجھ گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس واقعہ کا سب سے زیادہ اثر اس نے قبول کیا ہے۔

"ہاں واقعی" حمید بولا "سب سے زیادہ تو ہم نے اسی پر اعتبار کیا تھا"

"یہ تم لوگوں کی خوش فہمی تھی" اب ہاشم نے زبان کھولی "مجھے تو اس پر پہلے ہی شک تھا"

عبید نے اسے غور سے دیکھا "یہ تو تم اب کہہ رہے ہو"

"میں نے کئی موقعوں پر اشارہ کیا تھا۔ مگر کسی نے میری بات پر دھیان ہی نہیں دیا"

"ہم تو اس کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ہم میں سب سے زیادہ جوشیلا تو یہی تھا، کتنا بے جگرا تھا، سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار رہتا

تھا۔" حمید نے یہ بات اس طرح کہی کہ ان کے تصور میں اگلے پچھلے مختلف واقعات گھوم گئے کہ کب کب اس نے جان جوکھوں میں ڈالی تھی۔ کب کب ایسے کام اپنے ذمے لئے تھے جن میں ذراسی چوک اسے موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی۔

مگر ہاشم اس بیان سے ذرا متاثر نہ ہوا۔ بولا "ایسے لوگ ایسے ہی جانبانہ نظر آیا کرتے ہیں۔" رُک کر بولا "وہ جو اتنا جانبانہ بنتا تھا اسی سے تو مجھے اور شک ہوا تھا۔"

عبید کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا "انہوں نے ہم پر کتنا اعتبار کیا تھا، کتنا بھروسہ تھا انہیں ہم پر۔ اب جب یہ خبر ان تک پہنچے گی تو کیا سوچیں گے .... سمجھیں گے کہ ہم بھی ایسے ہی ہوں گے۔"

"میں تو کہتا ہوں کہ یہ اچھا ہی ہوا۔" ہاشم نے اعتماد بھرے لہجہ میں کہا۔

"وہ کیسے؟"

"ایسے کہ ہم میں سے جو ایک مشتبہ شخص تھا وہ دفع ہو گیا ہے۔ اب ہم ایک دوسرے پر پورا اعتبار کر سکتے ہیں۔"

"اچھا؟ اس کے بعد بھی؟" حیدر کے منہ سے بس بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا۔ وہ کب سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر زبان کھولتے کھولتے رُک جاتا کہ بات آتے آتے اس کے لبوں پر الجھ جاتی۔ اب بلا ارادہ اس کے منہ سے ایک جملہ نکل گیا۔ ایسا کہ سب چونک پڑے۔

ہاشم نے غصے سے اسے دیکھا۔ "تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"

میں کہتا ہوں" اب اس کی زبان کھلنے لگی تھی۔" اس میں اور ہم میں کیا فرق تھا۔ آخر ہم اکٹھے ایک ہی طرح سوچ رہے تھے۔ ایک ہی نہج پر کام کر رہے تھے۔ اگر اس نے کوئی گڑبڑ کی ہے تو ہم اپنے آپ کو اس سے بری الذمہ کیسے قرار دے سکتے ہیں۔

عبید اور حمید اس دلیل سے قائل ہوتے نظر آ رہے تھے۔ مگر ہاشم نے تاؤ کھایا۔ "تو ہم پر شک کر رہا ہے؟"

"کم از کم میں اپنے آپ کو شک سے بالاتر قرار نہیں دے سکتا"
"بالکل ٹھیک ہے" ہاشم غصے سے بولا۔ "تُو تو اس کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ جو کچھ اس نے کیا تو اس سے بے خبر تو نہیں ہو سکتا"
عبید اور حمید نے چونک کر غور سے حیدر کو دیکھا۔
"چپ کیوں ہو گیا؟" ہاشم نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔
حیدر نے عبید، حمید، ہاشم تینوں کو دیکھا جو اسے شک بھری نظروں سے تک رہے تھے۔ پھر دھیرے سے بولا۔ "ہو سکتا ہے۔ . . . . . شاید میں بھی"
"تو؟ . . . . تو بھی؟ . . . . ." عبید اور حمید دونوں کے منہ سے ایک ہی وقت میں ایک ہی جملہ بے ساختہ نکلا۔
"ہاں شاید میں بھی . . . . اگر اس نے گڑبڑ کی ہے تو میں کیسے یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں اس میں ملوث نہیں تھا" یہ کہتے کہتے اٹھ کھڑا ہوا۔ تینوں نے اسے غور سے دیکھا۔ جب وہ چلنے لگا تو عبید اور حمید پریشان نظر آئے۔
"تو جا رہا ہے؟"
"ہاں میرا خیال ہے کہ میرا چلا جانا ہی بہتر ہو گا کہ اس کے نکل جانے کے بعد میری حیثیت بھی مشتبہ ہو گئی ہے"
وہ چلا گیا۔
ایک دفعہ پھر وہ گم صم ہو گئے۔ مگر ہاشم نے جلدی ہی خاموشی کی مہر توڑ دی۔
"تم تو اپنی وضعداری میں چپ رہتے۔ میں نے اسے EXPOSE کر دیا"
عبید اور حمید دونوں تذبذب میں تھے۔ عبید چپ رہا۔ حمید سے رہا نہ گیا۔
"یقین نہیں آتا کہ وہ بھی . . . ."
"اب بھی یقین نہیں آیا" ہاشم تڑخ کر بولا "اس نے تو خود اعتراف کر لیا۔ اصل میں میں بہت دیر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بہت اکھڑا اکھڑا تھا اور تم نے یہ غور نہیں کیا کہ اس سارے عرصے میں وہ بولا ہی نہیں تھا۔ ہر بات پیتا چلا جا

رہا تھا۔ میں نے اسے تاڑ لیا تھا کیسا CORNER کیا۔ آخر کو پھٹ پڑا۔"
"اور ہم سے ٹوٹ گیا۔" عبید نے افسوس بھرے لہجہ میں آہستہ سے کہا۔
" اچھا ہی ہوا۔ ٹکا رہتا تو ہمارے حق میں یہ اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے اس طرح گھیرا کہ اسے اعتراف کرنا پڑ گیا۔ اس کے بعد وہ ٹک کیسے سکتا تھا۔ اچھا ہوا۔ اب ہم محفوظ ہیں۔"

ہاشم رواں تھا۔ عبید اور حمید اس کا منہ تک رہے تھے جیسے اس کی مت ماری گئی ہو۔ ایک کے بعد دوسرا اتنی جلدی۔ وہ کچھ بوکھلا سے گئے تھے۔ ہاشم فاتحانہ شان سے بولے چلا جا رہا تھا ثابت کر رہا تھا کہ وہ دونوں ملے ہوئے تھے۔ "حیدر مصلحت کے تحت ٹکا رہنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اسے EXPOSE کر دیا۔ اُسے اعتراف کرنا پڑ گیا۔ پھر وہ کیسے ٹک سکتا تھا۔ چلا گیا۔ اچھا ہوا۔ اس کا ساتھ رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا چلا جانا بہت ہی اچھا ہوا۔"

عبید اور حمید سُنے جا رہے تھے۔ قائل ہوتے لگتے کہ بے یقینی کی ایک لہر آتی اور وہ اکھڑ جاتے۔ ہاشم پھر اسی جوش و خروش سے اپنے استدلال کی تعمیر کھڑی کرتا۔ پھر وہ قائل ہونے لگتے۔ مگر قائل ہوتے ہوتے پھر اکھڑ جاتے۔ وہ بس یقین اور بے یقینی کے بیچ ڈول رہے تھے۔ اسی میں رات ہو گئی۔

" اب سونا چاہیئے"

" ہاں مٹی ڈالو اس پر۔ سوتے ہیں۔"

اس رات وہ جلدی لیٹے کہ اس واقعہ پر سوچ سوچ کر تھک گئے تھے۔ جلدی لیٹے مگر دیر میں سوئے کہ جانے کتنی رات تک ان کے ذہن اسی اُدھیڑ بُن میں رہے۔

دیر سے سوئے، جلدی جاگے۔ جاگنے کے ساتھ ایک نئی حیرانی۔ جب وہ سوئے تھے تو تین تھے اور جب صبح جاگے تو دو رہ گئے تھے۔

" وہ کہاں گیا؟" حمید نے خالی چارپائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
" کون؟"

"ہاشم؟"

"ہاشم؟" عبید کہ آدھا جاگ رہا تھا، آدھا سو رہا تھا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس چارپائی کو دیکھا جس پہ ہاشم سویا تھا، تھوڑا چکرایا مگر وہ اتنی جلدی مایوس نہیں ہونا چاہتا تھا۔ سادگی سے بولا۔

"یہیں کہیں ہوگا۔"

حمید نے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا۔ واپس آیا۔ بولا "یہاں کہیں نہیں ہے۔"

عبید نے تامل کیا۔ پھر کہا "شاید سیر کو نکل گیا ہو۔"

"ہو سکتا ہے، مگر جب کبھی وہ صبح کی سیر کے لئے اٹھتا تھا تو ہمیں بھی ضرور جھنجھوڑتا تھا۔"

"ممکن ہے یہ سوچ کر کہ پریشانی میں دیر سے سوتے ہیں جگانا مناسب نہ جانا ہو۔ کوئی بات نہیں آجائے گا۔"

اس استدلال سے بظاہر وہ دونوں ہی مطمئن ہو گئے تھے۔ مگر اندر سے دونوں ہی بے چین تھے۔ کتنی بے کلی کے ساتھ انہوں نے اس کا انتظار کیا۔ وقت گزرتا گیا۔ بے کلی بڑھتی گئی اور وقت کتنی تیزی سے گزر رہا تھا۔ صبح کا دھندلکا کبھی کا چھنٹ چکا تھا۔ دن چڑھ رہا تھا اور گرم ہوتا جا رہا تھا۔ عبید اور حمید پر وقت جتنا گزرتا جاتا تھا بھاری ہوتا جاتا تھا۔ آخر کو حمید سے نہ رہا گیا۔ "اب تو بہت دیر ہو گئی۔"

"ہاں آنا ہوتا تو اب تک آجاتا۔"

حمید، عبید کا منہ تکنے لگا۔ خیال اس کا بھی یہی تھا۔ مگر عبید سے وہ اتنے قطعی لہجے میں جواب کی توقع نہیں رکھتا تھا۔

"تو کیا ۔ ۔ ۔"

"ہاں! شاید اب وہ نہیں آئے گا۔"

"تو گویا وہ بھی ۔ ۔ ۔"

"ہاں وہ بھی۔"

پھر دونوں ہی چپ ہو گئے۔ چپ بیٹھے رہے۔ تذبذب اب تمام ہو چکا تھا۔ اور عبید کو تو بالکل صبر آ گیا تھا۔ "خیر اس کے ٹوٹ جانے پر مجھے کوئی تعجب نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"وہ بول بہت رہا تھا۔" رُکا پھر بولا۔ "ایسے وقت میں جو شخص بہت بولتا نظر آئے، اسے شک کی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔"

"اور جو چپ چاپ نظر آئے۔"

عبید نے تامل کیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "اُسے بھی۔"

"عجیب بات ہے۔" حمید بڑبڑایا۔

ہاں عجیب بات ہے۔ مگر شاید اتنی عجیب بات بھی نہیں ہے ایسے میں تو ہر بات ہی سے شک پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ کہتے کہتے کیسی کیسی گھڑی عبید کے دھیان میں آئی کہ جب ایک دم سے وہ سب ایک دوسرے کے لئے مشکوک ہو گئے تھے۔ کوئی چپ ہو جانے پر مشکوک ٹھہرا، کوئی بول پڑنے پر۔ کسی پر شک کہ خبر سُن کر اتنا بوکھلا کیوں گیا۔ کسی پر شک کہ خبر سن کر اسے سانپ کیوں سونگھ گیا۔ کسی کے باخبر ہونے سے شک پیدا ہوا کہ اسے کیسے پتہ چل جاتا ہے۔ کسی کی بے خبری نے شک میں ڈالا کہ کہیں وہ جان کر تو بے خبر نہیں بن رہا، شکوک و شبہات کی دھند کتنی پھیلتی کہ دوست، دوست کو نہ پہچان پاتا۔ دماغ کے کسی گوشے میں چپکے سے ایک سوال سر اُٹھاتا۔ بات زبان پر آتی اور سرگوشی بن کر کانوں کان پھیلتی چلی جاتی۔

بیٹھے بیٹھے ایک لہر آئی اور عبید اُٹھ کھڑا ہوا۔ حمید نے سوال بھری نظروں سے اسے دیکھا "کیوں؟ . . . کہاں؟"

"یہاں سے نکل چلنا چاہیئے ورنہ ممکن ہے کہ ہم کسی مشکل میں پھنس جائیں۔"

حمید چونک پڑا۔ اس پہلو پر تو اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ بس فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔

دن بھر چلتے رہے یہ سوچے بغیر کہ کہاں جانا ہے۔ کوئی منزل نظر میں نہیں تھی۔

پھر بھی ایک عجلت میں چلے جارہے تھے۔ جیسے واقعی کہیں پہنچنا ہے۔ چلے جارہے تھے یہ دھیان دیئے بغیر کہ کتنا چل لیئے ہیں۔ کتنا اور چلنا ہے۔ کتنے سنسان، کتنے آباد رستے قدموں نے ناپے، قدموں میں بجلی بھری تھی کہ اسی ایک سی تیزی سے اٹھ رہے تھے اور رستے گرد ہوتے چلے جارہے تھے۔

"بس اب یہاں ٹھہر جائیں" اچانک عبید نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"لیکن ۔ ۔ ۔"

عبید نے حمید کی بات کاٹی "رات تو یہیں گزارتے ہیں۔ صبح کیا کرنا ہے۔ کدھر جانا ہے۔ یہ سوچیں گے"

تو وہ وہاں پسر گئے اور اب انہیں احساس ہوا کہ وہ کتنا تھک گئے ہیں۔ ٹانگیں کتنی اکڑ گئی ہیں جیسے یہاں سے اب وہ ایک قدم آگے نہیں اٹھا سکتے۔ حمید نے کمر پیچھے لگائی، ٹانگوں کو سیدھا کیا، پھیلایا، بولا "آج بہت چلے ہیں تھک کر چور ہو گئے"

"اس سے پہلے تو ہم بہت آرام کرتے تھے" عبید نے زہر خند کے ساتھ کہا۔

اس فقرے نے عجب اثر کیا۔ دونوں ہی ملول ہو گئے۔ بیتے دنوں کی کلفتیں اور صعوبتیں نظروں میں پھر گئیں۔ کتنے دنوں سے وہ یہ رنج کھینچ رہے تھے۔

"مگر اس سے پہلے ہم اکٹھے چلا کرتے تھے" حمید نے عجب طرح سے کہا کہ بچھڑنے والے دونوں ہی کو ایک دم سے یاد آ گئے۔ وہ بھی جو پہلے بچھڑے تھے، وہ بھی جو اب آ کر بچھڑے، کب کب کا ملنا اور بچھڑنا یاد آیا۔ کون کون کس کس موڑ پر بچھڑا، اور کس کس طور بچھڑا۔ کوئی تو چلتے چلتے بس پچک گیا اور رہ گیا۔ کسی نے کسی موڑ پر پہنچ کر اپنا اصلی چہرہ دکھایا اور خندق کے اس پار نظر آیا۔ کوئی بیچ منجدھار میں چھوڑ کر گیا، کوئی پانی میں اترنے سے پہلے ہی دوسری طرف بہہ گیا۔ یار حیران کہ کہاں گیا، کدھر نکل گیا، وسوسے، تجسس، چہ میگوئیاں، سرگوشیاں، پھر خبر ملتا کہ وہ عزیز خندق کے اس پار پہنچ گیا۔ اچھا؟ واقعی؛ اوّل

حیران ہونا۔ پھر ایک دوسرے کو قاتل کہنا کہ وہ تو تھا ہی اس قماش کا۔ بس اسی طرح کتنے ہمسفر بچھڑ چکے تھے۔ آگے کتنے قریب تھے، اب کتنے دور ہو چکے تھے۔

حمید نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "اب تو ہم دونوں ہی رہ گئے ہیں"۔

"ہاں یار"، عبید افسردگی سے بولا۔ پھر کہنے لگا۔ "ایسے حالات میں دو کا بچا رہ جانا بھی بہت غنیمت نظر آتا ہے"۔

"مگر کب تک"۔

عبید، حمید کو تکنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا "ٹھیک کہتے ہو۔ آخر کب تک"۔

پھر آپس میں وہ کوئی بات نہ کر سکے۔ بس جیسے ذہن میں ایک پھانس پڑ گئی ہو۔ کب تک، آخر کب تک۔ دیر تک دونوں نہ سو سکے، نہ بات کر سکے۔ پھانس بڑی طرح پھنسی ہوئی تھی۔ ہاں آخر کب تک؟ دیر تک جاگا کیے اور کروٹیں بدلا کیے۔ مگر نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے۔ مگر وہ نیند کہاں تھی، عبید کو تو بس ایک جھپکی سی آئی تھی۔ پھر آنکھ کھل گئی۔ یوں ہی اس نے حمید پر نظر ڈالی جو اس کی طرف کروٹ لیے پڑا تھا اور یوں ہی اسے خیال آیا کہ اسے نیند تو آ نہیں رہی مگر حمید کس اطمینان سے سو رہا ہے۔ اتنے میں حمید نے کروٹ بدلی۔ اس نے پھر حمید پر نظر ڈالی شاید وہ جاگ رہا ہے یا شاید سو رہا ہو اور سوتے سوتے کروٹ بدلی ہو۔ اس نے ایک مرتبہ پھر حمید پر نظر ڈالی۔ غور سے اسے دیکھا یہ جاننے کے لئے وہ واقعی سو گیا ہے یا جاگ رہا ہے۔ اگر وہ جاگ رہا ہے تو یہ کیوں ظاہر کر رہا ہے کہ وہ سو رہا ہے کیوں؟ اور ایک شک کے ساتھ اس نے پھر حمید کا جائزہ لیا۔ شاید سو ہی رہا ہو۔ میرا یہ محض وہم ہے کہ وہ جاگ رہا ہے لیکن اگر وہ جاگ رہا ہے اور ظاہر کر رہا ہے کہ وہ سو رہا ہے تو۔ یہ تو شک میں ڈالنے والی بات ہے اور اس کے اندر شک تقویت پکڑتا چلا گیا۔ دماغ میں ایک اندیشہ جاگا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ جب صبح میں اُٹھوں تو اپنے آپ کو اکیلا پاؤں۔ اس خیال نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ اکیلا رہ جانے کا خیال بھی کتنا خوف بھرا ہوتا ہے۔ اچانک اسے کتنا ڈر لگنے لگا تھا۔ اگر میں

اکیلا رہ گیا تو . . . . نہیں اس نے فوراً ہی اپنے اس خیال کی تردید کی حمید، ہاشم نہیں بن سکتا۔ ہاشم کے تو شروع ہی سے تیور اور قسم کے تھے۔ آدمی ہی وہ اور طرح کا تھا۔ حمید ویسا آدمی نہیں ہے اس نے اپنے آپ پر نفرین کی کہ لے دے کے ایک رفیق رہ گیا ہے اس پر بھی وہ شک کرتا ہے۔ میں بہت کمینہ آدمی ہوں۔ مگر پھر اس نے اپنی کمینگی کے لئے ایک عذر بھی تراش لیا۔ رفیقوں کی دغا نے مجھے شکی مزاج بنا دیا ہے۔

عبید پر پھر غنودگی طاری ہونے لگی تھی کہ حمید نے پھر کروٹ بدلی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ حمید کی طرف دیکھا جس نے کروٹ بدل کر پھر اس کی طرف پیٹھ کر لی تھی۔ گمان تو اسے پہلے ہی ہوا تھا۔ اب یقین آچلا تھا کہ حمید سویا نہیں ہے، ظاہر کر رہا ہے کہ سو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے حمید کا فقرہ یاد آیا "مگر کب تک"؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حمید بھی اب ڈانواڈول ہے۔ اچھا حمید بھی۔ اس خیال کے ساتھ وہ کتنا افسردہ ہو گیا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اپنی اس بدگمانی پر قابو پالے۔ حمید اور طرح کا آدمی ہے۔ ہاشم نہیں ہے۔ سچا اور کھرا آدمی ہے۔ یہ تو گویا اپنے وسوسوں کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اپنے وسوسوں کے ساتھ وہ بہت لڑا۔ بہت کُشتم کُشتا ہوئی۔ مگر بے خوابی سے اس کے وسوسے طاقت پکڑتے چلے گئے اور وہ کمزور پڑتا چلا گیا۔

وہ اپنے وسوسوں کے نرغے میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیئے۔ مجھے آج کی رات سونا نہیں چاہیئے۔ سویا مویا برابر۔ بے خبری میں تو نہیں مارا جانا چاہیئے۔ ہاشم نے آخر ہماری نیند ہی سے فائدہ اٹھایا تھا۔ نہیں مجھے جاگتے رہنا چاہیئے۔

رات بھر جاگتے رہنے کے ساتھ وہ دور دور کی باتیں دھیان میں لایا۔ کوئی نیا سا خیال، کوئی عجب سی تجویز، جو بھی اس کے ذہن میں آتا اُسے وہ دیر تک پکاتا۔ اس میں تفصیلات کا رنگ بھرتا چلا جاتا۔ اسی عالم میں ایک خیال اسے اور آیا۔ حمید کو کیوں موقع دیا جائے کہ میرے ساتھ وہ کرے جو ہمارے ساتھ ہاشم نے کیا تھا۔

کیوں نہ میں خود ہی۔ ۔ ۔ ۔ ہاں بالکل۔ جب سب ہی نے یہ کیا ہے تو میں بھی ۔ ۔ ۔ اور حبیب تو ہم سب میں سب سے بڑھ کر صاحب کردار سمجھا جاتا تھا۔ اگر یہ حبیب یہ کر سکتا ہے تو میں کیوں نہیں کر سکتا۔ اس خیال کی رو میں وہ بہنے لگا تھا کہ اچانک اس نے اپنے آپ کو تھاما۔ نہیں یار کسی کو قائم بھی رہنا چاہیئے۔ جیسے اچانک اس کے ایک کے دو ہو گئے۔ ایک دوسرے سے شرمندہ سا تھا۔ غور کرنے لگا کہ بس یونہی مجھے خیال سا آیا تھا اور پھر اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں کوئی ایسا خیال مجھے مغلوب نہ کر لے۔

حمید نے ایک مرتبہ پھر کروٹ لی اور پھر اُس کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ سوتا سا بن گیا۔ دیکھوں تو سہی وہ کرتا کیا ہے۔ دیر تک ایسے پڑا رہا جیسے بے سُدھ سو رہا ہے۔ مگر جب حمید نے کوئی کروٹ نہ لی تو اس کی طرف سے بے تعلق ہو کر سوچنے لگا کہ تھوڑا سو لینا چاہیئے۔ پتہ نہیں کل دن کس طرح گزرے اور رات کہاں آئے۔ کم از کم تھوڑی سی نیند تو لے ہی لینی چاہیئے، اور اس نے اپنے آپ سے پوچھا کہ آخر وہ جاگ کیوں رہا ہے۔ حمید کی نگرانی کرنے کے لئے؟ اور اپنی نگرانی؟ اسے خیال آیا کہ ابھی وہ بھی توڈانواڈول ہو گیا تھا۔ ایسے عالم میں آدمی کو دوسروں سے زیادہ اپنی نگرانی کرنی چاہیئے۔

حمید واقعی جاگ رہا تھا۔ بیچ بیچ میں اس کی آنکھ ضرور لگی۔ مگر صرف آنکھ۔ دماغ نہیں سو رہا تھا دماغ نہ سوئے تو آنکھ کتنی دیر تک لگی رہ سکتی ہے۔ آنکھ لگی اور کُھل گئی۔ بس پھر بار بار کوشش کرتا تھا کہ دماغ سے سارے خیال نکل جائیں اور وہ سو جائے۔ کتنی مرتبہ اسے گمان ہوا کہ اس نے اچھے بُرے خیالوں کو نکال باہر کیا ہے اب نیند آجائے گی۔ دیر تک ایسے پڑا رہا جیسے بس نیند آنے لگی ہے، آرہی ہے، آگئی ہے۔ مگر پھر پتہ چلتا کہ جنہیں نکال باہر کیا تھا وہ سب پھر اندر گھس آئے ہیں اور دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ پھر کروٹ لیتا۔ جیسے کروٹ لینے سے دماغ سے اچھے بُرے خیال رخصت ہو جائیں گے اور نیند کے لئے راستہ صاف ہو جائے گا۔

کروٹیں لیتے لیتے اسے احساس ہوا کہ عبید بھی سویا نہیں ہے۔ اچھا میں سمجھ رہا تھا کہ سو گیا ہے۔ جاگ رہا ہے تو ظاہر کیوں نہیں کرتا کہ وہ جاگ رہا ہے مگر خیر اس نے اپنے اس خیال کو زیادہ طول نہیں دیا۔ وہ اس وقت اپنے کسی بھی خیال کو طول دینا نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس وقت سونے کی فکر تھی۔ مگر خیال خود بخود طول پکڑتے چلے جا رہے تھے اور پھر اسے گمان گزرا کہ عبید نہ صرف جاگ رہا ہے بلکہ اس نے کئی اس کی طرف غور سے دیکھا ہے۔ پہلے گمان ہوا پھر کروٹ لیتے ہوئے اس نے عبید کی طرف اڑتی سی نظر ڈالی اور پایا کہ وہ واقعی وہ تو اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ کیا میں بھی مشکوک ہو چکا ہوں۔ اس نے اس خیال کو بہت رفع دفع کرنا چاہا۔ مگر اپنی ہر کروٹ کے ساتھ اس نے محسوس کیا کہ عبید چوکنا ہو گیا ہے۔

حمید نے ایک بار پھر کروٹ لی اور ایک بار پھر اس نے محسوس کیا کہ عبید اس کی کروٹ پر چوکنا ہو گیا ہے وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "عبید"!

عبید یہ ظاہر تو نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے مگر پھر بول ہی پڑا "ہوں" اور پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "یار نیند نہیں آ رہی ہے"۔ پھر تھم کر بولا "تم تو سو لیے ہو"۔

"نہیں"، حمید نے روکھا سا جواب دیا۔

"یار رات بہت لمبی ہو گئی"۔ عبید نے جماہی لی۔

حمید نے اس کی بات کو نظر انداز کیا اور سنجیدگی سے مخاطب ہوا "عبید"،

"ہاں، کیا بات ہے"، عبید نے غور سے حمید کو دیکھا۔

"تمہیں میرے بارے میں کوئی شک ہے"؟

عبید جیسے چوری کرتے پکڑا گیا ہو، سٹپٹایا، پھر سنبھلا، آہستہ سے بولا "ہاں" "تمہارے بارے میں بھی اور اپنے بارے میں بھی"۔

حمید اس کی صورت تکنے لگا، چپ رہا۔ پھر دبے لفظوں میں بولا، "شاید میرا بھی یہی قصہ ہے"۔

اشفاق احمد

سونی

جب ملک التجار شمس الدین کے بیٹے بختیار کی شادی ملک التجار حسن دین کی بیٹی خجستہ سے ہو گئی تو دو گھرانوں نے اس لگن کو اپنی خوش قسمتی جانا اور دولہا دولہن کو اتنا مال دیا کہ ان کے آنے والے سات سال کی ضرورتیں ایک ہی دن میں پوری ہو گئیں۔ خجستہ اور بختیار امیر ترین گھرانوں میں پیدا ہونے کی وجہ سے بہت ہی شریف بچے تھے اور انہوں نے اپنی زندگیوں میں کبھی کوئی گندی بات نہیں کی تھی۔ خجستہ نے ایم اے سائیکلوجی کیا تھا اور وہ یونیورسٹی میں اول آئی تھی۔ بختیار نے ایم بی۔ اے کیا تھا اور اس کو فرسٹ کلاس فسٹ کی ڈگری مل چکی تھی۔ دونوں نے اپنی زندگیوں میں چونکہ سوائے اپنے کام کے اور سوائے اپنے نام کے اور کسی چیز سے محبت نہیں کی تھی اس لیے وہ ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اور انہیں پہلی دفعہ پتہ چلا کہ چام سے بھی اتنی ہی محبت کی جا سکتی ہے اور اس میں بھی بڑا مزا آتا ہے — دونوں کے والدین اس بات پر نازاں تھے کہ ان کے بچے اگر ہم خیال نہیں تو ہم حال ضرور ہیں یا اور شادی اور دوستی میں ہم خیال ہونا اتنا ضروری نہیں جتنی قدر ہم حال ہونا ضروری ہے۔

خجستہ اور بختیار کے پاس اپنی کاریں تھیں لیکن دونوں کے میک، رنگ، مختلف گیئر مختلف اور دونوں کی کنور ٹیز آف اور جن الگ الگ تھیں۔ ایک فرنٹ وہیل ڈرائیو تھی، دوسری مختلف پہیوں والی تھی۔ دونوں کے پاس اپنا اپنا میوزک سسٹم تھا ایک کے پاس جاپان کا ڈولبی سسٹم والا تھا۔ دوسرے کے پاس سمو ڈش اوپن ریل

ٹیپ ریکارڈر تھا۔ ایک کو دو سپیکر لگے تھے۔ دوسرے کو چار ـــــ دونوں کے پاس بیشمار سوٹ تھے لیکن ایک کے زنانہ تھے اور دوسرے کے مردانہ۔ ایک کو شوخ رنگ پسند تھے دوسرے کو صوفیانہ۔ ایک کو مسک جیسی والا پرفیوم پسند تھا دوسرے کو ٹی روز بھکا بھک۔ لیکن استعمال دونوں ہی فرنچ پرفیوم کرتے تھے۔ دونوں کے والدین خوش تھے کہ اللہ کا شکر ہے یہ ہم حال ہیں اگر صرف ہم خیال ہوتے تو کافی مشکل پڑ جاتی تھی۔ انہیں مزید ہم حال رکھنے کے لیے دونوں کے والدین وقتاً فوقتاً ان کو اور چیزیں بھجواتے رہتے اور ان کی ضرورتوں کا ان سے بڑھ کر خیال رکھتے۔

جب وہ دونوں ولایت سے ہنی مون منا کر لوٹے تو ان کو کسٹم پہ بہت دیر رکنا پڑا کیونکہ وہ اب اور بھی ہم حال ہو کر لوٹے تھے اور ان کا ایکمپینڈڈ بیگیج بے شمار رنگوں پہ پھیل کر مختلف کاؤنٹروں پر پڑا تھا۔

آج کل امیر اور صاحب حیثیت لوگوں کے بچوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ان کو ہر حال میں لائق ہونا پڑتا ہے اور اپنے والدین سے زیادہ نہیں تو ان کے برابر کی زندگی بسر کرنا پڑتی ہے۔ پہلے زمانے میں امیروں کے بچے لاڈلے نالائق اور عیاش ہو جاتے تھے اور غریبوں کے محنتی جفاکش اور مستعد بچے ان سے آگے نکل جاتے تھے۔ اب یہ بات نہیں رہی۔ اس وقت یونیورسٹیوں، کالجوں، اداروں، درس گاہوں میں اوّل آنے والے سب امیروں کی اولاد ہوتے ہیں۔ صاحب حیثیت لوگوں کے بچے ہر وقت غریبی اور افلاس کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں۔ یہ خوف ایک چھوت کی بیماری بن کر ان کی روحوں میں سرایت کر گیا ہے اور وہ ہر طرح کی لذت اور ذائقے سے محروم ہو گئے ہیں۔ خجستہ اور مختیار کے درمیان بھی جس لذت اور ذائقے نے جنم لیا تھا وہ ہنی مون سے واپسی پر آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگا۔ اور دونوں اپنی اپنی ذات کو الگ الگ ہینگر پہ ڈال کر اسے برش کرتے ہوئے اپنی شخصیت نکھارنے لگے۔ گنوار لوگوں میں

ایسا نہیں ہوتا۔ وارسے اور گوماں کی جب شادی ہوتی ہے تو وہ ایک دوسرے کی لذت عمر بھر کے لیے گم ہو کر ترقی کرنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کو جو وقت بھی ملتا ہے وہ بجائے آگے بڑھنے کے اسے ایک دوسرے پر صرف کر دیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں گنوا لوگ سب سے پیچھے ہیں اور ان لذتوں۔ سے محروم ہیں جو آج کا مہذب انسان دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے اور جس لیے اس دنیا کی ارضی جنت بنا رکھا ہے۔

تو جی بختیارہ اور خجستہ کے درمیان محبت اور لذت تو ختم ہو گئی۔ لیکن ان کے درمیان انڈرسٹینڈنگ بہت بڑھ گئی وہ ایک دوسرے کے دوست بن گئے اور آپس میں بہت محبت بھرے انداز میں گفتگو کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ ان کی ہم حالی میں ہمخیالی بھی پیدا ہونے لگی۔ وہ نہ صرف ایک دوسرے کے مذاق کو سمجھنے لگے بلکہ اسے داد بھی دینے لگے۔ ان کی زندگی یورپین جیسی خلیق، ملنسار، مہذب اور شائستہ ہو گئی اور وہ انڈرسٹینڈنگ کی چاشنی میں اس طرح سے رچ گئے کہ اٹھتے بیٹھتے ان کے منہ سے بار بار تھینک یو، ڈیئر ہنی، سویٹ، کیوٹ نکلنے لگا۔

بختیارہ کے پاس پانچ کیمرے، دو وی سی آر۔ آٹھ ٹیپ ریکارڈر، دو ٹائپ مشینیں ایک ہوم کمپیوٹر، بیس جگ ساپزل، ایک سولہ ایم ایم دو آٹھ ایم ایم پروجیکٹر، اکیس مربع فٹ لمبے ٹریک پر چلنے والی تیئس بوگیوں والی ایک ریل گاڑی، دو انجن ایک ڈیزل ڈرائیون دوسرا کوئلہ شکلی، ان کے ساتھ دو ریلوے اسٹیشن کی عمارتیں ایک جنکشن کی دوسرے فلیگ سٹیشن کی، پانچ کلانٹے، تین سگنل۔ نو کانٹا بدلیاں، ایک گھری سرنگ، سات لیول کراسنگ تھے۔ دو بیس فٹ کے ریگولیٹر سے فیڈ ہو کر جب یہ ٹرین بڑے سٹیشن سے چلتی تو کلکتہ سے برد وان آنے والے دبردا اس کی یاد تازہ ہو جاتی۔ ٹرین کی یہ چلیت تین فٹ اونچے مہاگنی کے ٹیبل پر بندھی تھی۔ اور یہ ٹیبل نرے ہائی ٹنر فٹ کے اس "بیس منٹ" میں رکھا تھا، جہاں بختیارہ کی دوسری ساری دلبستگیاں پڑی تھیں۔ بختیارہ کا یہ ڈین (DEN) اس کی

ساری زندگی تھی۔ موجودہ بھی مابعد بھی HERE AFTER HERE بھی۔ یہیں ایک کونے میں اس کا HEM ٹرانسمیٹر نصب تھا جہاں بیٹھ کر وہ دنیا کے دوسرے ہابسٹ براڈ کاسٹروں سے بات چیت کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی سٹرے سگنل رات کے نو بجے اس کی فریکوئنسی کے ٹیکل سے نکل جاتا تو وہ صبح تین چار بجے تک اس کا پیچھا کرتا رہتا۔ یہیں ایک سٹینڈ پر اس کے ایئر موڈل رکھے تھے جن میں سے ایک گیارہ میل کی مسافت طے کر کے سانگلہ ہل کی چوٹی پر لینڈ کر گیا تھا جسے اس نے پورے نو دن سگنل دے دے کر بڑی مشکل سے ٹریس کیا تھا۔ اور خود جا کر اسے پہاڑ کی چوٹی سے اٹھا کر لایا تھا۔ اسی ڈین میں اس کا کوکنگ رینج تھا جس پر وہ آدھی رات کے بعد کافی اور چیز اینڈ مشروم کے سینڈوچ تیار کر کے کھایا کرتا تھا۔

ہر روز صبح ناشتے کی میز پر بختیار اور خجستہ کی ملاقات ہوتی اور دونوں ہنس ہنس کر ایک دوسرے کو اپنے اپنے اخبار کی خبریں سنایا کرتے۔ حالات حاضرہ کی دونوں کی نظر بڑی گہری تھی اور تھرڈ ورلڈ کے مسائل کو ڈیویلپڈ کنٹریز سے بھی بہتر سمجھتے تھے۔ خجستہ اپنی طالبعلمی کے زمانے میں سوشلسٹ تھی اور اب بھی اس کی سوچ وہی تھی۔ بختیار شروع سے فنڈامنٹلسٹ تھا۔ دونوں کے نظریات الگ الگ تھے لیکن دونوں میں بلا کی انڈرسٹینڈنگ تھی ہم حال ہونے کی وجہ سے دونوں میں نظریاتی جھگڑا کبھی نہیں ہوا تھا۔ دونوں بہت ہی خوش تھے کیونکہ دونوں اپنی اپنی راہ پر سیدھے چل رہے تھے۔ پھر اچانک یوں ہوا کہ بختیار کو بزنس ٹرپ پر فار ایسٹ جانا پڑ گیا۔ دورہ تو ایک مہینے کا تھا لیکن ایک انہونی مجبوری کے باعث لمبا ہو گیا۔

جس دن بختیار سفر پر جانے لگا اس روز اس کے اور خجستہ کے درمیان تھوڑا سا جھگڑا ہو گیا۔ خجستہ نے کہا بختیار تم اپنا ایک وی سی آر مجھے دیتے جاؤ تاکہ اگر خدانخواستہ میرا خراب ہو جائے تو میں اور میری فرینڈز فلمیں دیکھنے سے محروم نہ رہ جائیں۔ بختیار

نے کہا تم اپنے لیے ایک اور خرید لو لیکن میرا گیجٹ مجھ سے نہ مانگو میں ان سے وابستہ ہو جاتا ہوں تو ان کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتا۔ ان میں میری جان ہے۔ بختیار کا یہ جواب سن کر خجستہ سکتے میں آ گئی اور حیران رہ گئی۔ اس کو ہرگز اس بات کی توقع نہ تھی کہ بختیار اس کے علاوہ کسی اور کو اپنی جان کہے گا۔ دونوں تھوڑی دیر ایک دوسرے کے آمنے سامنے خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بختیار اٹھا اور ہولے ہولے قدم اٹھاتا نیچے تہہ خانے میں اتر گیا۔ اس نے فلپس کا وی سی آر اٹھایا اور اس کو سینے سے لگا کر اوپر آ گیا۔ خجستہ ابھی تک وہیں بیٹھی تھی۔ وی سی آر لا کر اس نے ایلومینیم کی چھوٹی تپائی پر رکھا تو خجستہ نے کہا "مجھے یہ نہیں چاہیے۔ مجھے دوسرا چاہیے سونی۔" سونی کا نام سنتے ہی بختیار کا دل بیٹھ گیا اور اس کی آنکھوں کے پیچھے بہت سارے آنسو امڈ آئے لیکن اس نے یہ معاملہ خجستہ پر نہیں کھلنے دیا اور جوکر کی طرح مسکرانے لگا۔

خجستہ نے کہا "جناب کی بڑی مہربانی، شکریہ۔ یہ لے جائیے اور اس کی جگہ سونی لے آئیے۔ بختیار نے سر جھکا کر کہا وہ تو میں کسی صورت میں بھی نہیں لا سکتا۔ اس کو میں نے ابھی تک چیک بھی نہیں کیا۔ صرف ڈبے سے نکال کر شیلف پر رکھا ہے۔

"تو کیا ہوا" خجستہ نے ڈھٹائی سے کہا "استعمال کی چیز ہے۔ استعمال کے لیے ہے اور استعمال کے لیے ہی خریدی گئی ہے۔

سونی وی سی آر کے لیے استعمال کا لفظ سن کر اور اس دیدہ دلیری سے دلگر طریقہ پر سن کر بختیار کی روح بلبلا اٹھی۔ اس نے دردناک لہجے میں کہا "سونی واقعی میری جان ہے میں اپنے ہاتھ سے اٹھا کر کسی کو نہیں دے سکتا۔ میرے بعد خود اٹھا کر لے آنا۔ بڑے شوق سے۔"

خجستہ نے بختیار کا چہرہ دیکھا تو اس کو فکر پڑ گئی۔ اس کی رنگت فرفت زدہ انسان چہرے جیسی ہو گئی تھی اور اس کی آنکھیں ایک دم سے بے نور سی ہو گئی تھیں۔ اس نے

مسکرا کہا "اگر مجھے ضرورت پڑی تو نکال لوں گی۔ ورنہ اسی پہ اپنے والے پر دیکھتی رہوں گی ——— کوئی ضروری نہیں بختیار کہ میرے والا بختیار خراب ہو جائے" "بالکل! کوئی ضروری نہیں، لازمی نہیں ہے کہ تمہارے والا خراب ہو جائے . . . . ہوگا بھی نہیں . . . . لیکن اگر ضرورت پڑے تو نکال لینا، لیکن انشاء اللہ ضرورت نہیں پڑے گی ——— تمہارے والا ٹھیک ہے بالکل"۔

اچانک خجستہ کے ذہن میں ایک مہینہ پہلے والی شام آگئی۔ جب وہ بختیار کو ساری کوٹھی میں تلاش کرتے کرتے گیراج کے سامنے پہنچی تھی تو اس کو بختیار کی پسندیدہ پرفیوم کی ایک لکیر سی سنگھائی دی تھی۔ اس نے شکاری کتیا کی طرح رک کر وہ رسید ھے اور ایک الٹا چکمہ کاما تھا۔ اور پھر حیرانی سے گیراج کا دروازہ دیکھا تھا جو آج زندگی میں پہلی مرتبہ اندر سے بند تھا۔ خجستہ نے چینے برابر نکلی گانٹھ سے آنکھ لگا کر دیکھا تو اندر سے سرخ بدن والی فراری سپورٹ کھڑی تھی۔ اور اس کی بڈ اتری ہوئی تھی۔ دونوں سیٹوں پہ جھالر والا سفید کپڑا چڑھا تھا جس کی ڈوری سیٹوں کی پشت پہ پلاسٹک کے نارک سے ہکل میں بندھی تھی۔ سامنے دونوں پہیوں کے درمیان مڈگارڈوں کی ڈھلانوں پہ ہاتھ رکھے بختیار زمین پہ بیٹھا تھا اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ خجستہ نے بہت کوشش کی لیکن اسے ٹھیک سے نظر نہ آیا کہ بختیار کیا کر رہا ہے۔ ایک دو ذہنی اندازے لگانے کے بعد جب اس کے ذہن میں یہ تصویر ابھری کہ بختیار نے خودکشی کر لی ہے اور وہ مر چکا ہے تو اس نے چیخ ماری اور دھڑادھڑ دروازہ پیٹنے لگی۔ بختیار گھبرا کر اٹھا اور اس نے جلدی سے دروازہ کھولا اور دروازہ کھلتے ہی خجستہ دیرائنوں کی طرح اس کے ساتھ لپٹ کر زور زور سے رونے لگی۔ اسی دن سے پتہ نہیں کیونکہ خجستہ کو لال فراری بری لگنے لگی اور اس کے برا ماننے ہی بختیار نے چوری چھپے فراری سے ملنا شروع کر دیا۔

بختیار کو فار الیسٹ کے دورے سے ایک مہینے بعد ہی لوٹ آنا تھا لیکن جس

جہاز سے وہ گیا تھا اسی جہاز میں چرس سمگل کرنے والا ایک نوجوان بھی تھا۔ اس کی اور نوجوان کی سیٹیں ساتھ ساتھ تھیں۔ پھر جب دونوں جہاز سے اتر کر لاؤنج کی طرف جا رہے تھے تو دونوں بڑے بے تکلف انداز میں گفتگو کرتے جا رہے تھے نوجوان نے راستے میں اپنا تھیلا بختیار کو دے کر پتلون کی بیلٹ بھی کسی کی تھی جب اس تھیلے والے نوجوان کے اوور کوٹ کے شولڈر پیڈز لگائے جا رہے تھے تو اس کا پاسپورٹ اور ہیلتھ سرٹیفکیٹ وغیرہ کے ہاتھ میں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بختیار کو ہانگ کانگ میں بھی روک کر شامل تفتیش کر لیا گیا تھا اور اس کے تین مہینے بک بک میں ضائع ہو گئے تھے۔ دو مرتبہ اسی کے والد ملک التجار شمس الدین اس سے ملنے ہانگ کانگ آئے اور دونوں مرتبہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود ناکام واپس آ گئے۔ بختیار کی ضمانت ہانگ کانگ کے سب سے بڑے تاجر نے دی تھی اور وہی اس مقدمے کی پیروی بھی کر رہا تھا۔

چار مہینے بائیس دن اور سات گھنٹے بعد جب بختیار واپس وطن پہنچا تو کسی کو اس کی آمد کی اطلاع نہیں تھی۔ فروری کے آخری ہفتے کی شام تھی، شام کے چھ بج کر بیس منٹ ہوئے تھے اور نجمہ ٹی وی دیکھ رہی تھی اپنے سامنے اچانک بختیار کو دیکھ کر اس کے منہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ ایک ہی جست میں وہ اس زور سے بختیار کے گلے سے جا کر لپٹی کہ اس کا کیمرہ کندھے سے لڑھک کر اس کی کلائی میں آ گیا۔ وہ تو اگر اس نے موٹی رولیکس نہ باندھی ہوتی اور وقت پر ہاتھ اوپر نہ اٹھا لیا ہوتا تو کیمرہ اپنے سارے الیکٹرانک سسٹم کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔

نجمہ نے بختیار کو کھینچ کر اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر باندری کی طرح اس کے ساتھ چمٹ گئی۔ پھر وہ اپنے قصے کہتا رہا اور وہ اپنے دکھڑے روتی رہی۔ جدائی کے غم، فرقت کی کہانیاں، اکیلے پن کا احساس اور جب بختیار نے گردن گھما کر دیکھا تو صوفے کے پہلو میں چھوٹی تپائی پر سونی پڑا تھا، اور اس کی نارز مین پر گری

ہوئی تھی۔ سونی وی سی آر کا خوبصورت شو مٹی اور گرد سے مٹیالا سا ہو گیا اور اس کے ساتھ ایک مرجھا سا تنکا چپکا ہوا تھا۔ خجستہ نے بختیار کے مڑے ہوئے چہرے کی ٹھوڑی اپنے مخروطی ہاتھ سے اپنی طرف پھیر کر کہا " وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ میرا وی سی آر تمہارے جانے کے ایک مہینہ بعد خراب ہو گیا تھا اور مجھے مجبوراً تمہارا سونی نکالنا پڑا ــــــ دیکھو میں نے اسے کس محبت سے اور احترام کے ساتھ رکھا ہے۔ ہر وقت اس پہ آرائش لنن کا سرپوش رہتا ہے"۔ بختیار نے جب وی سی آر کو گردن گھما کر دیکھا تو خجستہ نے تڑپ کر کہا " آئی ایم سوری بختیار یہ دیکھو ابھی گرا ہے ــــ ابھی ایک منٹ پہلے اس پر تھا ــــ میں جب اچھلی ہوں تو میرے جھل سے اڑ کر قالین پہ جا گرا ــــ میں تو اسے تمہارا محبوب سمجھ کر اس سے اور بھی پیار کرتی رہی ہوں۔" آنسلی! بختیار نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور پوچھنے لگا " یہ کوئی نئی سیریز ہے؟" خجستہ نے اپنا پاؤں کھجاتے ہوئے کہا " وہی ہے جو تم چھوڑ کر گئے تھے۔" پھر پتہ نہیں اس کو کیا ہوا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی ٹی وی بند کیا، سائیڈ بورڈ سے چابیاں اٹھاتے ہوئے بولی " میں ابھی سب کو جا کر بتاتی ہوں کہ تم آ گئے ہو۔ اور ابھی سب کو اکٹھا کر کے لاتی ہوں " گیٹ ٹو گیدر" کے لیے"۔
بختیار نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور خجستہ تیزی کے ساتھ دروازے سے باہر نکل گئی۔ اس کی موٹر سٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ پھر اس کے پہیوں کی سکنچ سنائی دی اور وہ گیٹ سے باہر نکل گئی۔

بختیار نے اپنا سر صوفے کی پشت پہ ڈال دیا۔ بائیں پیر سے دائیں پیر کا موکیشن اتارا اور دائیں سے بائیں کا۔ پھر دونوں پیر اوپر کر کے بیٹھ گیا۔ وہ اتنی لمبی فلائٹ کے بعد بالکل تھک چکا تھا اور اپنے سونی کو اس طرح بے آبرو دیکھ کر نڈھال ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی دونوں آنکھیں ہتھیلیوں سے دبائیں اور اندھیرا کر کے بیٹھ گیا۔ ذرا سی دیر کے بعد اس کے کان میں ایک مدھم سی آواز رس گھولنے لگی " بختیار.... بختیار.... سویٹ ہارٹ بختیار!"

اس نے ہاتھ اٹھا کر آنکھیں کھولیں۔ سامنے نظر کی، چھت کو دیکھا سر کھجایا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر میٹھی سی آواز آئی۔

"ادھر دیکھ جانِ من...... میری طرف...... اپنے سوفی کی طرف......"

بختیار نے پلٹ کر دیکھا تو وی سی آر کی سبز بتی بارہ بیس! بارہ بیس! بارہ بیس! کر کے جلنے لگی تھی۔ اور اس کا شو ابھی تک اسی طرح قالین پر پڑا تھا۔

بختیار کو اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں پر یقین نہ آیا تو سوفی نے ہنس کر کہا "مجنوں میں کنکشنوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بختیار نہ شو کی نہ پلگ کی۔ نہ میل کی نہ فیملی کی...... اس کے لیے تو بس محبوب کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف اسی کے دم قدم سے ساری روشنیاں ہوتی ہیں کنکشن سے نہیں۔

بختیار اس بیان اور اس ماجرا کے درمیان لٹک کر رہ گیا۔

سوفی نے کہا "شرم آتی ہے اور کیسے بتائیں نہیں رہا جاتا کہ خجستہ نے تیرے بعد اچھا نہیں کیا۔ وفا کے نام کو بٹہ لگایا اور تجھے بھول بھال کے تیرے ہی گھر میں اک اور گل کھلایا۔

بختیار کو وی سی آر کی اس بات پر سخت غصہ آیا۔ چاہتا تھا کہ وہ دھکا مار کر اس کو مع تپائی کے زمین پر گرا دے کہ ٹی وی کی سکرین روشن ہو گئی۔ اور سامنے اس کے گھر کا منظر چلنے لگا۔ اسی جگہ پر بہت سے لوگ جمع ہیں۔ ایٹ ہی کا سامان بہم ہے اور مہمان خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ خجستہ کے ساتھ اس کی دونوں سہیلیاں ندیمہ اور رضا بھی میزبانی کے فرائض سر انجام دے رہی ہیں۔ کل گیارہ اشخاص ہیں۔ سب اپنی اپنی شیخی بگھار رہے ہیں۔ کوئی زبان سے، کوئی آنکھوں سے، کوئی زلفوں سے، کوئی اپنے انداز نشست سے کوئی کسی کو دیکھنے اور دیکھے رہنے سے۔ ہر شخص اپنے آپ پر سپاٹ لائٹ فٹ کروا رہا ہے اور مسعود خجستہ کو دیکھ کر غٹر غوں غٹر غوں کر رہا ہے اور جدھر وہ

جاتی ہے اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے ___ اچانک سکرین پر وقفہ ابھرتا ہے۔ ___ بختیار چیخ کر پوچھتا ہے ___ "وقفہ کیوں سونی!" ___ وقفہ کیوں؟ اور سونی بڑے سدھارن طریقے پر کہتا ہے "آہستہ بختیار آہستہ۔۔۔۔ آرام سے میری جان۔۔۔۔۔ دھیرج سے۔۔۔۔ میرے پاس ٹیپ کم تھا اس لیے میں غیر ضروری سین حذف کرتا گیا۔

پھر سین ابھرا کہ سب لوگ چلے گئے ہیں اور مسعود اور خجستہ رہ گئے ہیں۔ مسعود نے خجستہ کا پاؤں اپنی گود میں رکھا ہوا ہے۔ اور اس کو سینڈل پہنا رہا ہے۔ پھر دونوں اٹھتے ہیں اور کچن چلے جاتے ہیں ___ سونی نے کہا "میں نے یہ سین بڑی مشکل سے بنایا ہے جانی۔ لونگ شاٹ ویسے بھی ایک مشکل کام ہے لیکن جب روشنی کم ہو اور دروازہ آدھا کھلا ہو تو کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن تمہاری خاطر تو ہماری جان بھی حاضر ہے۔ اس لیے میں نے لڑکھڑا لڑکھڑا کر اور گھوم گھوم کر یہ شارٹ بنایا ہے خجستہ کھانے کی میز پر بیٹھی ہے۔ مسعود بٹلر کا ایپرن باندھے اور سر پہ بڑی سی ٹوپی لگائے اس کے لیے آملیٹ بنا رہا ہے۔ اور توسٹ سینک رہا ہے۔ دونوں چیزیں لا کر خجستہ کے سامنے رکھتا ہے اور خود ساتھ والی کرسی پر بیٹھ کر سلائس کھانے لگتا ہے۔ خجستہ اپنا آدھا آملیٹ کاٹ کر مسعود کو دیتی ہے مسعود شوق اور محبت سے کھاتا ہے۔ پھر خجستہ کا آدھا پیا ہوا گلاس اٹھا کر منہ کو لگا لیتا ہے۔

بختیار کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ تو سونی نے رک کر کہا۔ "اگر تمہیں تکلیف ہوتی ہو تو بند کر دوں؟" "نہیں نہیں۔ چلاؤ چلاؤ۔" بختیار نے رعب سے کہا۔ "میں سب کچھ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میری غیر موجودگی میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے اور کون کون لوگ ادھر آتے رہے ہیں۔"

سونی نے کہا "چھوڑ۔ دفع کر۔ جب تمہیں تکلیف ہوتی ہے تو میرا سرکٹ جلنے لگتا ہے۔ اور مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے میرے سارے فیوز ایک ساتھ اڑ گئے ہوں۔"

پھر بختیار نے دیکھا کہ مسعود اور خجستہ کیرم کھیل رہے ہیں، اور دونوں میں سے جو کوئی بھی گوٹ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنا سر بورڈ پہ آگے کو لے آتا ہے۔ دوسرا اپنا ماتھا آگے جھکے ہوئے سر پہ لگا دیتا ہے۔ تین تین چار چار منٹ کے بعد ایک گوٹ چلتی ہے۔

ایک سین میں مسعود اور خجستہ لمبے صوفے پہ بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے ہیں دونوں نے اپنے اپنے بازو دوسرے کی گردن کے پیچھے سے گزار کر ایک دوسرے کے کندھے پہ رکھے ہوئے ہیں۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ایک نہایت ہی بور ڈرامہ دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں اور ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں داد دے رہے ہیں۔

جب اگلا سین آیا تو بختیار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خجستہ مسعود کا سر اپنی فرنچ شفون کی قمیض کے کندھے سے لگائے اس میں "جین سنگ" آئیل جھس رہی ہے۔ اور ہولے ہولے کچھ گن گنا رہی ہے —— بختیار نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی مگر کچھ سمجھ نہ آ سکا۔ کوئی فوک گیت لگتا ہے جس میں عہد و پیمان ہوا کرتے ہیں ——

بختیار کی آنکھوں سے ٹپاٹپ آنسو گرنے لگے۔ تو سوفی نے کہا "صبر! اے تاجر بچے! انسانوں کے یہی کام ہیں یہ آج سے نہیں ازل سے یہی کچھ کرتے آئے ہیں۔ محبت کرنا ان کے بس کی بات نہیں پہلے ان سے جانے میں یا انجانے میں کوئی غلطی ہو جاتی ہے پھر ساری عمر احساس جرم میں گزر جاتی ہے۔ ہمیں دیکھو اور ہم سے پوچھو کہ تمہاری یاد میں ہم نے کس طرح سے یہ گھڑیاں کاٹی ہیں۔ سارے "بیس منٹ" میں کسی نے بھی خوشی کا ایک تانبہ نہیں دیکھا۔ سب تمہی کو یاد کرتے رہے ہیں۔"

"میں بھی تمہیں یاد کرتا رہا ہوں سوفی" بختیار نے بلبلا کر کہا اور اٹھا کر سوفی کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مرتبہ پھر آنسوؤں کی جھڑی بہہ نکلی اور وہ سوفی کے بدن پہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ سوفی کے اندر سے خرخر کی ایسی آواز آنے لگی جیسے ہانڈی پھرانے والی بلی سے آیا کرتی ہے۔ بختیار نے سوفی کو گود سے اٹھا کر سینے سے لگا لیا

تو اس کے اندر سے ایسی خوشبو آنے لگی جیسے شروع گرمیوں میں جسموں سے آنے لگتی ہے۔

سوفی نے بڑی مدہم سرگرمیوں میں کہا "چلو نیچے بیس منٹ چلیں سب تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" "ذرا ٹھہرو، بختیار نے کہا "خجستہ کو واپس آجانے دو۔" "دفعہ کرو خجستہ کو"۔ سوفی نے چڑ کر کہا "لعنت بھیجو اس چھنال پر۔ آوارہ کتیا پر۔ چلو!"

بختیار سوفی کو اسی طرح سینے سے چمٹائے بیس منٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

امرتا پریتم
ترجمہ: خیرالدین انصاری

پانی کا کٹورا

(پنجابی کہانی)

ہم نے سوکھے حلق کھانا کھایا۔ بے شک وہ پیڑ کے درختوں سے بھرا پڑا جنگل تھا۔ اور ہلکی ہلکی خنکی ہمارے کوٹوں سے گزر کر۔ ہمارے بدن کو چھو رہی تھی، لیکن پانی کی پیاس پھر پانی کی پیاس ہے۔

جیٹھ کا مہینہ ختم ہونے کو تھا۔ یوں لگتا تھا کہ پہاڑی باؤلیاں سوکھی زبان کے ساتھ ہونک رہی ہوں۔ جہاں کہیں کسی نے بہتی باؤلی کا پتہ بتایا ہم اپنی ٹانگیں گھسیٹتے وہیں پہنچ گئے۔ لیکن یہاں اس باؤلی کو بہتا ہوا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی بوند ٹپکتی تھی۔ جیسے باؤلی ایک ایک بوند کو گن کر۔ اپنے ختم ہو جانے والے خزانے میں سے نکال رہی ہو۔ اس کے دہانے کے نیچے تھوڑا سا پانی اکٹھا ہو گیا تھا اور بکریاں چرانے والے پہاڑی لڑکے اس میں سے اوک بھر کر۔ پی رہے تھے لیکن ہم سے اُس کا گھونٹ نہ بھرا جا سکا۔

تھوڑے فاصلے پر پیڑ کے درختوں میں چھُپے ہوئے ایک گھر کا دھندلکا نظر آیا۔

"پتہ کروں شاید اس گھر سے پانی مل جائے" میں نے کہا۔

درختوں کے جھُنڈ میں ایک ہموار سی جگہ تلاش کر کے وہ سب تاش کھیلنے لگے۔ مَیں اکیلی اُس گھر کی پگڈنڈی تلاش کر کے پانی کا پتہ کرنے چلی گئی۔

آپ کو کھِلے ہوئے پھول کئی جگہ مل جائیں گے لیکن کسی انسان کا کھِلا ہوا چہرہ آپ کو کبھی کبھار ہی ملے گا۔ جس عورت نے گھر کا دروازہ کھولا سچ مچ اُس کا چہرہ پھولوں سے بڑھ کر تھا۔

"پانی کی تلاش میں آپ کے گھر آئی ہوں"۔
"ان سوکھے مہینوں کا میں نے پہلے بھی کئی بار شکریہ ادا کیا ہے۔ ان دنوں میں کئی بار لوگ مجھ سے پانی لے گئے ہیں"۔
"صرف پھول سا چہرہ نہیں تھا۔ اس عورت کے بول بھی پھول ایسے تھے۔ حیران تھی کہ چیڑ کے اس جنگل میں یہ پھول کہاں چھپا ہوا تھا"۔
"تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔ میرا نوکر پانی لے کر آتا ہی ہوگا۔ نزدیک ہی غار میں ایک چشمہ بہہ رہا ہے۔ کوئی میل بھر کی اُترائی ہوگی، اُسے اس طرف کہیں پانی نہیں ملتا"۔
آج میں کہاں آگئی تھی! ـــــ سارا کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ کتابیں مجھے پھول کی خوشبو لگتی ہیں اور جیسے اس راز سے پردہ اٹھ گیا کہ اس عورت کا چہرہ اتنا پُرکشش کیوں تھا۔

جب اُس نے مجھ سے میرے بارے میں کچھ پوچھا تو جو بات میں نے مختصر سی ملاقات میں کسی سے نہ کہی تھی، اُس سے کہہ دی۔ "گیت لکھتی ہوں"۔
"گیت ـــــ میں نے کبھی گیت نہیں لکھے۔ لیکن میں نے وہ راہ دیکھ لی ہے جہاں سے گیت چل کر آتے ہیں"۔
میرا دل جیسے اُٹھ کر اس عورت سے بغل گیر ہو گیا۔ یہ بغل گیر ہونے کی کرامت تھی کہ اس عورت نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اس سے اگلے کمرے میں لے گئی۔ اُس کمرے میں ایک بڑا پیارا بستر لگا تھا۔ اتنا تازہ جیسے رات کو ساری دنیا کا چین وہاں سوتا ہو۔
اُس کمرے میں ایک بڑی خوبصورت تصویر تھی جیسے ساری دنیا کے مردوں کا حُسن اس میں اکٹھا ہو گیا ہو۔!
"یہ شاید آپ کے شوہر ہیں؟"
"شاید شوہر کا لفظ کافی نہیں ہے۔ میرا رشتہ مکمل تھا"۔
"تھا کیوں؟"
"دو برس پہلے رشتوں والا اس دنیا سے چلا گیا ہے"۔

"چند لمحوں کی واقفیت میں مجھے آپ سے پوچھنے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن اگر آپ میرے دل کے کانوں میں کچھ کہہ سکیں تو۔ ۔ ۔ ۔"

کمرے میں ایک قالین بچھا ہوا تھا۔ ہم دونوں وہاں بیٹھ گئے۔

میں بیس برس کی تھی۔ میرا دل جس راہ پہ گیا۔ اُس راستے پہ میری ڈولی نہ گئی۔

"شادی کی مہندی لگنے والی تھی۔ جب میری سہیلی نے میرے کانوں میں یہ کہا، تو جس سے پیار کرتی تھی اس کو میں نے پیغام بھجوایا کہ تقدیر کی لکیروں کو میں مٹا نہیں سکتی لیکن ایک بار آ کر ان غلط لکیروں والی ہتھیلی پر اپنے ہاتھوں سے مہندی رچا جا۔"

"ایک الگ تھلگ کمرے میں گئی۔ اس نے مہندی کا کٹورا پرے کر دیا اور اپنے قلم سے انگوٹھے پر سیاہی لگا کر اس نے میری ہتھیلی پہ اپنا انگوٹھا ثبت کر دیا۔"

"میری ہتھیلی کے کاغذ پہ یہ جو انگوٹھا لگایا ہے اسے میں کیا کروں گی؟ — اب میں نے کس حق سے تجھ سے کچھ لکھوایا ہے؟" میرے آنسوؤں نے اُس سے پوچھا۔

جی چاہے تو آج مانگ لو۔ جی چاہے بیس برس بعد مانگ لینا۔ تو جب بھی میرے پاس یہ کاغذ لے کر آئے گی۔ میں تیرے حقوق تجھے دے دوں گا۔

اس نے یہ بات کہی اور چلا گیا۔

"میں نے اس ہتھیلی کو اپنی پیشانی پہ لگا لیا اور دوسری ہتھیلی پہ مہندی لگوا کے میں نے شادی کا جوڑا پہن لیا۔"

"کوئی زندگی بھر بازی ہارتا جائے اور پھر بھی کھیلتا جائے۔ میں نے ایسی ہی ہمت کے ساتھ کئی سال بتا دیے۔"

"ہاں — کئی سال — ایک بچے کی ماں بنی۔ جب وہ چھوٹا تھا میں اس کے لئے مصروف رہ کر دن کاٹ لیتی تھی۔ لیکن وہ جوں جوں بڑا ہوا اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے لگا میری مصروفیات کم ہو گئیں اور مجھے جینے کے لئے کچھ زیادہ ہی ہمت کرنی پڑی۔"

گھر، اچھے کھاتے پیتے لوگوں کا تھا۔ لیکن پردوں کے پیچھے تنگیاں تھیں۔ نہ کہیں کہیں جانا، نہ ہمارے گھر کسی کو آنا اور جنہیں ایسے بڑے منہ والے امیروں سے ملنا ہو،

وہ ملنا کوئی انسانوں کا سا ملنا کب ہوتا ہے۔

گھر کے سامنے ایک چائے کی دوکان تھی۔ ساتھ ہی لاریوں کا اڈا تھا۔ دو چار مہینے بعد وہاں قوالوں کی ایک پارٹی آتی تھی، بہت مشہور قوال تھے۔ انہیں وہاں سے لاری بدلنا ہوتی تھی۔ دو گھنٹے وہ وہیں اڈے پر پڑے رہتے۔ چائے کی دوکان والا کوئی رنگیلا آدمی تھا تمام قوالوں کو مفت چائے پلاتا اور پھر ان سے ایک قوالی سنتا۔

"کھڑکیوں کے پردے اٹھا دینے کا ہم عورتوں کو حق نہ تھا۔ لیکن قوالی کی آواز اُن پردوں سے چھن کر آجاتی —— اور دوتوں کی محنت سے میں جن چیزوں کو اپنے دل میں ٹھکانے پر رکھتی تھی، انہیں اپنے ہی ہاتھوں سے اُلٹا دیتی تھی۔"

"کبھی کبھی میں نوکر کو یہ کہہ کر پیسے دیتی "جا، اپنا نام، میرا نام نہ لینا۔ اُن قوالوں کو اور چائے پلا اور کہہ کہ ایک اور قوالی سنا دیں۔"

"مجھے تقدیر کے ہاتھوں میں کھیل بنے بیس برس ہو گئے تھے۔ میں نے سُنا کہ وہ بیمار ہو گیا ہے۔ وہی جس نے میرے ہاتھوں کے کاغذ پر اپنا انگوٹھا لگایا تھا اور کہا تھا جی چاہے آج مانگ لے اور جی چاہے بیس برس کے بعد یہ کاغذ لے آنا میں تیرے حقوق تجھے دے دوں گا . . . . یہ مجھے پتہ تھا، اُس نے شادی نہیں کی تھی۔ اُس کے پاس اُس کی ماں تھی اور اب اس کی بیماری کے وقت وہی اس کا سہارا تھی۔"

تمام دن میں اپنی ہتھیلی دیکھتی رہی۔ مجھے لگتا کہ اب ایک انگوٹھے کا نشان اس پر ابھرتا چلا آرہا ہے۔ جیسے کوئی زخم برسوں کے بعد رسنے لگتا ہے . . . .

اُس دن پھر قوالوں کی پھیری تھی۔ چائے والے نے انہیں چائے پلائی تھی۔ وہ گا رہے تھے،

رہی بنائے تنائے کوئی گنہ پاٹہ نہ لیتا
کورا گئی منڈائے کوئی رنگوار نہ کیتا

قوال تو گا کر چلے گئے لیکن گیت کو وہیں چھوڑ گئے اور مجھے لگا کہ گیت سیڑھیاں

چڑھ کر میرے پاس آن کھڑا ہو گیا تھا۔ ۔ ۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر میری ہتھیلی پر اُگے ہوئے انگوٹھے کو دیکھ رہا تھا اور پھر جیسے اس انگوٹھے کا نشان گانے لگا۔

رہی بناتے تناتے کوئی گز پاڑہ نہ لیا ؎

بیس برس تک میں بیگانوں کا گھر سجاتی رہی۔ ہر کام کے دھاگے بُنتی رہی۔ تانا تنتی رہی۔ لیکن خود جیسے کبھی استعمال کر کے نہ دیکھا تھا اور پھر ــــ میں نے بیس برس بعد زندگی کے تھان میں سے ایک گز کپڑا پھاڑ لیا۔

"سچ!"

"ہاں میری بہن سچ!"

دولت اور عزت کی قیمت ادا کر کے ایک گز کپڑا خرید کر لیا۔

وہ سینی ٹوریم میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے جا کر اس کے آگے اپنی ہتھیلی دھر دی۔ آہ دیکھ اپنے انگوٹھے کا نشان، یہ نشان کسی اور کو نہیں دکھائی دیتا ــ لیکن مجھے دکھائی دیتا ہے ــ تجھے بھی دکھائی دے گا ــ میں اپنا حق لینے آئی ہوں۔

"اب میرے پاس زندگی کے دن بہت تھوڑے ہیں۔ تو ان کے لیے اتنی قیمت ادا نہ کر ــ اُس نے بہت کہا، لیکن میری ایک ہی منت تھی۔ زندگی کے تھان میں سے مجھے ایک گز کپڑا دے دے، بس ایک ہی گز۔ ۔ ۔"

کوئی کہے گا کہ ایک گز کپڑا ہی کیوں ؟ ــــ میں زندگی کا سارا تھان استعمال کر سکتی تھی۔ یہ تقدیر تو میں بیس برس پہلے بھی بنا سکتی تھی۔ لیکن اب میں نے اپنی عزت اور اپنے سکھ کی قیمت ادا کی ہے۔ اُس وقت میرے والدین کے دلوں کا سوال تھا۔ میں نے اُن کے دلوں کو قربان کرنا اپنا حق نہ سمجھا۔ ۔ ۔ ۔ لیکن یہ بھی کوئی جواب نہیں۔ وہ تمام قیمتیں غلط تھیں۔ لیکن زندگی گزارے بغیر بھید نہیں ملتا۔ ان قیمتوں کے لئے میں نے اپنی جوانی قربان کر دی۔ اپنے محبوب کی صحت قربان کر دی اور اب نہ میرے پاس جوانی تھی نہ میرے محبوب کے پاس صحت۔ لیکن اب میں اس کی بیماری کے دنوں کی قربانی نہ دے سکتی تھی۔"

میں نے اس عورت کا منہ دیکھا۔ ایک بول سُنا جس پر میرا دل اٹھ کر اس کے دل کے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔ جوانی اور صحت کو قربان کرنے والی۔ بڑھاپے اور بیماری کو خریدنے والی وہ عورت اب اُس بلندی پر کھڑی ہوئی تھی جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ میرا سر جھک گیا۔

ڈاکٹروں نے بمشکل چھ ماہ کی اُمید دلائی تھی لیکن زندگی کو مجھ پر تھوڑا سا رحم آ گیا۔ میرے گھر میں، اس کمرے میں، مَیں نے چھ سال اس کے ساتھ زندگی گزاری۔ ان بلند قامت پیڑوں کی چھاؤں میں، مَیں نے وہ ایک گز کپڑا استعمال کر کے دیکھ لیا۔

"میرا سفر اور طبابت ہوتا لیکن ابھی اُن کی والدہ زندہ ہیں ۔ وہ مجھے اپنا بیٹا بھی کہتی ہیں ۔ بیٹی بھی کہتی ہیں اور بہو بھی کہتی ہیں"۔

"یہیں ہیں آپ کے پاس؟"

"ہاں یہ گھر ہماری یادوں کا آشیانہ ہے۔ دن بھر چیڑ کے ان درختوں کے سائے میں بیٹھ کر وہ مجھے اپنے بیٹے کی باتیں سناتی رہتی ہیں۔ نہ کبھی میرے کانوں کی سیری ہوتی ہے اور نہ کبھی ان کے بول ہی ختم ہوتے ہیں"۔

"ایک پل میں انہیں دیکھ سکتی ہوں؟"

"میں دیکھتی ہوں اگر سوئی نہ پڑی ہوں"۔

"ماں سوئی پڑی تھی اور نوکر پانی لے کر آ گیا تھا"۔

میں نے حسبِ ضرورت پانی لیا اور اُس گھر سے واپس ہوتے وقت مجھے لگا جیسے اس عورت نے پیاسے راہ گیروں کو پانی نہ دیا ہو بلکہ صدیوں سے بھٹکتی ہوئی محبت کے لبوں سے پانی کا کٹورا مس کر دیا ہو۔

ظہیر بابر

فضا میں لٹکتی ہوئی لاش!

بات تو بس اتنی سی تھی کہ مجرم کو ایسی جگہ پھانسی دی جائے کہ سارا شہر دیکھے اور عبرت پکڑے مگر یہ چھوٹی سی بات اتنی بڑھ گئی کہ ایک بہت بڑی مصیبت بن گئی۔

منصف نے یہ جملہ سینکڑوں بار لکھا تھا کہ ملزم کو تا دمِ مرگ سولی پر لٹکتے رہنے دیا جائے اُسے یہ جملہ اتنا ہی رسمی لگتا تھا جتنا عدالت کے صدر دروازے پر کھڑے ہوئے گن مین کے سلیوٹ کا جواب دینا۔ ابھی سلیوٹ مکمل نہیں ہوتا تھا اور اس کی کار گن مین کو پیچھے چھوڑ چکی ہوتی تھی مگر اس مرتبہ فیصلے کا آخری جملہ لکھتے وقت اس کا قلم ذرا دیر کو ٹھٹکا تھا، شاید اس لئے کہ اس نے سرکاری وکیل کی یہ استدعا بھی فیصلے میں شامل کر لی تھی کہ پھانسی ایسی جگہ دی جائے کہ ملزم کے ساتھی اس کا انجام دیکھ سکیں۔ سزا دیتے ہوئے سنانا ایک بات تھی اور لوگوں کو دعوتِ نظارہ دینا دوسری! غالباً اسی وجہ سے یہ خیال بھی اس کے دماغ میں بار بار سر اٹھا رہا تھا کہ وہ عدالت کے مانوس کمرے میں نہیں بلکہ سارے شہر کے سامنے فیصلہ سنانے جا رہا ہے۔

منصف نے خلافِ معمول ایک دن کی تاخیر سے فیصلہ سنا دیا۔ عدالتی فیصلوں پر عدالت کی ہدایت اور منشا کے مطابق عمل کرنا انتظامیہ کا فرض ہوتا ہے۔ تمام فیصلے محکمہ داخلہ کا محض طواف کر کے جیل والوں کے پاس پہنچ جایا کرتے ہیں۔ انہیں اپنی ذمہ داریاں خوب معلوم ہیں لیکن تازہ فیصلہ ذرا ٹیڑھا تھا۔ اس کی وجہ سے امن و امان برقرار رکھنے کا

سوال بھی پیدا ہوا۔ اور تماشائیوں کی نشستوں کا انتظام کرنے کا بھی۔ اس لیے جیلیہ کی مرکردگی میں ایک کمیٹی قائم کر دی گئی جسے محض پہچان کی خاطر "پھانسی کمیٹی" کا نام ملا۔ کمیٹی کو سب سے پہلے مناسب جگہ کا انتخاب کرنا تھا۔

شہر کا مرکزی چوک موزوں مقام تھا۔ اس کے ارد گرد اونچی اونچی عمارتیں تھیں جنکی چھتوں پر محافظ دستے مقرر کیے جا سکتے تھے۔ اکثر عمارات کی دوسری منزل میں دفاتر تھے۔ انہیں خالی کرایا جا سکتا تھا۔ ان کی کھڑکیوں میں سے بندوقیں ہر زاویے سے چاروں طرف گھوم سکتی تھیں۔ چوک میں بیس تیس ہزار تماشائی سما سکتے تھے۔ اس انتخاب پر شروع میں سب لوگ متفق نظر آتے تھے۔ انہوں نے ایک معترض کی یہ دلیل بھی مسترد کر دی کہ تماشائیوں کی تعداد کم ہوئی تو پھانسی کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ دوسرے افسر نے کئی لوگوں کے منہ کی یہ بات چھین لی کہ تماشائیوں کا فکر نہ کیجیے۔ وہ گنجائش سے زیادہ ہوں گے۔ ایسے مناظر تو لوگوں کو اب فلموں میں دیکھنے کو نہیں ملتے اور پھر انسان کے اندر ایک درندہ بھی پنجے مار رہا ہوتا ہے اسے بھی نہ بھولیے۔

بات وزنی تھی مگر ایک سینیئر افسر کو بری لگی۔ اس نے کہا:

"عدالت کا یہ منشا نہیں ہے کہ انسان کے اندر کا درندہ جگایا جائے اور وحشت و بربریت کے جذبات ابھارے جائیں۔ اس کے فیصلے سے واضح ہے کہ وہ صرف عبرت دلانا چاہتی ہے اور اندر کے درندے کو سمانا چاہتی ہے۔ آپ یہ بھی نہ بھولیے کہ بکرے کو ذبح ہوتے دیکھ کر اونٹ ہر شئے کو روندتا ہوا اس طرح بھاگتا ہے جیسے دوسری چھری اسکی گردن پہ ہوگی۔ اگر اتنے بڑے ہجوم میں چند لوگ بھی خوف زدہ ہو کر بھاگے تو بھگدڑ مچ جائے گی اور تماشائی تماشائیوں کو روند ڈالیں گے۔ انہیں چوک سے بھاگ نکلنے کا راستہ ہی نہیں ملے گا"۔

سینیئر افسر کی ہاں میں ہاں ملانا تو ملازمت کے آداب میں شامل ہے اور پھر انکی دلیل

بھی صحیح تھی۔ اس سے حوصلہ پا کر تیسرے رکن نے وہ بات کہہ دی جو سب کے دل میں تھی مگر جسے زبان پر لا کر کوئی بھی نا اہل اور بزدل نہیں کہلوانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا:

"زمانہ ویسے بھی نازک ہے۔ مجرم کے چند ساتھی شہر میں دندناتے پھرتے ہیں۔ وہ ظالم اور سنگدل ہیں۔ وہ ہجوم میں شامل ہو کر ہنگامہ بھی برپا کر سکتے ہیں اور اس ہنگامے میں ہم لوگوں کی جانیں بھی جا سکتی ہیں۔ اس لئے کوئی ایسی ترکیب سوچئے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے"۔

ان خیالات کی سب سے زیادہ تائید کمیٹی کے ان ارکان نے بہت زور شور سے کی جنہیں قاعدے کی رو سے پھانسی کی ٹکٹکی کے پاس موجود رہنا ہوتا ہے۔ سب سوچ میں ڈوب گئے۔ ان کے ذہنوں میں مختلف مقامات کی تصویریں گھومیں مگر ہر جگہ انہیں قتل و خون اور بھگدڑ کے علاوہ اپنے لئے خطرہ بھی نظر آیا۔ چنانچہ ان میں سے ہر ایک نے خود ہی ایک کے بعد دوسرا نام سنسر کر دیا۔ کمیٹی کی کاروائی کا آغاز ہی غلط ہوا تھا۔ سب کی سوچ خوف کی بھری پر چڑھ گئی تھی۔ جو کوئی جتنا سوچتا اتنا ہی خوف زدہ ہوتا۔ خاموشی اتنی گہری ہوتی جا رہی تھی کہ جیلر کی کرسی چرچرائی تو یوں لگا جیسے سورج کا کوئی تیر دھندلا پردہ چاک کر گیا ہے۔ جیلر کے چہرے پر سختی گھٹا بن کر چھائی ہوئی تھی۔ وہ اگر آدمی نہ ہوتا تو ضرور پتھر ہوتا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ بہت سی نظریں اس کے چہرے سے ٹکرا کے لوٹ رہی تھیں اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا:

"ہماری جیل بھی شہر کے وسط میں ہے"۔

سب کو اچانک احساس ہوا کہ شہر تو سیلاب کی طرح جیل کے گرد گھوم کر بہت آگے نکل گیا ہے۔ اب انگریزی کی اصطلاح میں جیل تو شہر کا دل بن گئی ہے۔ جیلر کے سیاہی مائل ہونٹوں پر مسکراہٹ لوٹ رہی تھی۔ اس نے بات بڑھائی:

"آپ لوگوں نے وہ کرب تو دیکھے ہوں گے جو شہر کے باہر کھڑے ہیں"۔

اس بے جوڑ بات پر کئی بتیسیاں کھلیں مگر جیلر کا چہرہ دیکھ کر قہقہے گلے کے نیچے ادھر ادھر کہیں چھپ گئے۔ جیل کے نوعمر افسر نے فوراً تائید کی:

"جی ہاں جناب! وہ کیا کہتے ہیں، خودکار، خودکفیل کمپیوٹر سے چلنے والے کرین۔ خوب بکے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ آئے تھے تو ہمارے کالج میں بھی مباحثہ ہوا تھا۔ موضوع تھا "جدید ترین ٹیکنالوجی پر تیسری دنیا کا بھی حق ہے"۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس مفروضے کے حق میں بولنے کو کہا گیا۔ مہمانِ خصوصی حزبِ اختلاف کے ایک لڑکے کی تقریر پہ آگ بگولا ہو گئے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ ہمارے حکام تو ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ لیتے ہیں۔ ہمیں صرف وہی ٹیکنالوجی ملتی ہے جو ہمارے گلے کا طوق اور ہمارے حلق کی پھانس بن جاتی ہے۔ مہمان خصوصی نے مقررین کی فہرست میں اس لڑکے کے نام کے گرد ایک دائرہ کھینچ دیا تھا۔ اس مباحثے کے بعد ہم نے اس لڑکے کو کبھی نہیں دیکھا....."

"خاموش رہو ورنہ تمہیں بھی کوئی نہیں دیکھے گا" جیلر نے مونچھیں جھاڑتے ہوئے درشتی سے کہا۔

نوجوان افسر گھبرا کر تیز تیز بولنے لگا:

"میں تو سابق حکومت کی بات کر رہا ہوں۔ آپ سب کو یاد ہو گا۔ ان کرینوں کے بوم بجلی کے جلتے بجھتے قمقموں سے سجائے گئے تھے۔ رات کو یوں لگتا تھا جیسے وہ بھاگ کر ستاروں میں شامل ہو جائیں گے؟ وہ کس قدر دھوکا تھا یہ سب کچھ! لوہے کے ان زرافوں کے استعمال کے لیے کوئی منصوبہ ہی نہ بن سکا۔ وہ چار سال سے پڑے زنگ کھا رہے ہیں"۔

نوجوان افسر کی گفتگو سے حاضرین محظوظ ہو رہے تھے۔ انہیں ذرا سانس لینے کا موقع ملا تھا مگر جیلر پہلو بدل بدل کر اپنی برہمی کا اظہار کر رہا تھا۔ آخر کمرے میں اس کی دھاڑ گونجی:

"تم خاموش رہو گے یا تمہیں کمرے سے نکالنا پڑے گا"

نوجوان نے اپنا سر جھٹکا اور خاموش ہو گیا۔ حاضرین نے جیلر کی نرم آواز سنی:

"یہ کرین آخر کس دن کام آئیں گے۔ ہم مجرم کو کرین پر چڑھا کر پھانسی دیں گے۔ نیچے کی طرف نہیں اوپر کی طرف۔"

جیلر کی پہیلی کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ سب حیرت کے باوجود خاموش رہے۔ نائب جیلر سے انتظار نہ ہو سکا۔ اس نے پوچھا:

"وہ کس طرح؟"

"ہم کرین کی ہُک سے رسہ باندھ کر مجرم کے گلے میں پھندا ڈال دیں گے۔ کرین کا بازو اوپر اٹھے گا اور گھر طرح۔" جیلر نے آخری جملہ یوں ادا کیا جیسے پاپڑ چبا رہا ہو۔

"مگر وہ سارے شہر کو دکھانے کا کام!"

"آپ کے بال سفید ہو گئے نائب جیلر صاحب۔ مگر کبھی نہ جیل سے اوپر اٹھ سکے نہ جیل کی دنیا سے باہر ہی نکل سکے۔" جیلر کے ہونٹ اس کی مونچھوں میں چھپ کر مسکرا رہے تھے "آپ کے سامنے تو پورا نقشہ بنا پڑا ہے گا۔ دیکھئے جیل کی دیوار اٹھارہ فٹ اونچی ہے اور مجھے یاد ہے کہ کرین کا بازو ڈیڑھ سو فٹ سے بھی زیادہ اونچا اٹھتا ہے۔ ملزم جیل کی دیوار سے تقریباً ایک سو تیس فٹ اونچا ہوگا۔ اتنی بلندی پر اُسے کل عالم دیکھ سکے گا۔"

"واہ۔" حاضرین میں سے کسی کے ہونٹ بے ساختہ کھلے۔ جیلر کے دیدے ان کی تلاش میں گھومے مگر اس وقت کئی ہاتھ اپنی مطمئن "واہ واہ" کا تعاقب کر رہے تھے۔

یہ مشکل بھی جیلر نے چٹکی بجاتے میں حل کر دی کہ فولادی زرافے کو جیل میں کیسے لایا جائے! جیل کی دیوار ایک جگہ سے گرا کر راستہ بنا لیا جائے۔ کرین گذر جائے گی تو قیدی لگا کر اسی وقت نئے سرے سے اینٹیں چنوا دی جائیں۔

"کمبخت مفت کی روٹیاں توڑتے ہیں۔ کیا اپنے جیل کی دیوار بھی مرمت نہیں کر سکتے۔" جیلر نے فاتحانہ انداز میں سب کی طرف دیکھا اور ہر ایک کو متفق پایا۔

اب کرین کو لانے اور چلانے کا مسئلہ تھا۔ کرینوں کے ساتھ دو یا تین ڈرائیور اور دوسرے

ماہر بھی آئے تھے۔ انہوں نے دس بار مقامیوں کو کرینوں کا سسٹم سمجھایا تھا اور تربیت دی تھی ان کا سسٹم خاصا پیچیدہ تھا۔ انہیں چلانے والے کے لئے ضروری تھا کہ ڈرائیور الیکٹرانکس کے بارے میں بھی جانتا ہو۔ ٹیلی سکوپس کے بارے میں بھی۔ اس "کمپیوٹر پروگرامنگ" سے آگاہ ہو اور ہیوی ڈیوٹی ڈرائیور بھی ہو۔ کرین کے ایئر کنڈیشنڈ کیبن میں صرف ایک سیٹ تھی۔ ایک ہی آدمی کو سارا کام کرنا تھا۔ یہ کرین بالکل نئی ایجاد تھے۔ ابھی ان کی آزمائش بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ کمپنی کے کسی افسر نے دیسی تجارتی وفد کو مرعوب کرنے کیلئے انہیں بھی دکھا دیا۔ وفد کے لیڈر کو یہ عجیب و غریب کرین اتنے پسند آئے کہ وہیں مچل گیا کہ انہیں بھی خریداری کی فہرست میں شامل کرو۔ ان میں نہ کوئی فولادی رسّہ تھا اور نہ کوئی لیور۔ پھر بھی ان کے بوم چاروں طرف گھومتے اور ڈرائیور جب چاہتا ایک ترتیب سے کبھی انہیں انگشتِ شہادت بنا دیتا، کبھی انہیں مکڑی کی ٹانگوں کی طرح پھیلا دیتا، کبھی ہاتھی کی سونڈ کی طرح لپیٹ دیتا اور جب بند کرتا تو وہ خوف زدہ کتے کی دم کی طرح غائب ہو جاتے۔ وہ ٹینک تک یوں اٹھا لیتے جیسے معصوم بچے کو ماں گود میں لے لیتی ہے۔ وفد کے لیڈر تو ان کرینوں پہ فدا ہو گئے۔ اگرچہ کمپنی نے ان کی بڑی خاطر تواضع کی تھی۔ ان کے آرام و آسائش کا پورا خیال رکھا تھا مگر اس نے کرین بیچنے سے انکار کر دیا تو وہ ناراض ہو کر وطن آ گئے۔ ایئرپورٹ پہ ایک زوردار بیان دیا کہ نقد قیمت ادا کرنے کے باوجود ہمیں جدید ٹکنالوجی سے محروم رکھا جا رہا ہے سارے ملک میں جیسے آگ لگ گئی۔ ہر طرف بحث مباحثے ہونے لگے اور یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ ہمیں اب پہلی کی بجائے دوسری دنیا کی طرف دیکھنا چاہئے۔ نتیجہ یہ بھی تو ان یٹی حکومت مجبور ہو گئی کہ دیسی حکومت سے مذاکرات کرنے کے لئے اپنا نمائندہ تجارت بھیجے۔ دیسی حکومت اگرچہ عوام کو کچھ ایسی گھاس نہیں ڈالتی تھی مگر ایسے معاملے میں وہ رائے عامہ کو نظرانداز نہیں کر سکتی تھی۔ یہ تو قوم کی ناک کا مسئلہ تھا۔ اور اس کی ناک کی ہڈی سابق حکمران کی ناک کی گھوڑی کی طرح اتنی اٹھی ہوئی تھی کہ اس پہ مکھی بیٹھتے ہی پھسل جاتی تھی۔ دراصل آرڈر بہت بڑا تھا بہت سے

ہائیڈرالک، ہیمر، ایکسکے ویٹر، لوڈر، کمپریسر اور ٹریک ڈرلز سے ملا کر مشینوں تک کرڈرڈ کا سامان نکل رہا تھا۔ امیر ملکوں کو بھی زرِ مبادلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ولایتی حکومت کو بادلِ نخواستہ کرین بیچنا پڑے۔ البتہ اس نے معاہدے میں اضافی سامان اور گیجٹوں کا ذکر ہی نہ کیا۔ ننگے بچے کرین فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ دیسی حکومت کے ماہرین کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کرینوں کے ساتھ بھی کچھ ہوتا ہے۔ اس نے یہی کافی سمجھا کہ سفارتی میدان مار لیا۔ اور قوم کا سر کرین کے بازو سے بھی زیادہ بلند کر دیا۔ کرین درآمد ہوئے تو ان کا شاندار استقبال کیا گیا انہوں نے بھی ہاتھی کی طرح چنگھاڑ کر اور سونڈ اٹھا کر جواب دیا۔ انہیں ملک بھر کی سیر کرائی گئی انہوں نے بوجھ اٹھانے کے کرتب دکھا کر لوگوں کا جی خوش کیا۔ پھر ان کے استعمال کیلئے منصوبے مرتب کرنے تک شہر کے باہر کھڑا کر دیا گیا۔ وہیں مقامی ڈرائیوروں نے تربیت پائی مگر تربیت کی تکمیل پہ کوئی تقریب بھی نہ ہوئی۔ ولایتی ماہرین چپ چاپ واپس چلے گئے۔ مقامی ڈرائیور کچھ عرصہ کرینوں کی مزاج پرسی اور جھاڑ پونچھ کے لئے آتے رہے۔ پھر وہ بھی گھر بیٹھے تنخواہ وصول کرنے لگے۔ اس عرصے میں حکمراں کی ناک کی بدھا ٹوٹ گئی۔ اس کی جگہ دوسری ناک نے لے لی۔ اب سنتراں ناک قوم کی عزت بن گئی۔ پکڑ دھکڑ اور جواب طلبی شروع ہوئی تو کرین ڈرائیور اس خوف سے ادھر ادھر ہو گئے کہ کہیں ان سے مفت کی تنخواہ کا حساب نہ مانگ لیا جائے۔ اب کرین یاد آئے تو ان کے ڈرائیوروں کی ڈھنڈیا پڑی۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ایک ڈرائیور پولیس کے ہاتھ لگا۔ اس نے تو بہت ہاتھ پاؤں جوڑے مگر سپاہیوں نے ایک نہ سنی پکڑ کر پھانسی کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا۔

کمیٹی جب ڈرائیور کو لے کر موقع پر پہنچی تو وہاں چھ کی بجائے پانچ کرین پڑے تھے۔ ایک کرین شاید شرم سے زمین میں گڑ گیا تھا یا سارس بن کر اپنے ملک کو واپس سدھار گیا تھا بہرحال کمیٹی کو صرف ایک کرین درکار تھا تعداد سے اسے کیا غرض تھی۔ یہ کسی اور کا کام تھا۔ ڈرائیور نے مختلف کرین جانچے۔ چار تو بس زمین کا بوجھ تھے۔ ایک کا پورا انجن غائب تھا دوسرے

کا پورا پینل۔ دو میں سامان تو پورا معلوم ہوتا تھا مگر زندگی کی کوئی رمق نہ تھی۔ جیلر کو اپنی تجویز طوفان میں ڈولتی ہوئی نظر آئی۔ اس کا پارہ ابھی چڑھ رہا تھا کہ پانچواں کرین ایسے گرگرایا جیسے پہاڑ کے پیٹ میں لاوا اُبلنے لگا ہو۔ کمیٹی کے ارکان الٹے قدموں پیچھے ہٹ گئے صرف جیلر اپنی جگہ پہ جما رہا۔ اس کی مونچھوں کی آڑ میں اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔

پھانسی دینے کا دن مقرر ہوا۔

اس کی اور اس کے ساتھ کرین کی خوب تشہیر ہوئی۔ اخبار والوں نے ہر زاویے سے کرین کی تصویریں چھاپیں۔ ان کے آرٹسٹوں نے پھانسی کے اس انوکھے طریقے کے خیالی خاکے اور نقشے بنائے اور رپورٹروں نے انٹرویو کیے۔ ایڈیٹروں نے ان پر سنسنی خیز سرخیاں جمائیں اور نہایت مدلل مقالے لکھے۔ مقررہ دن جوں جوں قریب آیا، آس پاس کے علاقوں سے بھی لوگ شہر میں جمع ہونے لگے۔ سارے دکانداروں کی بکری بڑھ گئی لیکن دوربینیں بیچنے والوں کی تو چاندی ہو گئی۔ انہوں نے ایک کے دس اور پھر بیس وصول کیے۔ پھر بھی گاہک تھے کہ ٹوٹے پڑتے تھے۔ دوربینوں کی خوب خوب بلیک ہوئی۔ اخبارات میں لوگوں کے جوش و خروش اور غیر معمولی دلچسپی کے قصے پڑھ کر منسٹر نے سرکاری وکیل کی یہ استدعا بھی منظور کر لی کہ خوب دن چڑھ جائے تو مجرم کو پھانسی دی جائے اور پھانسی دینے سے پہلے اسے کالی ٹوپی بھی نہ اوڑھائی جائے۔ کہیں لوگ اس شبے میں نہ پڑ جائیں کہ آدمی کی بجائے اس کا پتلا لٹکا دیا گیا ہے۔ لوگ عموماً کانوں کے کچے ہوتے ہیں اس لیے احتیاط لازم ہے۔ سرکاری وکیل یوں تو دور کی کوڑی لانے والا اور معاوضے کا حق ادا کرنے والا مشہور تھا مگر یہ نکتہ اس کے ذہن سے اتر گیا کہ مجرم کے پاؤں بھی نہ باندھے جائیں تا کہ تماشائی اسے ہوا میں ٹانگیں اچھالتے اور پھر ساکت ہوتے بھی دیکھیں۔

مقررہ وقت پر مکانوں کی چھتیں انسانوں سے لد گئیں۔ شہر میں کوئی اونچی جگہ ایسی نہ تھی جسے تماشائیوں نے گھیر نہ لیا ہو۔ مجرم کے آنے سے پہلے کرین ڈرائیور خوش تھا کہ اس نے

کرین کے رگر ز زمین پر خوب جما دیئے ہیں۔ پینل روشن ہے اور پروگرامنگ مکمل ہے۔ اس کے دل میں بس ایک ہی خواہش تھی کہ کام ختم ہو اور وہ اس اونٹ کو چلا کر جیل سے باہر جائے۔ مجرم کو لایا گیا تو کمیٹی کے ارکان نے اسے غور سے دیکھا وہ ایک دبلا پتلا اور لاغر انسان تھا۔ ایسا لگتا تھا۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا ہے مگر اس کے چہرے پر نہ تشویش کی کوئی جھلک تھی نہ تفتیش کا کوئی نشان تھا۔ وہ چل کے آیا تھا اس لئے زندہ تھا۔ پھر بھی قانون کی تشفی کے لئے ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا۔ مجسٹریٹ نے اس سے ایک دو سوال کئے مگر اس نے حقارت سے منہ پھیر لیا۔ مجسٹریٹ پیچھے ہٹا تو جلاد نے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ دیئے۔ اور اس کے پاؤں جوڑ کر ان کے گرد رسی لپیٹی۔ اس نے مجرم کا سر اور منہ ڈھانپنے کے لئے کالی ٹوپی اٹھائی تو جیلر نے اشارے سے روک دیا۔ اس نے پھانسی کا پھندا جانچا اور نظروں نظروں میں مجرم کی گردن اس طرح ناپی جس طرح مصور اپنے ماڈل کے خطوط کا جائزہ لیتا ہے۔ آخری حکم کے انتظار میں وہ پھندے کو اپنے ہاتھ پر رکھ کر تولنے لگا۔

موقع پر موجود حکام نے اپنی گھڑیاں دیکھیں۔ آپس میں سرگوشی کی اور جلاد کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ مجرم کا سنسان چہرہ دیکھ کر وہ ذرا ٹھٹکا۔ اب تک اس نے صرف کالی ٹوپی کو پھندے پہنائے تھے۔ پھندے میں جیتا جاگتا چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھندا ڈال کر وہ آخری جانچ کئے بغیر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ کرین ڈرائیور کو اشارہ ملا تو اس کے ہاتھ پاؤں جیسے من من بھر کے ہو گئے۔ اس نے کرینوں سے سڑک کوٹنے والے انجن تک اٹھائے تھے مگر کسی انسان کو پھانسی پر نہیں چڑھایا تھا۔ اس نے سر نیچا کر کے انگلیاں چلائیں۔ بوم ایک دو تین کر کے انگشتِ شہادت کی طرح اٹھ گئے ——— ڈیڑھ سو فٹ لمبی انگشتِ شہادت جس کا زاویہ نوے ڈگری کے لگ بھگ تھا۔ اس نے چور نظروں سے اوپر دیکھا مگر پینل کی وارننگ لائٹ نے اس کی توجہ جذب کر لی۔ اس نے کرین کے بازو کو ہلانے اور ذرا جھکانے کی کوشش کی تو سرخ بتی کے جلنے بجھنے کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ جیل کی

مختلف چھتوں پر مسلح سپاہی کھڑے تھے۔ احاطوں میں بند قیدیوں کی آوازیں عجیب سی گونج پیدا کر رہی تھیں۔ ایئر کنڈیشنر بند ہو گیا تھا۔ اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ اس نے کئی بٹن چھیڑے مگر وہ تو سارے سبق بھول گیا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ دریا کی لہریں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے سامنے جیل کا دالان پانی میں ڈوب رہا تھا۔

کرین کا بازو جب جیل کی دیوار سے اوپر اٹھا تو ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ کئی لوگوں نے نعرے لگائے۔ بعض دعائیں بڑبڑانے لگے۔ کچھ منتر الاپنے لگے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے سینوں پر صلیب کے نشان تان رہے تھے جن کے پاس دوربینیں تھیں وہ آس پاس کے لوگوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے رواں تبصرہ کرنے لگے۔ وہ مبالغے سے بھی کام لے رہے تھے۔ پھر بھی ان کے پاس کہنے کو بہت کم تھا۔ وہ اپنی دہرائی ہوئی باتیں ہی دہرا رہے تھے۔ ایک صاحب سخت پریشان تھے۔ ان کے بچے کو شاید عینک کی ضرورت تھی اسے کرین پہ لٹکا ہوا آدمی دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا اور وہ اشارے کر کر کے اسے آدمی دکھانے کی اس طرح کوشش کر رہے تھے جیسے ہلالِ عید کی نشاندہی کر رہے ہوں۔ لوگ شاید وہی بن جاتے ہیں جو انہیں کھلایا پلایا جاتا ہے۔

شہر میں صرف ایک جگہ ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ کسی گرہ کٹ نے تماشائیوں کی محویت سے فائدہ اٹھایا اور کئی جیبیں تراش کر رفو چکر ہو گیا۔ ایک شخص نے رومال نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو وہ بلا روک ٹوک باہر نکل گیا۔ وہ چیخا:

"میری جیب!"

یہ سنتے ہی آس پاس کے سارے ہاتھ جیبوں میں اترے اور بہت سی زبانیں پکاریں

"میری جیب!" "میں لٹ گیا" "دوڑو۔ پکڑو۔"

جن کی جیب بچ گئی تھی وہ ایک طرف ہٹ گئے۔ جن کی کٹ گئی تھی وہ جس طرف منہ تھا اس طرف چند قدم بھاگے۔ پھر پلٹ کر اس جگہ پہ آ گئے جہاں کھڑے تھے اور پھر

دوسری جانب بھاگے۔ ذرا دور سے لوگوں کو بہت سے سر لٹکاتے نظر آئے تو ان کے لئے فضا میں معلق شخص سیمنٹ کی بوری بن گیا۔

اس علاقے میں اکثر لوگ تماشا دیکھنے کے لئے بھاگے۔ دھکم پیل میں دو آدمی آپس میں الجھ پڑے۔ دو سے چار ہوئے اور چار سے بے شمار۔ ہنگامے اور ہلے گلے کے شور نے پولیس کو متوجہ کیا۔ اس کے سپاہی گالیاں بکتے، ڈنڈے سونتے تماشائیوں کی طرف اس طرح لپکے جیسے کسان اپنے ہرے بھرے کھیتوں سے پرائے گدھے بھگانے آتا ہے۔ پولیس کی کاروائی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ لوگ ایکدوسرے کو بھول کر پولیس کے سپاہیوں پر پل پڑے۔ افسروں نے جب دیکھا کہ اب ڈنڈے پولیس والوں کی بجائے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں تو انہوں نے آنسو گیس کے بم گولے چلانے کا کام لیا۔ بیشتر لوگ آنکھیں ملتے، کھانستے، کھنکارتے گیس کے غبار میں سے بھاگ گئے۔ جو بھاگ نہ سکے، وہ آنسو بہاتے پکڑے گئے اور جو زخمی ہو گئے، وہ ایمبولینسوں کے ذریعے ہسپتالوں میں پہنچوا دیئے گئے۔ افراتفری میں کسی نے یہ بھی نہ دیکھا کہ ایک بچہ تیسری منزل سے گر کر خون میں لت پت پڑا ہے۔ اس نے چھوٹے بھائی کو گردن سے پکڑ کر اسی طرح اٹھانے کی کوشش کی تھی جس طرح کرین نے آدمی کو اٹھایا تھا۔ چھوٹے نے تڑپ کر اپنی گردن چھڑائی اور بڑے کو دھکا دیا۔ وہ اس اچانک حملے کے لئے تیار نہیں تھا اس کا پاؤں پھسلا اور منڈیر کو پکڑتے پکڑتے نیچے لڑھک گیا۔ ایک نحیف سی چیخ اسکے ساتھ گئی مگر اس کے سر اور منہ سے ابلتا ہوا خون دیکھ کر وحشت زدہ ہو گئی۔

یہ تو باہر کے معاملات تھے۔ اصل مسئلہ تو جیل کے اندر اٹکا ہوا تھا۔ آدھا گھنٹہ گزر جانے کے باوجود ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پر بھی مجرم زندہ تھا۔ نہ اس کی گردن ٹوٹی تھی اور نہ اس کا دم ہی گھٹتا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ وقفے وقفے سے انہیں جھپک کر زندگی کا اعلان کر رہا تھا۔ دوربین سے جو افسر اس کا چہرہ دیکھتا گھبرا کر اپنی آنکھوں سے دوربین جھٹک دیتا۔ جیلر پہلے سخت حیران ہوا، پھر پریشان ہوا اور پھر قہر آلود نظروں سے

بوڑھے جلاد کو جھنجھوڑنے لگا۔ کچھ وقت اور گزرا تو اس نے ساری صورت حال کا جائزہ لیا اور بھوکے بھیڑیے کی طرح جلاد پر ٹوٹ پڑا:

"تمہاری عمر گزر گئی حرامزادے پھانسی کے پھندے بناتے پھر بھی صحیح گانٹھ لگانی نہ آئی....."

دو گھونسے برسے تو بوڑھا جلاد ہاتھ جوڑ کر زرد پتے کی طرح کانپنے لگا۔ مجسٹریٹ اور جیل کا نوجوان افسر جیلر کو بازوؤں سے تھام کر ایک طرف لے گئے۔ سمجھا بجھا کر اسے ذرا نرم کیا۔ اصل مشکل جوں کی توں تھی۔ مجرم کسی طرح مر ہی نہیں رہا تھا۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ اسے نیچے اتار کر سیدھے سیدھے پھانسی گھر لے چلو۔ مجسٹریٹ نے یہ کہہ کر تجویز کاٹ دی کہ جیل کا سارا عملہ اور قیدی اور جیل کے باہر پورا شہر دیکھ رہا ہے۔ بات کھل گئی تو ہماری خیر نہیں کسی کو دوبارہ پھانسی نہیں دی جا سکتی۔ سب نے سر اٹھا کر پھر مجرم کو دیکھا۔ وہ چیل کی طرح گردن جھکائے سب کو دیکھ رہا تھا۔ سارے شہر میں شاید وہی ایک تماشائی تھا۔ باقی سب لوگ تماشا تھے۔

نوجوان افسر پھر جیلر کی مدد کو پہنچا:

"کرین ڈرائیور سے کہیے دو چار جھٹکے دے مجرم کی گردن کا منکا ڈھلک جائے گا۔"

جیلر نے پلٹ کر اسے حیرت سے دیکھا اور بھاگ کر ڈرائیونگ کیبن تک اتنی تیزی سے پہنچ گیا جیسے اس کے دھڑ میں بندر کے ہاتھ پاؤں لگ گئے ہوں۔ کرین ڈرائیور کی حالت پہلے ہی غیر تھی۔ جیلر کو یوں اچھلتے پھاندتے دیکھ کر اس کی ہتھیلیاں بھی پسینے سے بھیگ گئیں جیلر نے کیبن کا شیشہ کھٹکھٹایا۔ ڈرائیور نے نصف شیشہ اتارا۔ اس نے ڈرائیور کا کندھا چھوا تو ایک جسم کی کپکپی دوسرے جسم میں سرایت کر گئی۔ جیلر نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا اور ذرا سنبھل کر کہا:

"بیٹے۔ بس دو چار منٹ کی بات ہے۔ تم کرین کے بازو کو دو تین جھٹکے دو اور پھر ہمارے

ساتھ چل کے دفتر میں چائے پیو"۔

ڈرائیور بوا۔ بس ہنمنایا: "کرین تو مر گیا ہے"!

جیلر نے اسے یقین دلایا۔ "کہاں بیٹے! کمبخت ابھی تک نہیں مرا۔" اس کے ذہن میں جھٹکا سا لگا۔ ڈرائیور نے تو کچھ اور کہا تھا۔ "کیا کہا!"

"کرین کا بازو جام ہو گیا ہے۔ اس کا گیئر جل گیا ہے۔ اس کا انجن بیٹھ گیا ہے۔ اس کے رگ و ریشے پھنس گئے ہیں۔ اسے گھسیٹ کر بھی جیل سے باہر لے جانا مشکل ہے۔"

"کیا بک رہے ہو۔ کچھ کرو۔" جیلر ہنکارا۔

"میں گھنٹہ بھر میں سب کچھ کر چکا ہوں۔ کچھ نہیں ہو سکتا"۔ ڈرائیور نے جیلر کے تیور دیکھ کر شیشہ چڑھا لیا۔

"کچھ نہیں ہو سکتا کے بچے"۔ جیلر نے جھٹکا دے کر دروازہ کھولا۔ کیبن اتنا چھوٹا تھا کہ تھپڑ بھی نہیں مارا جا سکتا تھا۔ صرف دانتوں سے کاٹا جا سکتا تھا۔ جیلر دانت کچکچا کر کیبن میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے دوسرا دروازہ کھولا اور دہشت زدہ ہرن کی طرح چھلانگ ماری۔ کیبن کے دونوں دروازے بند ہو گئے۔ ڈرائیور نے دیکھا کہ جیلر انہیں کھولنے کے لئے اب ان سے لڑ رہا ہے۔ اس نے نیچے کھڑے ہوئے افسروں کو سلام کر کے کہا:

"ابھی بلا کے لاتا ہوں"

اور بھاگتا ہوا ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔ سارے افسر کیبن میں محبوس جیلر کی حرکتیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ڈرائیور کو صرف اترتے ہوئے دیکھا تھا۔

جیلر نے بڑی جد و جہد کے بعد دروازہ کھولا۔ کیبن میں تو اس کی سانس ہی بند ہو چلی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ نیچے اتر کر اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا۔ یہ چند لمحے اس کے چہرے پر برسوں کی راکھ جھاڑ گئے تھے۔

"کرین مر گیا ہے"۔ اس کی آواز اس کے حلق میں جم گئی تھی۔

سب کو حقیقت معلوم ہوئی تو وہ جیلر کے دفتر میں جمع ہو گئے۔ سب کے چہروں پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ ایکا ایکی نا سمجھ ہو گئے تھے۔ صرف نائب جیلر کچھ ایسا پریشان نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے اکتا کر بات چھیڑی:

"جب کرین کا بازو اٹھ رہا تھا تو مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ نہ پھندا ٹھیک لگا ہے اور نہ گانٹھ۔ تختہ کھلتے ہی جب مجرم پھانسی گھر میں گرتے ہیں تو چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کی طرح تڑپتے پھڑکتے اور الٹتے پلٹتے ہیں۔ وہ تو اس طرح سکون سے اوپر چڑھ گیا جیسے معائنہ کرنے جا رہا ہو۔ یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار انسان دیکھے ہوں"۔

"ممکن ہے زمین پر ہی دہشت سے مر گیا ہو"۔ نوجوان افسر نے جیلر کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔

"وہ کمبخت تو اس وقت بھی زندہ ہے۔ کھڑکی میں سے جھانک کے دیکھ لو نا"۔ نائب جیلر نے اطمینان سے جیلر کے سر پہ ٹھنڈے پانی کی ایک اور بالٹی انڈیل دی۔

"ایک ترکیب ہے۔ اسے کیوں نہ گولی مار دی جائے"۔ نوجوان افسر کو رہ رہ کر جیلر پہ ترس آ رہا تھا۔

"اسے گولی مار دیا توپ سے اڑا دو۔ اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ مجرم کو لوہے کی اس لاٹھ سے نیچے کیسے اتارا جائے"۔ نائب جیلر کی گفتگو بڑی ہموار تھی۔

سب لوگ ان دونوں کی باتیں سن بھی رہے تھے اور نہیں بھی سن رہے تھے۔

"اس وقت اگر آندھی آ جائے تو مجرم کو دو چار جھٹکے لگیں گے اور وہ جھول کر ہی مر جائے گا"۔ سب نے نوجوان افسر کی خواہش کی تلاش میں کھڑکی سے باہر دیکھا۔ افق چمک رہا تھا۔ گرد کا کہیں نشان نہیں تھا۔ ہوا مزے سے ٹہل رہی تھی۔ مجرم سے کچھ فاصلے پر کچھ پرندے ہوا میں تیر رہے تھے۔ وہ شاید یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ آدمی ان کے محفوظ علاقے میں کیسے پہنچ گیا؟ اتنی دیر سے کھڑا کیا کر رہا ہے! وہ اتنا بے ضرر کیوں ہے! وہ اس میں بھی

کوئی دھوکا دیکھتے تھے۔ دور ہی سے پر مار کر رُخ بدل لیتے تھے۔ مختلف احاطوں میں بندقیدیوں کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔

"لاش کو نیچے اتار دو"

کمرے کا سایہ گھٹ کر کھلونا بن گیا تھا۔

"اگر لوگوں کو پتہ چل گیا تو مجرم دو ڈھائی گھنٹے سے ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی پہ گلے میں پھندا ڈالے زندہ ہے تو اسے ایک کرامت کہیں گے اور اسے پیر فقیر مان لیں گے۔ پھر ہم لوگوں کی خیر نہیں ہوگی"۔ نائب جیلر نے خاموش کمرے میں ایک اور شوشہ چھوڑا۔ اس مرتبہ صرف جیلر نے زخمی کبوتر کی نظروں سے نہیں دیکھا، کئی ترائی ہوئی آنکھیں بھی اس پہ حملہ آور ہوئیں اور وہ کرسی کے بازوؤں میں سمٹ گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ کمرے میں افسر یوں اچھلے جیسے کرین چل پڑا ہو۔ انکے اندر کے سارے سپرنگ ایکساتھ کھل گئے۔ جواب کا انتظار کئے بغیر سرکاری وکیل اپنے نائب کے ساتھ ہوا کا جھونکا بن کر اندر داخل ہوا۔ اس کی خاطر ساری کرسیاں خالی ہو گئیں۔ وہ اپنی پریشانی چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا:

"یہ لوگ بھی عجیب ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے جس آدمی کے سولی پہ لٹکنے کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اب اس کی لاش کی عزت کے نام پر بپھر رہے ہیں۔ کہتے ہیں لاش خدا اور زمین کی امانت ہوتی ہے۔ اسے اتار دو۔ جیل سے دو تین فرلانگ پر بھی چار سو آدمی جمع ہیں۔ پولیس نے انہیں گھیرے میں لے رکھا ہے۔ میں نے تو انہیں دیکھتے ہی کوٹ اتار کر نیچے ڈال دیا تھا۔ بھائی کیا خبر وہ کالا کوٹ دیکھ کر مجھے منصف سمجھ لیتے اور پتھر مارتے"۔ وکیل نے کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے اپنا ذہن ہلکا کر لیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا تمام کرسیوں کی گود خالی تھی۔ حاضرین کرین کے بازو کی طرح اکڑے کھڑے تھے۔ اس نے کہا: "آپ لوگ بیٹھتے کیوں نہیں۔"

سب نے بڑھ کر کرسیاں یوں پکڑیں جیسے ابھی بھاگ کھڑی ہوں گی۔ سرکاری وکیل کو جانے پہچانے چہرے اجنبی اجنبی سے لگ رہے تھے۔

"وزیرِ داخلہ اور دوسرے تمام افسر اور منصف صاحب آپ لوگوں سے بہت خوش ہیں۔" سرکاری وکیل نے کمرے کا ماحول تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ "انہوں نے مجھے آپ سبکو مبارکباد کہنے کو بھیجا ہے۔ ساتھ ہی حکم دیا ہے کہ اب لاش اتار لی جائے۔"

جیلر تو اندر ہی اندر گھلا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن کے پردوں پر کبھی وزیرِ داخلہ کا چہرہ اور اس میں جڑی ہوئی پتھر کی آنکھیں گھومتیں اور کبھی فرغل میں لپٹے ہوئے منصف کا ڈراؤنا ہیولا! کبھی دونوں تصویریں آپس میں گڈمڈ ہو جاتیں کہ ایک کے چار ہاتھ لگتے جو اسے گرفت میں لینے کے لئے پھیل رہے ہیں۔ دوسرے افسروں کے حلق بھی خشک اور زبانیں جیسے اکڑ گئی تھیں۔ سرکاری وکیل نے سب کی صورتوں کا بغور مطالعہ کیا:

"آپ لوگ بھی شاید یہ انوکھی پھانسی دیکھ کر پریشان ہو گئے۔" سرکاری وکیل کا گلا اب صاف ہو چکا تھا۔ "واقعی ڈراؤنا منظر تھا۔ سنا ہے بے شمار عورتیں چیخیں مار کر بے ہوش ہو گئیں۔ کئی کمزور دل مرد بھی زرد پڑ کے گر گئے۔ ہم نے پہلے ہی سے شہر بھر میں ایمبولنس پھیلا دی تھیں۔ ہمارا مقصد پورا ہو گیا۔ یہ لوگ ڈنڈے کے مرید ہیں اسی طرح ٹھیک ہو سکتے ہیں اب کچھ روز آرام رہے گا۔ آپ لاش اتارنے کا حکم دیں۔"

نوجوان افسر نے ذرا سی جرأت دکھائی اور ہکلاتے ہوئے کہا: "وہ لاش نہیں ہے۔ مجرم ابھی زندہ ہے"۔

"کیا عجیب بات کرتے ہو! ڈاکٹر نے لاش کا معائنہ کیا ہے؟"

"ڈاکٹر کو مجرم تک کیسے پہنچایا جائے۔"

"لاش کو نیچے اتار کر۔"

"مگر کرین تو مر گیا ہے یعنی جل گیا ہے۔ اس کا بازو جام ہو گیا ہے"۔

"ڈرائیور کو بلاؤ۔"

"وہ بھاگ گیا ہے۔"

"جیل سے بھاگ گیا ہے؟"

"وہ کسی ماہر کو بلانے کے بہانے چلا گیا۔"

"تم نے کسی ولایتی ماہر کا پتہ چلایا؟"

"وہ سب شیطان تو پہلے ہی فرار ہوگئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ ہمارے ہاتھ کیا کوڑا کرکٹ بیچتے رہے ہیں۔ دیکھئے نا، ان کا جدید ترین کرین ایک مریل سے آدمی کو پھانسی دینے کے کام بھی نہیں آسکتا۔"

سرکاری وکیل کو اچانک اندازہ ہوا کہ معاملہ کس قدر نازک ہے۔

"پھر یہ لاش کب تک فضا میں جھنڈا بنی رہے گی؟ کچھ سوچو۔"

"سوچتے سوچتے ہمارے دماغ تو ماؤف ہو گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے سب کچھ غلط تھا، سب کچھ غلط ہوگیا۔" نوجوان افسر خود ہی اپنے سینیئر افسروں کا ترجمان بن گیا۔

سرکاری وکیل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسے حسبِ ضرورت اپنے چہرے کا رنگ اور اپنے تیور تبدیل کرنے میں مہارت حاصل تھی۔

"مجھے یہ سب سازش معلوم ہوتی ہے۔ تم لوگ یا تم میں سے کچھ لوگ مجرموں کے ساتھی معلوم ہوتے ہو ورنہ ایسی حرکت نہیں ہو سکتی تھی۔" اس نے سانپ کی طرح اچھل کر وار کیا سب نے تھوڑی دیر کو یوں محسوس کیا جیسے ان کے جسم نیلے پڑ گئے ہوں۔

"کرین ہم نے تو نہیں بنائی۔" جیلر کا ساؤنڈ باکس بھی پسینے میں بھیگ چکا تھا۔

نوجوان افسر کو اس کی حالت پر ترس آرہا تھا۔ وہ چمک کر بولا: "کرین سے پھانسی دینے اور جیل کے قواعد بدلنے کی اجازت تو آپ نے لے کر دی ہے جناب۔ آپ بھی اس سازش میں شریک ہیں۔"

"حکومت"۔ ایک چھوکرے کا یوں منہ آنا سرکاری وکیل کو بہت برا لگا۔ "تم ہو کیا چیز"
"میں بھی اس جیل کا افسر ہوں مگر جونیئر سا۔ اور دوسروں کی طرح اس سازش میں شریک ہوں....."

سب کو اس نوجوان افسر کی جرأت پہ رشک آرہا تھا۔ ان کے اعصاب بھی ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ ان کی ذمہ داری بٹتی جا رہی تھی۔ اب وہ تنہا اس مصیبت میں مبتلا نہیں تھے
سرکاری وکیل نے نوجوان افسر کو گھورا۔ مگر جب اس نے آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں تو وکیل نے طرح دے جانا ہی مناسب جانا۔ کرسی سے اٹھا۔ اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ کھڑکی اور سورج کے درمیان کرنوں کی سونٹ تھی اور اس کے ساتھ چپکا ہوا مقناطیسی آدمی!

سورج کی تیز کرنیں اس کی آنکھیں چیرنے لگیں تو اس کی پلکیں خود بخود جھک گئیں۔ بند آنکھوں میں رنگوں کا غبار بھر گیا۔ اس میں افق تا افق رنگ برنگے کرن بار دا اٹھائے کھڑے تھے ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک آدمی چپکا ہوا تھا۔ جو آہستہ آہستہ کھل کر جھنڈا بنتا جا رہا تھا۔ جھنڈوں کی قطار لمبی ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ہلکی ہوا میں سرسرانے لگ گئے تھے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا" اس نے پہلی بار کوئی جملہ بنا سوچے سمجھے کہا تھا اور اس کے ساتھ ہی گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ سورج کی کرنوں نے پھر وار کیا تو اس نے منہ پھیر کر کھڑکی کے پٹ بھیڑ دیئے۔

"کچھ کرو۔ کچھ سوچو۔ حکومت تو بعد میں کوئی کارروائی کرے گی۔ لوگ لاش کی عزت کی خاطر پہلے ہی ہماری تکہ بوٹی کر دیں گے۔ سن نہیں رہے۔ ہجوم کے نعروں میں نئی نئی آوازیں تیزی سے شامل ہو رہی ہیں۔ قیدی بھی جنگلے توڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جلدی کچھ کرو۔"
سرکاری وکیل کی آواز میں اب التجا تھی۔

"ہم تو سب کچھ کہہ چکے۔ آپ ہی کچھ بتلایئے۔" بڑی دیر بعد جیلر کی صاف آواز سنائی دی شاید اسے سرکاری وکیل بھی اپنا قیدی معلوم ہوا تھا۔

"کریبن کا بازو کاٹ دو۔" سرکاری وکیل کے چہرے پر ذرا سی رونق آئی۔

"مگر اس میں تو وقت لگے گا۔" حاضرین کا حوصلہ بڑھ رہا تھا۔

"میں ایک گھنٹے کی مہلت لے دوں گا۔"

"مگر کریبن کا بازو تو منوں وزنی ہے۔ وہ کٹے گا تو قیدیوں کے احاطے اور جیل کی دیواریں توڑ ڈالے گا۔" نوجوان افسر نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ٹوٹنے دو۔"

"کئی قیدی مر جائیں گے۔ بہت سے فرار ہو جائیں گے۔" جیلر نے تشویش ظاہر کی۔

"مرنے دو۔ فرار ہونے دو۔"

"کریبن کا بازو نہ کٹا تو؟"

"پورا کریبن توڑ دو۔ سارا جیل ڈھا دو مگر یہ پھندا گراؤ۔ سن لیا تم نے۔" یہ کہتے ہوئے سرکاری وکیل کرسی سے ٹکرایا۔ کرسی لڑھک گئی۔ اس کے نائب نے ٹھوکر سے کرسی ہٹائی اور دروازہ کھولا۔ وہ سب کو حیرت میں ڈوبتا چھوڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

خالدہ حسین

عہد نامہ

شروع شروع میں مجھے اس گدلے پانی اور کائی جمی پھسلنی دیواروں سے کچھ وحشت ہوتی تھی۔ ہاں! مجھے یاد ہے۔ سانس لیتے ہوئے ہوا میں ایک عجیب سی بساند بھی آتی تھی۔ میں اپنے جسم کو ہر دم سکیڑ کر رکھتا تھا۔ نہیں چاہتا تھا کہ اس گدلے پانی اور کائی میں لت پت ہوں۔ مجھے تو ان کا چھو جانا بھی اچھا نہ لگتا تھا۔ چنانچہ دن رات اپنے آپ کو سکیڑ سکیڑ کر میرا تمام جسم — اس کی ایک ایک نس ٹوٹنے کے قریب تھی۔ یوں جیسے کسی چیز کو دونوں کناروں سے پکڑ کر آخری حد تک کھینچا جائے اور بس اب وہ تڑخنے کے قریب ہو۔

مگر کچھ ہی عرصہ بعد مجھے ایک عجیب و غریب حقیقت کا احساس ہوا۔ میرے اس طرح سکڑنے، ہر دم تشنج میں رہنے سے گدلے پانی اور کائی جمی پھسلنی دیواروں میں کچھ بھی تبدیلی نہ آئی تھی۔ گدلے پانی کا بھی پھیلاؤ وہی تھا، پھسلنی دیواروں پر جمی تہہ دار کائی کے اطمینان میں بھی کچھ فرق نہ آیا تھا۔ پانی نے بھی یہ نہ جانا تھا کہ میں اس سے احتراز کرتا ہوں تو وہ ذرا پرے ہٹ جائے اور نہ ہی موٹی کائی اپنی جگہ سے سرکی تھی۔ وہ تو صرف میں ہی تھا کہ ہر دم ان سے بچنے کی کوشش میں اور بھی آلودہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

ہارے ایک دن ہمت کر کے، تجربے کے طور پر، میں نے اپنے جسم کے ایک ایک حصے کو ڈھیلا، پُرسکون چھوڑنا شروع کیا۔ سب سے پہلے میں نے

اپنے پیٹ کے پٹھے ڈھیلے چھوڑے ۔ یک دم ایک عجب آسائش اور کشادگی کا احساس مجھے ہوا۔ ایسی آسائش جو میں بھول چکا تھا۔ مگر پھر بھی یہ کیفیت بڑی جانی پہچانی، مانوس تھی ۔ میں نے دیکھا کہ پیٹ کو یوں ڈھیلا چھوڑنے پر نہ تو میرا جسم بڑھا اور نہ ہی گدلا پانی اور تہہ دار کائی مجھ سے لپٹے ۔ میرا جسم بھی اتنی ہی جگہ گھیرتا رہا جتنی کہ پہلے گھیرتا تھا۔ پانی اور کائی بھی اپنی اپنی جگہ پر تھے ۔ پھر میں نے یکے بعد دیگرے اپنے بازوؤں، ٹانگوں، گردن اور چہرے کے پٹھے ڈھیلے چھوڑ دیئے اور بالآخر اپنی آنکھوں کو بھی سکڑنے کے اس مسلسل عمل سے نجات دی۔

اب مجھے حیرت ہوئی کہ جب اپنے وجود کو غیر وجود سے بچانے کی کوشش ختم کر دی جائے تو پھیلاؤ کی ایک مخصوص طمانیت حاصل ہوتی ہے ۔ جس طرح ہر چیز اپنی اصلی حالت میں آکر مطمئن ہو جائے ۔ گدلا پانی اور کائی اب گویا میرے جسم کا حصہ بن چکے تھے ۔ وہ مجھ سے الگ نہ تھے ۔ اب میں خوب ہاتھ پاؤں پھیلا کر بے وزنی کی کیفیت میں آنکھیں موندے لیٹا رہتا اور بھول گیا کہ اس سے پہلے میں کیا تھا، کب، کہاں سے، کس طرح آیا اور اس آلودگی کا حصہ بن گیا ۔

مگر یہ بھی درست نہیں کہ میں واقعی وہ سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ جب بھی اس کائی بھرے دبیز پانی کی گود میں پوری آسائش کے ساتھ پڑا ہوتا تو خود بخود روشنی کے جلتے بجھتے دائرے کہیں میری آنکھوں کے پیچھے پھسلنا شروع کر دیتے ۔ ایک کے ساتھ ایک ۔ پھر یہ دگنے چوگنے ہو کر میرے تمام وجود کو گھیر لیتے اور مجھے یوں لگتا کہ جیسے زمین میں اگے کنوئیں میں نہیں بلکہ دھوپ بھرے، ہرے کھیتوں میں کھلتی سرسوں کے درمیان سانس لیتا ہوں اور سنہری دھوپ میرے مساموں میں سونا بھرتی ہے جبکہ آس پاس نیم، پیپل اور شہتوت کے اونچے گھنے درخت چھتر چھاؤں کئے کھڑے ہیں ۔

اور اس زمین کے ساتھ ساتھ ایک کھُلے وسیع آسمان کے کنارے آن ملتے ہیں اور یہ سب کچھ مل کر اتنا لامحدود اور لاانتہا ہے کہ کہیں بھی کسی بھی چیز کی کوئی حد نہیں۔ چنانچہ ایسے میں اپنے آپ کو بھی میں لامحدود پاتا۔ اور مجھے اپنی وہ بہت سی صورتیں اور حالتیں یاد آجاتیں جو شاید میں نے کبھی خواب میں دیکھی تھیں۔ مگر یہ صورتیں ایک دوسرے میں گھُل مِل کر اس طرح بے معنی ہو جاتیں کہ سوائے ایک ہلتے، مچلتے سیال مادے کے، کچھ بھی مجھے یاد نہ رہتا ــ بہت سی باتیں، آوازیں، تصویریں یاد آتے آتے رہ جاتیں اور ایسے ہی میں ایک دم مجھے کائی کی نرم موٹی تہہ اپنی کمر پر محسوس ہوتی اور میں جاگ جاتا اور اپنے آپ کو یاد دلاتا کہ میں اس کنوئیں میں ہوں۔ باہر سنہری دھوپ اور لیسنی کھیتوں میں نہیں اور یہ جان کر مجھے عجب تحفّظ کا احساس ہوتا۔ ایک ڈبکی لگا کر میں اور بھی نیچے جا کر دوسری نیند کے لیے تیار ہو جاتا۔

مگر ایک روز میں طویل ڈبکی کے بعد ایک نئی نیند کی تیاری میں تھا کہ ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا۔ کوئی چیز اپنے پورے حجم اور رفتار کے ساتھ گری اور مجھ سے کچھ دور بہتی چلی گئی۔ میں حیران رہ گیا۔ میرا خیال ــ بلکہ مجھے یقین تھا کہ وہاں آس پاس کوئی درخت بھی نہیں کہ کوئی بھولا بھٹکا پھل ہی اِدھر آن گرے۔ نہ ہی اس سناٹے میں بچے اِدھر آتے جاتے تھے کہ پتھر پھینک کر کنوئیں کی سطح میں گول گول دائرے بنتے دیکھتے۔ اور غنودگی میں یوں بھی میں اس گرنے والی چیز کو نہ دیکھ پایا پایا تھا۔ میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی۔

تب اچانک اوپر سے کسی کے رونے، سسکیاں بھرنے کی آواز آئی۔ کوئی جی توڑ کر رو رہا تھا۔ میں نے ایک عرصے سے کوئی آواز نہیں سُنی تھی۔ اس آواز پر روشنی کے گول گول، رنگ برنگ چکر میری آنکھوں میں گھومنے لگے، اور مجھے بہت سے کھیت اور اُن میں جھکتی سنہری فصلیں اور بے تحاشا ہنستے گول مٹول بچے یاد آ گئے۔ مگر یہ تصویر بہت دُھندلی تھی

جس طرح کیمرے کا فوکس خراب ہو۔

یہ سسکیاں مسلسل بڑھتی جا رہی تھیں۔ بالآخر مجھے اپنی سطح سے اُٹھ کر کچھ اوپر جانا پڑا۔ میں نے اوپر نگاہ کی۔ ایک خوبصورت چہرہ منڈیر سے نیچے جھانک رہا تھا۔ اتنی دوری پر بھی آنسوؤں سے چمکتی آنکھیں مجھے اپنی جلد پر ٹھنڈک بھینکتی محسوس ہوئیں۔ لمبے لمبے سنہری بال منڈیر پر سے نیچے گر رہے تھے، پھر دو گوری باہیں ہاتھ پھیلا کر نیچے اُترنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"آہ میری گیند!" اب سسکی کے ساتھ جسمانی اذیت بھی شامل تھی کہ وہ باہیں اپنی وسعت سے بہت آگے نکلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اچھا! اب میری سمجھ میں آگیا، تو وہ اپنے پورے حجم اور رفتار کے ساتھ گرنے والی چیز بھی گیند ہی تھی۔ مگر پھر مجھے حیرت ہوئی کہ اس ویرانے اور سناٹے میں کوئی اپنی عزیز شے لے کر آیا ہی کیوں؟ اس اثناء میں سنہری بال قدرے اور بھی منڈیر سے نیچے جھک آئے تھے اور اُن کی چمک سے چاروں سمت کائی خوردہ دیواروں کی بدصورتی اور بھی نمایاں ہو گئی تھی۔ ان بالوں کی چکاچوند میں میری آنکھیں مُندنے لگیں۔ وہ گیند کس زاویے، کس رُخ سے کہاں گری تھی، میں سب اچھی طرح جانتا تھا۔ بس ایک غوطے کی دیر تھی اور وہ اس کی مالک تک پہنچ سکتی تھی۔ مگر کیوں، آخر کس لیئے؟ میں سوچ میں پڑ گیا۔

آخر میں اپنی اس آسودہ غنودگی کو توڑ کر غوطہ کیوں لگاؤں۔ حالانکہ سچی بات تو یہ ہے کہ غوطہ زنی میں مجھے ذرا سی بھی جسمانی کاوش کرنا پڑتی اور نہ ہی میری نیند میں کوئی خلل آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کتاب میں ایک ایسی نیند سونے کا ماہر ہو چکا تھا جس میں ہر کام سرانجام دیا جا سکتا تھا۔ تو گرنے والی چیز کی بازیابی میرے لیے کوئی مسئلہ نہ تھی مگر سوال یہ تھا کہ آخر کس لیے؟

یہ ٹھیک ہے کہ اوپر لی جانے والی سسکیوں میں شدید اذیت اور بے بسی

کا احساس تھا مگر یہ بھی تو ممکن تھا کہ میں یہاں نہ ہوتا اور یہ سسکیاں نہ سُنی جاتیں، اور وہ گرتی چیز نہ دیکھی جاتی تو پھر اس صورت میں کیا ہوتا۔ یقیناً یہ خوبصورت چہرہ اپنے سنہری بالوں اور چمکتی آنکھوں اور گوری بانہوں سمیت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے، ابد تک، اس منڈیر پر اُمڈا رہتا اور بانہیں کچھ حاصل کرنے کو تڑپتی رہتیں اور ان کو اس طرح تڑپتے دیکھنے والا کوئی بھی نہ ہوتا۔

اب مجھے اپنی اس حرکت پر شرمندگی ہوتی ہے۔ مگر اس وقت میرا جی شدت سے چاہا کہ اذیت کے اس پیکر کو ذرا قریب سے دیکھوں۔ یقیناً یہ ایک نہایت ہی موربڈ احساس تھا۔ مگر ایک ایسا احساس جو مدتوں بعد خود بخود، انتہائی فطری طور پر میرے دل میں اُٹھا تھا اور جس پر میں نے بلا کسی تردّد کے عمل کیا۔

نیچے جانے کے بجائے میں نے اوپر کی جانب جست لگائی۔ اس وقت مدتوں بعد مجھے احساس ہوا کہ اس طرح جست لگانے میں میری پچھلی ٹانگیں کھل کر کیسی بے ہنگم ہو جاتی ہیں اور میرے دھبوں بھرے مٹیالے جسم پر مزید مٹیالی اور ہری کائی جمی ہے اور اس کا نظارہ ہی دیکھنے والے کے جسم میں جھرجھری پیدا کر سکتا ہے مگر اوپر پانی کے کنارے پہنچکر میں نے نہایت اطمینان کے ساتھ پھسلنی دیوار کی ایک درز میں اپنے پاؤں گاڑ دیئے اور اوپر دیکھا۔

کتنا خوبصورت چہرہ تھا۔ مجھے نیند سی آگئی جیسے بھری سردیوں میں کھلتی دھوپ کنوئیں کی تہہ تک اتر آئی ہو۔ ان آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی، ایک گیند کے گر جانے پر اتنا واویلا۔

"آہ، میری گیند!" پھر ایک فغاں۔ اب کے مجھے سخت طیش آگیا۔ عجیب بے وقوف لڑکی ہے۔ میں نے سوچا۔

"تم دوسری گیند بھی تو لے سکتی ہو!" تنگ آکر میں نے کہا۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ میں بولنا بھول چکا ہوں۔ ایک طول طویل عرصہ سے میں نے کسی سے بات نہیں کی تھی۔ اور لفظ بھی پودوں کی مانند ہیں کہ انہیں

سانس کی گرمی اور نمی نہ ملے تو مر جاتے ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ اب جو کچھ میرے منہ سے نکلا اُس تک پہنچ گیا۔

"نہیں، دوسری نہیں، مجھے وہی چاہیئے، صرف وہی" وہ اور بھی نیچے لٹک آئی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ خود بھی اس گنبد کی طرح اپنے پورے حجم اور رفتار کے ساتھ نیچے نہ آ رہے۔ اور اس کنوئیں کے پاتال کی کسے خبر ہے۔"

"تو پھر یہ تمہارا مسئلہ ہے، میرا نہیں"۔ میں نے ایک بار جی بھر کے اس کا چمکتا چہرہ آنکھوں میں بھرا اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔

"نہیں، یہ تمہارا مسئلہ بھی ہے، بلکہ اب تو یہ تمہارا ہی مسئلہ ہے۔ اس لیے کہ میرے علاوہ صرف تم ہو جس کو یہ معلوم ہے کہ وہ کہاں گری ہے اور اگر میری شئے مجھے واپس نہ ملی تو اس سانحہ کی ذمہ داری تم پر ہوگی"۔ اس نے سسکیاں روک کر کہا۔

"اور اگر میں اسے اپنا مسئلہ نہ سمجھوں تو کیا کرو گی۔ کیا کود کر خودکشی کر لو گی؟" مجھے نیند میں بھی تلخ ہنسی آ گئی، اور مجھے سب کچھ یاد آ گیا کہ کس طرح بے خبری ہی میں ہر مسئلہ اپنا مسئلہ سمجھ کر مکڑی کے جالے کی مانند ہمارے گرد تن جاتا ہے۔

وہ خاموش تھی۔ گو میں سناٹے کا عادی ہو چکا تھا بلکہ سناٹے کی ایک آواز میری سماعت بن چکی تھی۔ مگر ایک مدت کے بعد اس کی آواز پر یہ سناٹا ٹوٹ گیا تھا اور مجھے عجیب سی پریشانی ہو رہی تھی۔ میں بہت عرصہ منتظر رہا پھر مجھے حیرت ہونے لگی کہ وہ بول کیوں نہیں رہی۔ آخر میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا وہ منڈیر پر لٹکے لٹکے سو چکی تھی اور سنہری بالوں نے اس کا چہرہ چھپا رکھا تھا۔

اب اگر ذرا سا غیر جذباتی ہو کر سوچا جائے تو اس کا اِس طرح منڈیر پر سو جانا مجھ سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا۔ مگر اب ایک نیا عذاب میرے

لیے پیدا ہو گیا تھا کہ غیر ارادی طور پر لفظ میرے ذہن اور زبان پر یلغار کرتے چلے آ رہے تھے۔ گویا اچانک ہی کوئی بند ٹوٹ گیا ہو۔ میں کہ اپنا اظہار کھو چکا تھا ایک بار پھر اس طرح گویا تھا کہ کوئی دوسرا میری بات سنتا سمجھتا اور جواب دیتا تھا اور اب سکوت ناممکن تھا۔

"بس اتنی ہی ہمت تھی۔ تم تو ابھی سے سو گئیں۔" میں نے اپنے لہجے کی تلخی کو ذرا بھی چھپانے کی کوشش نہ کی۔ مگر اس پر بھی وہ خاموش رہی اب مجھے اور بھی تشویش ہو گئی۔ میں نے بہت چاہا کہ اس کے وجود کو فراموش کر دوں اور پہلے کی طرح خود اپنے اندر آسودہ ہو جاؤں۔ اور پھر بھی میں اس کو اس طرح اذیت میں دیکھ کر مطمئن تھا۔ محض اس لیے کہ میری سمجھ میں یہی نہیں آ چکتا تھا کہ اس کی اذیت دور کر کے مجھے کیا مل جائے گا۔ مگر پھر بھی مجھے اس کی سلامتی کی فکر دامن گیر تھی۔

"سنو، اگر میں تمہاری شے نکال لاؤں تو مجھے کیا فائدہ ہو گا یعنی تم اس کے عوض مجھے کیا دو گی؟" میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"میں ——" اب وہ چونک کر بولی "میں بھلا تمہیں کیا دے سکتی ہوں۔ میں نہیں جانتی کہ تمہیں کس شے کی ضرورت ہے۔ جب کہ تم جانتے ہو مجھے کیا چاہیے۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں۔ دیکھو میں بہت افادیت پسند واقع ہوا ہوں بغیر کسی معاوضہ کے کام نہیں کر سکتا۔" میں نے آواز میں بے اعتنائی پیدا کی۔ اس پر وہ پریشان ہو گئی۔

"نہیں نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ دیکھو تم مجھ سے اتنے مختلف ہو مجھے نہیں معلوم کہ اگر میں واقعی تمہیں کچھ دوں تو تمہارے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے کہ نہیں۔"

"ہو سکتا ہے۔ کسے خبر؟ کچھ کہو تو سہی۔ کیا دے سکتی ہو؟" میں نے

بات بڑھانے کی خاطر کہا۔ اب مجھے خاموشی سے بے انتہا وحشت ہو رہی تھی اور میں کسی قیمت پر بھی اُس سے بات جاری رکھنا چاہتا تھا پھر معلوم نہیں اُسے کیا یاد آیا۔ وہ یک دم سیدھی کھڑی ہو گئی۔ سُنہرے بال سمیٹ کر گردن پر جوڑا بنایا۔ آنکھیں خشک کیں اور کہنیاں منڈیر پر ٹِکا کر بولی۔

"مجھے یاد آیا —" مگر پھر خاموش ہو گئی اور بہت سی دبیز تنک خلیج گول رہی۔

"ہاں کہو —" میں نے تنگ آکر پوچھا

"مگر یہ بات تو تمہیں کہنا چاہیئے تھی —"

"کونسی بات؟" میں ذرا اوپر سرک آیا۔ اب اس کے گورے چہرے پر ہلکی سی سُرخی دوڑ گئی۔

"یہی کہ اگر تم مجھے میری شے لا دو گے تو پھر مجھے تم کو اپنے ساتھ کھانا کھلانا اور سُلانا پڑے گا —"

"ہاں ہونا تو ایسا ہی چاہیئے تھا —" مجھے بھولی بسری کہانی یاد آگئی۔

"مگر اس کے لیے تو مجھے باہر آنا پڑے گا —" آخر مجھے کہنا پڑا

"ہاں، وہ تو ظاہر ہے —" اس نے نہایت لاپرواہی سے کہا۔ مجھے اس کے لہجہ پر سخت کوفت ہوئی۔ میں نے اسے کتنا غلط سمجھا تھا اسے تو کچھ بھی معلوم نہ تھا میں کس کس طرح یہاں تک پہنچا تھا میں نے کیونکر خود اپنے وجود میں آسودہ ہونا سیکھا تھا۔ کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ مجھ سے کس چیز کا مطالبہ کر رہی ہے۔ کتنی مکار تھی وہ۔ کچھ دینے کے عوض مجھی سے اتنا کچھ طلب کر رہی تھی۔ مگر میں اُس کو اِس طرح اذیت میں بھی تو نہ دیکھ سکتا تھا۔ اور یہ بھی ممکن نہ تھا کہ وہ وہاں موجود نہ رہے۔ اب اس کے بغیر مجھے اپنا وجود ناممکن نظر آنے لگا تھا۔

معلوم نہیں اس بحث و مباحثہ میں کتنی مدت گذر گئی۔ اس حد تک کہ میں اپنے آپ کو اس کے ساتھ ہم کلام رکھنے پر مجبور پا رہا تھا چنانچہ میں نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"میں کہانی کے اس حصّہ کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا۔ میری شرط تو کچھ اور ہے۔" میں نے اپنے الفاظ خوب ناپ تول کر کہے۔

"ہاں کہو۔" وہ منڈیر پر اور بھی نیچے تک جھک آئی

"تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں مجھ سے ہمکلام رہنا ہو گا۔ اسی طرح، مسلسل۔"

ٹھہرے تاریک پانی میں سے میں نے اوپر دیکھا۔ اس کا سر خاموشی سے منڈیر پر ڈھلک گیا تھا۔

رضیہ فصیح احمد

مکعب

یہ ایک مکعب ہے۔
ہاں دیکھ رہا ہوں۔
اس میں ستائیس چھوٹے چھوٹے مکعب ہیں جو آپس میں جڑے ہوئے ہیں اس میں چھ رنگ ہیں۔ سفید، زرد، نارنجی، سرخ، سبز اور نیلا۔ اس مکعب کو تم تین طرف گھما سکتے ہو۔
معلوم ہے تم چاہتے ہو کہ ہر رنگ ایک طرف ہو جائے۔
بالکل ساری سطحیں ایک طرف، زرد ایک طرف، سبز ایک طرف ہوں۔ کوئی رنگ کسی دوسرے کی حد میں نہ ہو، صرف اپنی حد میں ہو اور یوں مکعب میں مکمل ہم آہنگی ہو جائے۔
یہ ناممکن ہے۔ میں بہت دن سے کوشش کر رہا ہوں مگر ایک طرف بھی مکمل نہیں ہوئی۔ اور اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ معمہ نہیں فراڈ ہے۔ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔
یقین کرو بھائی، ہو سکتا ہے، ہوا ہے اور ہو گا۔
اگر ہوا ہے تو کروڑوں مرتبہ میں سے ایک مرتبہ ہو گیا ہو گا اور ہو گا تو سینکڑوں سال بعد اتفاق سے کبھی ہو جائے گا۔
اس مکعب کے امکانی پیٹرن کی تعداد بھی اتنی زیادہ ہے کہ مجھے اتنی

گنتی نہیں آتی۔ میں لکھ کر بتاتا ہوں اگر پڑھ سکتے ہو تو پڑھ لو ۔۔
ان امکانات کی تعداد ۴۳،۲۵۲،۰۰۳،۴۷۴،۴۸۴،۸۵۶،۰۰۰ ہے
مگر جب مَیں نے اسے پہلے پہل دیکھا تھا تو یہ مکمل ترتیب میں تھا۔ سب
رنگ اپنی اپنی جگہ تھے۔

تو تم نے اس کی ہم آہنگی کو توڑا کیوں۔ انہیں بے جگہ کیوں کیا ؟

اس لیے میرے بھائی کہ کھیل ہی یہی ہے۔

کھیل ہی یہی ہے ؟

ہاں ..... یہی تو کھیل ہے کہ اس ہم آہنگی کو توڑا جائے اور پھر اسے
قائم کیا جائے۔ ہر رنگ سدا اپنی جگہ رہتا تو مزا آتا۔ کس کی ذہانت کا امتحان
ہوتا۔

کیا ذہانت کا امتحان بہت ضروری ہے ؟

اور کیا! یہ بھی تو کھیل کے لطف میں شامل ہے کہ تمھاری طرح لوگ پکار پکار کر
کہیں یہ ناممکن ہے اور انھیں یقین دلایا جائے کہ یہ قطعی ممکن ہے۔

تمہارے یقین دلانے سے کیا ہوتا ہے اگر میں پھر بھی نہ مانوں !

تم یہ تو مانتے ہو کہ اسے کسی نے بنایا ہے ؟

ہاں مانتا ہوں

تم میری بات پر یقین کرتے ہو ؟

ہاں کرتا ہوں۔

تو میں تمہیں بتا رہا ہوں تاکہ جب میں نے اسے دیکھا ہے تو اس کا ہر رنگ ایک
طرف تھا۔

اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسے دوبارہ بنایا جا سکتا ہے۔ پہلے یہ ٹکڑے جدا
جُدا ہوں گے۔ بنانے والے نے سارے رنگ یکجا کیے اور انھیں جوڑ دیا۔ اب
جب کہ تم نے سارے خانے اپنی جگہ سے ہلا دیئے ہیں وہ سب دوبارہ اپنی اپنی

جگہ نہیں جا سکتے۔
کیوں نہیں جا سکتے؟
ابھی تم ایک مکمل انسان ہو، اگر میں تمہارا جوڑ جوڑ الگ کر دوں، ہر عضو بے جگہ کر دوں، تو لیا انہیں دوبارہ جوڑ سکتا ہوں۔ نہیں ایسی ابتری اور کنفیوژن سے ترتیب پیدا ہونا ممکن نہیں۔
کیوں نہیں! اچھا تھیوری سے شروع کرو۔ ممکن ہے کہ تم میرا جوڑ جوڑ الگ کر کے نہ جوڑ سکتے ہو۔ مگر کوئی بے حد ماہر سرجن جو علم البدن سے اچھی طرح واقف ہو ایسا کر سکتا ہے یا نہیں۔
صرف تھیوری کی حد تک۔
جو چیز تھیوری میں ممکن ہو وہ ایک نہ ایک دن عملی طور پر بھی ممکن ہو جاتی ہے سمندری سطح پر چلنے والے جہاز پہلے کاغذ ہی کی سطح پر رواں ہوئے تھے۔ اور ہوا میں اڑنے والے جہاز پہلے کاغذ پر ہی اڑائے گئے تھے۔ دیکھو باتوں باتوں میں ایک طرف تو مکمل بھی ہو گئی۔
دکھاؤ، یہ کیسے ہوا؟
کوشش سے اور اس یقین سے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔
ایک طرف کا مکمل ہو جانا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ چھ کی چھ اطراف مکمل ہو سکتی ہیں۔
ایک طرف کا مکمل ہو جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ چھ کی چھ اطراف مکمل ہو سکتی ہیں، کسی نہ کسی دن، کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی کے ہاتھوں۔
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک
جینے اور مرنے کی بات اور ہے' ایفان کا دوسرا مسئلہ ہے۔ یہ یقین کہ ہم مریں یا جئیں یہ بات ہو سکتی ہے اور ہو گی۔
آپ میری بات سنیئے، میں آپ دونوں کو اس مکعب کی کہانی سناتا ہوں ہنگری

میں روبیک نامی ایک شخص نے جب یہ مکعب بنایا تو بچوں کے کھیل یا معمے کی حیثیت سے اُسے فروخت کرنے کے لیے بھی کوئی تیار نہ تھا۔ بمشکل ایک کھلونا بنانے والی کمپنی چند ہزار مکعب بنانے پر راضی ہوئی مگر ہوا یہ کہ پہلے دوسرے دن ہی سارے مکعب بک گئے۔ جو شخص اُسے کسی بچے کو تحفتاً دینے کے لیے خریدتا اس میں ایسا اُلجھتا کہ اپنی سدھ بدھ بھول جاتا۔ بچے بوڑھے جوان سب اس کے جال میں پھنس کر رہ گئے۔ کچھ لوگ تو دیوانگی کی حد کو جا پہنچے اور اس کا نام روبیک دیوانگی پڑ گیا۔ ہنگری سے جو لوگ باہر جاتے اور ان کے ہاتھ میں یہ مکعب ہوتا تو دوسرے لوگ بھی اس میں دلچسپی لیتے۔ ۱۹۷۸ء میں اسے ایک ہنگرین پروفیسر بین الاقوامی ریاضی کانفرنس میں لے گیا اور وہاں ایک امریکی پروفیسر نے جو لندن میں پڑھاتا تھا اسے پہلی مرتبہ دیکھا۔ اِس سے اور مکعب بھیجنے کی درخواست کی اور اس کا حل دریافت کیا۔ چھیاسٹھ صفحے کی یہ کتاب فوری طور پر دس ہزار کی تعداد میں بک گئی اور اس کے نہ جانے کتنے ایڈیشن چھپے۔ اب یہ مکعب ایک سو پانچ ملین ماہانہ کے حساب سے بنائے جاتے ہیں۔ تب بھی لوگوں کی مانگ پوری نہیں کر سکتے۔ اب ریاضی دان اور سائنسداں اس میں نئی نئی تھیوریاں تلاش کر رہے ہیں اور پا رہے ہیں حالانکہ روبیک نے اس میں کسی علمی امکان کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔

مگر کیا واقعی اس کا حل ڈھونڈ لیا گیا ہے، میں نہیں مانتا۔

جناب آپ بہت بے خبر ہیں۔ یہ ناممکن کب کا ممکن ہو چکا ہے۔ لوگ بڑی آسانی سے چھ کی چھ اطراف بنا لیتے ہیں۔ میں اسے ایک منٹ میں بنا لیتا ہوں جب کہ دنیا کا ریکارڈ ہے بتیس سیکنڈ۔

واقعی! کیا ناممکن اتنی آسانی سے ممکن ہو جاتا ہے؟

آسانی سے نہیں بھائی، کوشش سے، لگن سے، محنت سے اور یقین سے۔

اور اس کا کوئی ایک حل نہیں ہے۔ کئی حل دریافت ہو چکے ہیں اور ہر شخص کا دعویٰ ہے کہ اس کا حل سہل ترین اور بہترین ہے۔
تمہارا کیا خیال ہے، کون سا حل بہترین ہے؟
جو حل سب سے پہلے تمہارے ہاتھ لگے یا جو حل آپ کی افتادِ طبع کے مطابق ہو۔ اصل مسئلہ تو معمّہ حل کرنا ہے۔
سچی بات یہ ہے کہ میرا دل نہیں مانتا، مجھے لگ رہا ہے کہ تم ہمیں بیوقوف بنا رہے ہو۔
لائیے یہ مکعب مجھے دیجیے اور آپ گھڑی پر نظر رکھیے ...... یہ ایک ...... یہ دو ...... یہ تین ...... یہ چار ...... یہ پانچ ......
یہ چھ، لیجیے مکعب مکمل ہو گیا۔ دیکھ لیجیے اپنی آنکھوں سے۔
ہاں واقعی یہ تو ہو گیا۔ تو یہ ناممکن نہیں تھا۔ میں سوچتا تھا کہ اپنی جگہ سے ہلانے کے بعد یہ قیامت تک بھی اپنی جگہ واپس نہ جا سکیں گے۔
اب جب کہ سب رنگ ایک طرف ہو گئے ہیں انھیں چھیڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ دیکھو کیسا سکون ہے جیسے سب نے اپنی منزل پالی ہو۔
شاید سکون ہمارے دل و ذہن میں ہو۔ ہمارے لیے یہ معمّہ ایک چیلنج تھا جسے پورا کیے بغیر دل نہیں مانتا تھا۔ تجسّس اور تکمیل کی جو خواہش ہر انسان میں ہے وہ ہمیں اس جنون میں مبتلا کرتی ہے مگر ہم بہت جلد ہی چھوڑ دیتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم اس دیوانگی سے نکل آئے۔ عجب بات ہے کہ چھوٹے چھوٹے فضول کاموں میں وقت گنوانے کو ہم کام کرنا کہتے ہیں اور کھوجنے اور تحقیق کرنے کو دیوانگی کا نام دیتے ہیں۔
یہ تو صرف ایک مکعب ہے جس میں صرف چوّن [۵۴] سوالات ہیں۔ سوالوں کی صرف ایک چھوٹی سی ڈھیری۔ کائنات کی شش جہات میں سوالوں کی نہ جانے کتنی ڈھیریاں ہیں جن کے جواب تلاش کرنا ہیں۔

ان سب کے امکانی پیٹرن اتنے زیادہ ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔
صرف ایک امید ہے۔
کیا ؟
یہی کہ اگر انسان کوشش کرتا رہے تو ان سب کے حل ملنے ممکن ہیں، محنت سے، لگن سے، ایمان اور ایقان سے سارے سوالوں کی ساری ڈھیریاں کبھی نہ کبھی حل ہو جائیں گی۔ کسی نہ کسی دن سارے جگ شا پزل اپنی اپنی جگہ پا کر مکمل ہو جائیں گے۔
ناممکن !
دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ ریاضی دان کہتے ہیں کہ اگر کوئی بندر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ کر اندھا دھند ہاتھ مارنے لگے تو وہ شیکسپیئر کا ایک ڈرامہ جوں کا توں لکھ دے گا۔ اربوں کھربوں میں سے ایک سہی مگر اس کا امکان ہے۔
میں کیا ناممکن کہتا ہوں، تو یوں کہو یہاں آن کر امکان اور ناممکن مل جاتے ہیں۔
مگر تمھیں ناممکن کہتے ہی پر اصرار ہے۔ تم ہر چیز کا منفی پہلو دیکھتے ہو اور اسی لیے غمگین رہتے ہو۔ کیا تمہارے غمگین رہنے سے دنیا کے غم کم ہو جائیں گے ؟
تو کیا تمھارے پُرامید رہنے سے دنیا کے دُکھ دور ہو جائیں گے۔ جب دنیا میں اتنے دُکھ، اتنی محرومیاں اور اتنے معمے ہیں تو بتاؤ کہ خوش رہنے کا کیا جواز ہے تمہارے پاس ؟
زندگی بذاتِ خود خوش رہنے کا جواز ہے۔ کائنات کے ہزار ہا معمے ہماری عقدہ کشائی کے منتظر ہیں۔ ان کو ناممکن سمجھنے والے غمگین رہتے ہیں اور امکان پر یقین رکھنے والے پُرامید رہتے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے ہے یا نہیں ؟
میں نے کبھی سوچا نہیں۔
سوچا کرو، سوچ کر فکر مند ہونا بغیر سوچے غمگین رہنے سے بہتر ہے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

لہو کی چہچہاہٹ

رات بھر طوفان نے وحشت کا رقص کیا، بادل کی گرج سے زمین زلزلہ میں مبتلا، بجلی کڑک کڑک کر لہرے لے رہی تھی، بارش ایسی کہ سمندر کا پانی بادلوں سے جا لگا۔ طوفان سے بڑی موجیں، موجوں سے بڑی ان کی خشونت اور خشونت سے بڑی ان کی جھاگ ــــ

رات بھر طوفان نے من مانی کی! اور پھر طوفان گویا من مانی کرتے کرتے تھک گیا، اس کی طبیعت سیر ہو گئی اور وہ اپنا من پرچانے کسی اور سمت نکل گیا۔

پرسکون سمندر کی نیلگوں لہروں پر ایک چوبی تختہ، ڈولتا ڈولتا: تختہ پر ایک عورت بے ہوش، تیز دھوپ میں چمکتا جسم، سیاہ بالوں کے ہالہ میں زرد چہرہ، گویا موم کا بنا، جسم کے سوکھے حصوں پر نمکین ذرات کی چمک۔ جل پنچھی اس کے گرد، اڑانیں کرتے، غوطے لگاتے، شور مچاتے۔ دو چار تختہ پر براجمان۔

عورت بے ہوشی کے گہرے پانیوں میں غوطہ زن!

ایک موج کف پر تختہ کو تھامے آتی ہے اور پرشور لہجہ میں تختہ کو ساحل پر دے مارتی ہے۔ تیز دھوپ اور خنک ہوا۔ ہاتھ تھام کر اسے آہستہ آہستہ نیند کے گہرے پانیوں سے باہر لا رہی ہے۔ پلکوں میں نیند سے بیداری

کی خفیف سی لرزش، اور اب وہ بیدار ہے۔

گہرے سبز رنگ کے گھنے درختوں کی تنی چادر، اجلی جھاڑیوں میں چمکیلے پھول، پرندوں کا شور۔ کسی آبشار کی آواز ــــ اور خاموشی! ایسی خاموشی جس میں دور کی آواز بھی اپنے معانی سمجھا دے۔ خاموشی کا گھونگھٹ اٹھانے کی آواز انسانی نہ تھی۔ وہ موٹی موٹی سیاہ آنکھیں کھولے بڑی دیر تک جزیرہ گھری سبز چادر اور اس پر چڑھے خوشنما پھول دیکھا کی۔

یاد آیا، رات طوفان میں ان کا جہاز غرق ہو گیا تھا، وہ ایک تختہ پر تھی۔ تو گویا وہ زندہ بچ گئی؟ مگر باقی؟ سب مچھلیوں کا کھاجا بن گئے؟ جسم میں کپکپی کی لہر دوڑ گئی، آنکھیں بھر آئیں۔ دل ڈوبنے لگا۔

ایک مرتبہ پھر گہری سبز چادر کو دیکھا، جسے چیر کر ابھی تک کوئی جانور، زندہ انسان برآمد نہ ہوا تھا، تو جزیرہ غیر آباد ہے؟ سا تھ ہی بھوک اور بے آبی کا بھی احساس ہوا۔ اٹھنے کی کوشش کی تو نقاہت سے لڑکھڑا کر ریت پر گری ــــ اور عین اسی لمحہ وہ اس پر ٹوٹ پڑے۔

ٹیڑھی پگڈنڈی پر وہ پانچوں قطار میں بڑھے چلے جا رہے تھے۔ سب سے آگے چلنے والے کے کندھے پر لٹکی بیہوش عورت کے بازو اور لمبے بال جھولتے جا رہے تھے ــــ وہ خاموش تھے کہ جانتے تھے کہ وہ کیا کرنے جا رہے

آبشار کے قریب ہموار جگہ پر پٹکے جانے سے عورت بیدار ہو گئی مگر اٹھنے کی سکت نہ تھی۔ کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر ٹھوڑی کپکپا کر رہ گئی، کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر خوف نے حلق میں خار زار اگا دیا تھا۔ خوف سے پھیلی پتلیوں نے دیکھا ایک گڑھا کھود رہا ہے۔ دوسرا درختوں کی سوکھی ٹہنیاں بڑے سلیقہ سے سجا رہا تھا تیسرا پتھر پر ہتھیار کی تیز دھار چمکانے میں محو ہے۔ چوتھا آبشار سے پانی لا رہا ہے پانچواں اطمینان سے تمام منظر پر پہرہ دے رہا ہے۔ خوف سے اکڑی زبان ہونٹوں پر پھیری تو تھوک کا گولا حلق سے نیچے اتارا مگر حلق کی خشکی میں کمی نہ ہوئی

ایک مرتبہ آنکھیں بھینچ کر دیکھا مگر منظر اسی طرح تھا، سبھی اپنے کام میں محو، کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ تھا حتیٰ کہ وہ شخص بھی ـــــ جو کچھ نہ کر رہا تھا اور صرف منظر پر پہرہ دے رہا تھا۔

گڑھا کھودنے والے نے گڑھا تیار کر لیا تھا اور اب فالتو پتھر، سنگریزے کنکریاں نکال رہا تھا۔ خشک لکڑیاں بھی حسب ضرورت جمع ہو گئی تھیں انہیں وہ بڑے قرینے سے ایک کے اوپر ایک رکھ رہا تھا۔ ہتھیار تیز کرنے والے نے انگھوٹھے پر تھوک لگا کر دھار پرکھی اور مطمئن ہو کر سر ہلایا

اس نے چیخنے کو منہ کھولا مگر چیخ حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ دو نے اس کے ہلتے بازو اور دو نے مچلتی ٹانگیں جکڑ لیں مگر چیخ حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ مشاق گردن بے حد مضبوط تھی اس لیے کندھوں اور ٹخنوں میں پنجے کھبے جا رہے تھے۔ ادھر ادھر گردن ہلانے سے زمین پر لہرائے ڈال رہے تھے۔ اچانک پھیپھڑوں میں اتنی قوت آ گئی کہ حلق کے شکنجے میں چیخ رہائی حاصل کرنے میں بیتاب ہو گئی ـــ لمحہ بھر کو شور مچاتے پرندے نامانوس آواز سے ٹھٹھکے، اس کے بعد پوری قوت سے دوبارہ بولنے لگے۔

اب مچلتے جسم کا سر گڑھے پر تھا۔ پانچویں نے زمین پر پڑا ہتھیار اٹھا لیا اس نے نہایت اطمینان سے دھار پرکھی، زمین پر عورت اب ساکن تھی، اس کے بال اب حالت میں تھے، خوف زدہ آنکھوں میں دھار کی چمک کے جگنو تھے۔ چاروں کے جسموں کا زور ان کی انگلیوں میں اتر آیا تھا۔ مرد نے بائیں ہاتھ سے اس کی گردن یوں پکڑ لی کہ عورت کو سانس رکتی محسوس ہوئی اس کا دایاں ہاتھ بلند ہوا تو ایک کرن نے دھار کو روشنی میں نہلا دیا مگر ہاتھ قدرے ہل رہا تھا۔ لہٰذا عورت کی آدھی گردن کٹ سکی۔ آدھی باقی رہ گئی۔ اس پر اس نے نہایت اطمینان مگر احتیاط سے وار کیا۔ اس مرتبہ پوری گردن دھڑ سے الگ ہو گئی، اس نے بالوں سے پکڑ کر سر کو ایک طرف گھاس پر

پھینک دیا۔ جہاں کئی لڑھکیاں کھاتے کے بعد وہ قریبی درخت کے تنے سے جا ٹکا بن گردن جسم کی تڑپن شہ رگ سے خون نکالے جا رہی تھی اور اس ابلتے فوارہ سے گڑھا بتدریج بھرتا جا رہا تھا۔ انھوں نے اپنا پیالہ نکالا اور خون سے لب ریز کر کے باری باری پیا۔ خون سے ان کے ہونٹ سرخ ہو رہے تھے اور اب وہ جسم میں توانائی کی لہر دوڑتی محسوس کر رہے تھے جس سے آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہو گیا۔

سوکھی لکڑیوں سے الاؤ روشن کیا جا رہا تھا۔

پانچویں مردے نے پھر ہتھیار سنبھالا۔ ایسے نپے تلے ہاتھ مارے کہ دونوں بازو اور دونوں رانیں الگ جا پڑیں —— اس کے سامنے عورت کا دھڑ پڑا تھا اس نے گردن پر ہتھیار رکھا اور اب وہ ایک گہری لکیر میں چلتا ہوا پسلیوں، پیٹ ناف اور جسم دو حصوں میں تقسیم کرتا گیا، پھک کی آواز آئی اور پیٹ میں سے انتڑیوں کا ڈھیر ابل پڑا۔ تین انتڑیاں صاف کرنے لگے جن میں سے گزشتہ دو روز کی کھائی ہوئی غذا کے ذرے نکل رہے تھے۔ چوتھے نے اوجھڑی سنبھالی اور اسے دھونے چلا گیا۔ پانچویں نے پیٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر پھیپھڑا، کلیجی دل، جگر، تلی اور نرخرا کھینچ کر باہر نکالے مگر اس مہارت سے کہ ہر عضو اپنی درست حالت میں نکلا کسی پر خراش تک بھی نہ آئی۔ یہ لذت اور تقویت دینے والی چیزیں تھیں اس لیے جسم سے نکال کر ہر ممکن احتیاط کی ضرورت تھی چنانچہ بڑی صفائی سے کلیجی اور پھیپھڑے کے ٹکڑے کیے گئے۔ دل کی قاشیں بنائی گئیں اور پھونک مار کر نرخرے کو صاف کیا گیا۔ تب پانچویں نے اسے ہار کی مانند اپنے گلے میں ڈال لیا۔

سبھی اپنے اپنے حصے کے دل، پھیپھڑے اور کلیجی کو نہایت انہماک سے کھا رہے تھے۔ پانچوں خاموش تھے صرف چلتے جبڑوں سے چپڑ چپڑ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ تازہ گوشت کے ریشے دانتوں تلے آ کر مچل

جاتے اس لیے وہ آہستہ آہستہ چبا رہے تھے مگر جو چباتے اسے ایک دم حلق سے نیچے نہ اتار دیتے بلکہ گوشت کا تمام رس منہ ہی میں رکھتے اس کے بعد جب منہ رس سے بھر جاتا اور مزید منہ چلانا ممکن نہ رہتا تو اس رس کو منہ میں گھماتے رہتے تاکہ تالو اس کے ذائقہ کی لذت سے اچھی طرح آشنا ہو جائے تب کہیں جا کر وہ رس بھرا ہونٹ حلق سے نیچے اتارتے ـــــ کھانے کا یہ طویل عمل گوشت کی لذت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کے لیے تھا۔

الاؤ پوری طرح دھک چکا تھا۔ شعلوں کی زبانیں سانپوں کی طرح لہرا رہی تھیں جلتی لکڑیاں تڑخ تڑخ کر انگاروں میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ الاؤ میں سب سے پہلے عورت کا دھڑ رکھا گیا۔ اس کے بعد دونوں رانیں اور پھر دونوں بازو ـــ اور مدھم آنچ پر خستگی برقرار رکھنے کے لیے ان سب کے اوپر دونوں چھاتیاں جواب محض چربی کی دو گیند بن کر رہ گئی تھیں۔ ان کے اصل ذائقہ کی برقراری کے لیے بیحد احتیاط کی ضرورت تھی کیونکہ زیادہ آنچ سے ان کی نرم چربی پگھل کر بہہ جانے کا اندیشہ تھا۔ اسی طرح زیادہ جل جانے پر ان کی نرم جلد کا لطیف ذائقہ اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی خراب ہو جاتی ہے۔

اس کام سے فراغت پا کر بوڑھے پانچویں نے سر اٹھالیا اور ہتھیار کی نوک سے پہلے دونوں آنکھیں نکالیں جو جسم کا لذیذ ترین ہوتی ہیں۔ اس لیے آنکھیں نکالنے میں پانچویں شخص نے خصوصی احتیاط اور مہارت کا ثبوت دیا چاروں للچائی نظروں سے آنکھیں نکلنے کا عمل دیکھ رہے تھے۔ انہماک کی وجہ سے اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں جب کہ آنکھیں نکالنے والی اپنی آنکھوں میں عورت کی آنکھیں اتر آئی تھیں۔ اس نے اس مہارت سے آنکھیں نکالیں کہ پتلی تک محفوظ رہی۔ دونوں آنکھیں ایک چوڑے پتہ میں سجادی گئیں تو عورت کی آنکھ میں قاتل دھار کے جگنو کی چمک ابھی تک

برقرار تھیں، نہایت احتیاط سے آنکھوں کے حصے کیے گئے مگر انہوں نے منہ میں ڈالتے ہی انہیں نگلنے کی کوشش نہ کی بلکہ منہ میں رکھ کر آہستہ آہستہ زبان پر ان کے ذائقہ کی خوشگواری محسوس کرتے گئے۔ حتیٰ کہ منہ کی گرمی سے پگھل کر وہ خود بخود حلق تر کرتی نیچے اتر گئیں۔ ان کی آنکھوں میں یہ لذت نشہ بن کر لہرا گئی۔ پلکوں کے جو منہ میں ایک طرف دبا رکھے تھے ان سب کو تھوک دیا گیا۔

اس کے بعد انھوں نے عورت کا سر اٹھایا۔ اور اب سیاہ بالوں کے دستیاں اس کا سر دھرا تھا جس میں آنکھوں کے گڑھوں سے خون رس رہا تھا ہتھیار کی ایک ہی ضرب سے کھوپڑی نکل گئی، بال ہٹانے پر اندر سے مغز نکل آیا، آنکھوں کے بعد یہ دوسری لذیز ترین چیز تھی چنانچہ سب نے اسے بھی نہایت انہماک سے کھایا اور پھر منہ میں ڈال کر آہستہ آہستہ چباتے تاکہ لذت زیادہ سے زیادہ دیر تک منہ میں رہے۔

کھوپڑی کے پیالے میں سے سارا مغز چٹ کرنے تک چھاتیاں بھن کر خستہ ہو چکی تھیں چنانچہ وہ ان پر ٹوٹ پڑے۔

فضا میں بھنتے گوشت کی سوندھی سوندھی مہک تھی اور اس خوشبو کی لہروں پر ان کے اعصاب ڈوب اور ابھر رہے تھے۔ کھانے کی خوشبو سونگھ کر اردگرد کے تمام درخت چہچہاتے پرندوں سے بھر گئے تھے۔ صرف گدھ ٹیڑھی گردنیں کیے خاموشی سے کھانے کا منظر دیکھ رہے تھے۔ مگر غول در غول نہایت صبر و سکون سے اپنی باری حاصل کرنے کے لیے درختوں کی چوٹیوں پر براجمان رہے۔ ان کی باری تب آئی جب نیچے دہکتی آگ سرد ہو گئی اور صرف چوسی ہوئی ہڈیوں کا ڈھیر باقی رہ گیا۔

پیٹ بھرنے کی آسودگی سے سر گرانبار وہ سب خراٹے لے رہے تھے، ان کے اردگرد ہڈیوں پر چیونٹے، الٹے لکڑ اتے بڑے بڑے پر پھیر پھڑ پھڑاتے

تھے اور دوسرے پرندے شور مچا رہے تھے - جب ان میں سے ایک کی آنکھ کھلی تو دن ڈھل چکا تھا - اس نے باقی سب کو بھی جگا یا - چربی والے گوشت نے پیاس چمکا دی تھی چنانچہ آبشار کا ٹھنڈا پانی جی بھر کر پیا مگر پانی پی کر مڑنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ لوگ ان پر ٹوٹ پڑے ۔ بیشتر اس کے کہ وہ سنبھلتے ان کی گردنیں جسموں سے الگ ہو چکی تھیں - راکھ کرید کر انگارے نکالے گئے، الاؤ اور زیادہ روشن کر دیا گیا - فرق صرف یہ تھا کہ اس مرتبہ پہلے کے مقابلہ میں اس میں لکڑیاں کہیں زیادہ تھیں شعلوں کی زبانیں پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ لمبی تھیں اور ہتھیار تیز کرنے والے ہاتھوں میں پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ پھرتی اور مشاقی تھی -

محمد منشا یاد

راتب

اسے یاد نہیں کہ پہلی بار اس کے دل میں اس سوال نے کب پر پھڑ پھڑائے کہ وہ ـــــ اصل میں وہ نہیں کوئی اور ہے۔ شاید ماں باپ کی سرد مہریوں نے آہستہ آہستہ اُسے اس ہیان بیوا سوال کی بھٹی میں جھونکا یا شاید اپنے ہم عمروں کو اپنے اپنے والدین کے لاڈ پیار کی پینگیں جھولتے اور محبت منڈھاتے دیکھ کر اس کے اندر محرومی کا کوئی سوتا پھوٹا ـــــ لیکن اسے یاد پڑتا ہے کہ بچپن میں پڑوس والی مائی حمیداں سے جو کہانی اس نے ایک بار سُنی تھی شاید وہ اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی ہے۔ اس کہانی میں ایک عورت اور بچے کا ذکر تھا۔ عورت صبح سویرے کھیتوں کی طرف جا رہی تھی کہ اس نے نہر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر ایک نوزائیدہ بے لباس بچے کو دیکھا جو گھاس پر بے حس و حرکت پڑا تھا اور اسے چیونٹے کھا رہے تھے۔ اس نے جھک کر دیکھا تو وہ زندہ تھا مگر اس قدر نحیف کہ چیونٹیوں کے کاٹنے کی تکلیف پر اس کے منہ سے رونے کی آواز تک نہیں نکل رہی تھی، نہ اس میں حرکت کرنے کی سکت تھی۔ وہ کچھ دیر اسے خوف حیرت اور پریشانی سے دیکھتی رہی پھر اسے اٹھا کر گھر لے آئی، گھر میں اس نے کبوتر، مرغیاں اور خرگوش پال رکھے تھے، وہ اسے بھی پالنے لگی۔

اس نے مائی حمیداں سے کئی بار دریافت کیا کہ پھر کیا ہوا مگر وہ کہتی کہ کہانی اتنی ہی تھی اور اگر اور تھی بھی تو اسے یاد نہیں تھی۔

جب اس نے ہوش سنبھالا تو اپنے گھر کے حالات دیکھ کر اُسے خود ہی خیال

آیا کہ کہانی میں جس بچے کا ذکر تھا وہ بچہ وہ خود ہے اور وہ عورت اس کی ماں تھی۔ اگر ایسا تھا تو اس کی ماں، اس کی اصل ماں نہیں تھی اور وہ، وہ نہیں تھا، پھر کون تھا؟ اس سوال کے آگے برسوں لمبی چپ اور تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور اگرچہ اسے اس سوال کا جواب کبھی نہ مل سکا تاہم اس کے اندر ایک تجسس موجود رہا اور وہ چپکے چپکے اپنے اور اپنے والدین کی اصلیت کے بارے میں ٹوہ لگاتا رہا۔

پھر جب اسے پتہ چلا کہ وہ تین چار برس کا تھا تو اس کے والدین کسی دوسری جگہ سے آکر اس گاؤں میں آباد ہوئے تھے تو اسے بالکل یقین ہو گیا کہ وہ اس کے اصلی ماں باپ نہیں تھے۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ اسے پتہ چل سکے کہ وہ کہاں سے اور کن حالات میں ہجرت کر کے آئے تھے مگر وہ کسی کو ٹھیک طرح سے نہیں بتاتے تھے۔

پھر جب اس کا باپ باؤلے کتے کے کاٹنے کی وجہ سے باؤلا ہو گیا اور گاؤں والوں نے اسے اس کے گھر کے اندر ستون سے باندھ دیا اور وہ تماشائی لوگوں کو گالیاں دیتا اور رسیاں تڑوا کر ان پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا تو اس کے دل میں امید کا جگنو چمکا کہ شاید اب وہ اس کے اصلی ماں باپ کا نام اور پتہ بھی بتا دے مگر وہ اسے حرامی کہنے پر اکتفا کرتا۔

پھر جب اس کا باپ ستون سے ٹکریں مار مار کر اور رسیوں سے اُلجھ اُلجھ کر مر گیا تو اس کے ذہن میں امید کا ایک اور پھول کھلا کہ شاید گالیاں بکتی، کوسنے دیتی ماں کسی وقت غصے میں آکر اس کے اصلی ماں باپ یا اگر وہ حرامی تھا تو اس کے اصلی ماں باپ کا نام بتا دے گی مگر وہ کئی برسوں تک یونہی بکتی جھکتی رہی اور ایک بخار یا غصے میں پھنکتی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ تاہم اب بھی وہ نا امید نہیں ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اڑوس پڑوس اور گاؤں کے دوسرے لوگ جو شاید اس کے جھگڑالو ماں باپ کی وجہ سے اب تک خاموش تھے۔ اب اُسے ضرور بتا دیں گے کہ وہ اُسے کہاں اور کیسے اُٹھا لائے تھے اور اصل میں وہ کس گھر کا چراغ

تھا۔ مگر اسے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ ماں کے چالیسویں کے بعد بھی کسی نے اُسے اس قسم کی کوئی اطلاع فراہم نہ کی بلکہ اس کے بے سہارا ہو جانے پر اظہارِ ہمدردی کرنے لگے۔ ہاں چودھرانی کا رویہ اور بہتر ہو گیا۔

وہ اور اس کی ماں حویلی میں کام کرتے تھے۔ اس کا باپ ہمیشہ سے بیمار اور بیکار تھا اور زیادہ تر وقت چارپائی پر پڑا اُونگھتا رہتا تھا۔ لوگوں سے کم ملتا تھا۔ لوگ بھی اس سے ملنے سے کتراتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ نشہ کرتا ہے۔ کیا پتہ لوگ ٹھیک ہی کہتے ہوں۔

چودھرانی کی خواہش تھی کہ وہ بھی گھر کے کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹاتا رہے۔ مگر چودھری نے اسے مویشی چرانے پر مامور کر دیا ـــــ اور اس کا سارا وقت چراگاہ میں گزر جاتا۔ ماں حویلی میں کام کر کے جلد گھر پہنچ جاتی مگر وہ چراگاہ سے مویشی لانے اور حویلی میں کھانا کھانے کے بعد چراغ جلے گھر پہنچتا ـــــ اور ماں باپ کے باہمی جھگڑوں اور لڑائیوں سے بے نیاز ہو کر رات بسر کر کے صبح سویرے ایک ساتھ ناشتہ کرنے اور کھانا کھانے کے لئے حویلی کا رُخ کرتا۔ اپنے گھر میں اس کی حیثیت مسجد میں رات بسر کر کے اپنی راہ لیتے والے مسافر کی تھی۔

جب وہ ذرا بڑا ہوا تو اس نے اپنے گھر آنے اور رات بسر کرنے کا سلسلہ کم کر دیا ویسے بھی وہ اتنا تھکا ماندہ ہوتا کہ کھانا کھانے کے بعد اس کے لئے گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر واقع اپنے گھر تک چل کر جانے کی ہمت نہ ہوتی۔ کئی بار وہ اپنے گھر کے قریب آ کر ماں باپ کے باہم لڑنے کی آوازیں سن کر پلٹ جاتا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ وہ ان سے ہر وقت لڑنے کی وجہ دریافت کرے مگر اسے ہمت نہ ہوئی۔ اس کا باپ مسلسل بیمار رہ کر بہت کمزور ہو چکا تھا۔ مگر جب کبھی اس کی پٹائی کرنے پر آتا تو اس میں پتہ نہیں اتنا زور کہاں سے آتا تھا اور ماں لڑائی جھگڑے کی اتنی عادی ہو چکی

تھی کہ بعض اوقات سوتے میں بھی کسی نہ کسی کو گالیاں اور بددعائیں دیتی رہتی۔

اُسے ماں باپ کے مرنے کا کچھ زیادہ افسوس نہ تھا۔ وہ زندہ رہتے تو کیا ہو جاتا؟ ہاں ماں آخری دنوں میں اس کے بیاہ کا دکھ لے بیٹھی تھی۔ اگر کچھ عرصہ اور زندہ رہتی تو کوئی اپنے جیسی عورت اس کے پلے باندھ دیتی، اور وہ بھی اپنے باپ کی طرح اس سے لڑتا جھگڑتا رہتا اور کسی دن باؤلا ہو کر گھر کے ستون سے ٹکریں مارتے مارتے مر جاتا۔

اسے اپنے ماں باپ پر ترس ضرور آتا تھا لیکن اس خیال سے اُسے اطمینان ہو جاتا کہ مر کر اس کی جان بہت سی پریشانیوں اور جھگڑوں سے چھوٹ گئی تھی۔

وہ روح اور جسم کے تعلق کے بارے میں باریک باتیں نہیں جانتا تھا اور اس سلسلے میں اس کی معلومات وہی تھیں جو اس کی مرحومہ ماں کی تھیں یا پھر گاؤں کی مسجد کے امام سے جو باتیں وقتاً فوقتاً اس نے لاؤڈ سپیکر پر سُنی تھیں۔ تاہم اس نے بہت سی باتیں از خود سوچ لی تھیں بلکہ طے کر لی تھیں۔ مثلاً اسے معلوم تھا کہ بعض لوگ جو بظاہر بُرے اور حقیر نظر آتے تھے (جیسے وہ خود تھا) اندر سے بہت اچھے تھے اور بعض اچھے نظر آنے والے لوگ اندر سے مکروہ تھے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ بعض اچھے جسموں میں بُری اور بعض بُرے جسموں میں اچھی روحیں قید ہو گئی تھیں۔ اسے شک تھا کہ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی گھپلا ہوا تھا۔ کیا پتہ اس کی روح چودھری کے لڑکے کے ساتھ بدل گئی ہو جیسے ایک دفعہ مسجد میں اس کی جوتیاں رحمو نائی کی جوتیوں سے تبدیل ہو گئی تھیں۔ وہ ایسی باتیں اکثر سوچتا اور جس قدر سوچتا اس کا شک اور پختہ ہونے لگتا۔ ویسے بھی سرخ و سفید اور بھرے بھرے جسم والی چودھرانی اتنی اچھی اور خوبصورت تھی کہ اسے دیکھ کر خواہ مخواہ ماں کہنے کو جی چاہنے لگتا۔ بعض اوقات اسے لگتا جیسے اس نے پیدا ہونے سے پہلے بھی اسے دیکھا ہو اور اس کے بطن سے جنم لینے کی خواہش کی ہو۔

حویلی میں دو وقت کا کھانا کھانے سے اس کے شبہ کو اور تقویت پہنچی۔ اس نے سُنا تھا کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔ چونکہ یہ حویلی اصل میں اس کا اپنا گھر تھی اس لئے خدا نے اسے یہاں ملازمت دلوا کر اس کے حصے کی جوگ فراہم کرنے کی صورت پیدا کر دی تھی۔ اور وہ جسے وہ اپنا بیٹا سمجھتے تھے، اس کے حصے میں شہر کا دانہ پانی تھا۔

ماں باپ کے مرنے کے بعد اس نے اپنے گھر آنا جانا تقریباً ترک کر دیا تھا۔ چند پرانے صندوقوں، برتنوں، میلے کچیلے بستروں کے سوا وہاں رکھا بھی کیا تھا جس کی حفاظت کرنے کی ضرورت ہو ـــــ اور پھر حویلی تو دراصل اس کا وہ گھر تھی جہاں اسے پیدا ہونا چاہیئے تھا ـــــ اسے اس کے در و دیوار سے ویسے ہی محبت تھی جیسی اپنے گھر سے ہوتی ہے اور اگرچہ چودھرانی نہیں جانتی تھی کہ وہ اصل میں اس کی ماں ہے لیکن وہ اسے کسی نہ کسی بہانے زیادہ سے زیادہ وقت اپنے پاس روکے رکھتی تھی۔ کبھی چارپائیوں کی ادوائنیں کھینچنے، کبھی کبھی چودھری کے حقے کی چلم تازہ کرنے اور کبھی یونہی اِدھر کی چیزیں اُٹھا کر اُدھر رکھنے کے بہانے ـــــ خود کو مصروف رکھنے اور گھر میں زیادہ دیر رکنے کے لئے وہ خود بھی کئی کام نکال لیتا۔ چودھرانی جب کبھی اُسے بیٹا کہہ کر پکارتی تو وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا کہ کس طرح وہ غلط گھر میں پیدا ہونے کے باوجود وہ اپنے اصل والدین اور اپنے اصلی گھر میں مزے سے رہتا ہے۔

کئی بار اس کے جی میں آئی کہ وہ چودھرانی کو بتا دے کہ وہ اس کا اصلی بیٹا ہے اور وہ جو شہر میں پڑھتا ہے دراصل غریب میاں بیوی کا بیٹا ہے جو شاید اس کی جدائی کی وجہ سے ناخوش رہتے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے اور اسی اندرونی دکھ کی وجہ سے گھل گھل کر مر گئے۔ مگر پھر اسے خوف آتا اگر چودھرانی نے اس کی بات پر یقین نہ کیا تو وہ اسے اپنے بیٹے کا دشمن اور حاسد سمجھنے لگے گی۔ کیا پتہ گھر سے ہی نکال دے۔

جہاں تک چودھری کا تعلق تھا وہ اس پر مہربان ضرور تھا شاید اس کے کام کاج کی وجہ سے ــــ مگر اس کا مزاج بدلتے دیر نہیں لگتی تھی اور اسے ہر بات میں مین میخ نکالنے اور جرح کرنے کی عادت تھی۔ اس کے پاس اپنی بات ثابت کرنے کے لئے کوئی ثبوت موجود نہیں تھا۔ یہ مسئلہ کو محسوس کرنے اور یقین کرنے کا تھا۔ اور یہ چودھری ان دیکھی باتوں پر آسانی سے یقین کرنے کا قائل نہیں تھا۔

ایک روز اسے نہایت دور کی سوجھی۔ کیا معلوم چودھری سے شادی کرنے سے پہلے چودھرانی اپنے میکے میں اس کی ماں بن گئی ہو؟ اور بدنامی کے خوف سے اس نے خود یا اپنے آشنا کے ذریعے اُسے کہیں دور پھنکوا دیا ہو جہاں وہ اس عورت کے ہاتھ لگ گیا جس نے کبوتروں مرغیوں اور خرگوشوں کے ساتھ ساتھ اس کی بھی پرورش کی۔ اس نئی سوچ سے اس اُدھوری کہانی کی بہت سی گمشدہ کڑیاں بھی خود بخود مل گئیں جو اس نے بچپن میں سنی تھی۔ چودھرانی کو چند سال بعد جب معلوم ہوا ہوگا کہ وہ زندہ اور سلامت ہے تو اس کی سوئی ہوئی ماما جاگ اٹھی ہوگی اور اس نے کسی نہ کسی طرح ان غریب میاں بیوی کو اپنے پاس بلا لیا ہوگا تاکہ اُسے اپنی نظروں کے سامنے رکھ سکے۔

اپنے اس مفروضے کو حقیقت سمجھ لینے کے بعد اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اب چودھرانی سے نفرت کرے یا محبّت۔ اس کی نظروں کے سامنے رہ کر اس کی مامتا کو ٹھنڈک پہنچاتا رہے یا اُسے جدائی کا دکھ دے کر اپنی محرومیوں کا انتقام لے۔ کبھی کبھی اُسے اپنے ان دیکھے باپ کا خیال آتا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ اسے مل جائے تو وہ اس کے سینے سے لگ جائے گا یا اسے قتل کر دے گا۔

ایک بار اس نے سوچا کہ وہ چودھرانی کے قانونی بیٹے کو ٹھکانے لگا دے اور اس کے تڑپنے کا تماشا دیکھے۔ ہاں اچودھرانی اگر ہمت سے کام لے اور اُسے سب کچھ سچ سچ بتا دے تو وہ اسے معاف کر سکتا ہے۔ مگر اسے یقین تھا کہ وہ کچھ نہیں بتائے گی۔ وہ اپنا ہنستا بستا گھر، ٹھاٹ باٹھ کی زندگی اور اپنے قانونی بیٹے

کا مستقبل کیسے داؤ پر لگا سکتی تھی۔ یہ معمہ اسے خود ہی حل کرنا ہوگا اور اس کے لئے اسے چودھرانی کے میکہ کے گاؤں جانا ہوگا اور وہاں کچھ عرصہ رہ کر گڑے مردے اکھاڑنا ہوں گے۔

اس نے طے کر لیا کہ وہ اس بزدل اور گنہگار عورت کی چاکری چھوڑ دے گا، اور یہاں سے چلا جائے گا اور جب تک اسے تمام حالات ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں ہو جاتے واپس نہیں آئے گا۔

پھر ایک صبح اس نے حویلی کی چاکری کا طوق گلے سے اتار پھینکا۔ اس نے اپنے حصّے کا کھانا حویلی کے کتوں میں تقسیم کر دیا اور بغیر کسی کو بتائے گاؤں سے نکل آیا۔

کوئی ایک کوس دور جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا اور حیران ہوا۔

حویلی کا ایک پلاّ اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اتنا چھوٹا اور کمزور سا پلاّ اس کے پیچھے اتنی دور تک چلا آیا تھا۔ اسے عجیب مسرت آمیز حیرت ہوئی۔ وہ تھکا تھکا سا چلا آ رہا تھا۔ ایک ٹیلے پر بیٹھ کر وہ اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔

پلّے نے اپنی فاختائی دم ہلاتے ہوئے اس کے پاؤں چاٹے تو اسے عجیب سی لذّت کا احساس ہوا ــــ اس نے بڑھ کر اسے اٹھا لیا اور اس کے جسم پر محبّت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر اسے نیچے رکھ کر اور اس کا منہ گاؤں کی طرف کر کے بولا "مجھے بہت دور جانا ہے تم میرا ساتھ نہ دے سکو گے واپس چلے جاؤ"۔

پلّے نے جواب میں اس کی پنڈلی سے اپنی تھوتھنی رگڑی، پھر اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا کرے۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا کہ آتی بار وہ صدر دروازہ اچھی طرح سے بند کر کے نہیں آیا تھا۔ اس چھوٹے سے پلّے کو دھوپ اور سفر میں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا اور وہ واپس جانے پر رضامند نہیں تھا۔ ویسے بھی اس کا سلامتی سے واپس پہنچ جانا نہایت

مشکل تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

آخر وہ کون سی بات تھی جس کی وجہ سے پلا اپنی ماں کی محبت چھوڑ کر اس کے پیچھے چلا آیا تھا؟ یہی ناکہ وہ اُسے روٹی ڈالتا تھا۔ اچانک اسے ایسا لگا جیسے اس کے ذہن کے اندھیرے میں بجلی سی کوندی ہو۔

پلے کی ماں سے اسے اپنی ماں اور پھر باپ یاد آیا۔ جب وہ چھوٹا تھا ماں اور باپ دونوں اسے اپنے اپنے پاس سلانے کے لئے اصرار کرتے۔ اکثر وہ ایک کے پاس سوجاتا تو دوسرا اُسے سوتے میں اٹھا کر اپنے پاس لے جاتا۔ اگر کبھی وہ بیمار پڑ جاتا تو ماں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے اور اس کا بیمار باپ اپنی بیماری کو بھول کر حکیم کی دکان کے چکر لگاتا۔ اسے یاد آیا وہ حویلی سے رات گئے لوٹتا تھا تو اس کا باپ اس پر برس پڑتا تھا ــــ شاید وہ اس کے انتظار کی گھڑیاں گن گن کر تھک گیا ہوتا تھا۔

اُسے زندگی میں پہلی بار اپنے ماں باپ کی شفقتیں اور محبتیں بھی یاد آئیں۔ پلے نے جیسے اس کے اندر لگے کسی بٹن کو چھو لیا تھا کہ آپ ہی آپ اس کے اندر روشنی ہوتی چلی گئی اور اس نے ان بہت سی باتوں کی طرح جو اس نے بیس پچیس برسوں میں خود ہی سوچ ڈالی۔ انہیں ایک بات اور سوچی کہ حویلی اور اس کے راتب کی غلامی نے اس کے دل میں اپنوں کے بارے میں شکوک پیدا کئے اور اس سے سارا اعتماد چھین لیا اور وہ اپنی جڑوں کو بھول کر راتب ڈالنے والوں کے سامنے دم ہلانے لگا تھا۔

احمد داؤد

حمزہ کی کہانی

ایک روز اچانک حمزہ کی دیوار کی پرلی طرف کا منظر نظر آگیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا ہو جائے گا کہ نہ تو اس کی ایسی کوئی خواہش تھی اور نہ طلب یہ شاید اِس لمحے کا اثر تھا جس میں اس نے غروب ہوتے سورج کو دیکھا تھا ڈوب جانے والا سورج اس کے لیے دل او د دیواریں برہنہ کر گیا۔

شام کا وقت تھا پرندوں کی واپسی ہو چکی تھی۔ نیچے گلی میں مدھم مدھم تاریکی میں چند بچے کھیل رہے تھے۔ پانی کا نل کھُلا ہوا تھا جس سے گرتے پانی کی آواز میں رنگ بدلتے ماحول میں بہت واضح سنائی دے رہی تھی۔ چھت میں دھوپ میں پھیلائے گئے کپڑے سوکھ چکے تھے اور اب زہرہ انہیں اتار رہی تھی لیکن ایسا کرتے وقت اس کی نگاہیں بار بار حمزہ کی پشت پر جا ٹھہرتیں۔ کئی مرتبہ اس نے کھنکار کر، بڑ بڑا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر حمزہ جیسے غروب کی کرن تھا۔ جو اُفق کے پاتال میں اُترا ہوا تھا۔ سیڑھیوں سے نیچے اترتے وقت زہرہ نے ایک مرتبہ پھر اس کو مڑ کر دیکھا اور کپڑوں کا گٹھر کلاوے میں بھر کر نیچے چلی گئی۔

حمزہ اتنا لاتعلق اجنبی اجنبی پہلے تو کبھی نہیں تھا۔ بے پرواہ سا مگر کسی اور خیال میں گم، سامنے مسجد کے میناروں کے عقب سے پھوٹتی سرمئی شام اور ریلوے ورکشاپ کی آہنی چھت کی اوٹ میں جاتے سورج کو دیکھ رہا تھا۔

گول سرخ توے کی مانند دہکتا سورج ہولے ہولے لوہے کی سفید مستطیل ہموار چھت پر غائب ہو رہا تھا۔ دہکتی گولائی اور آہنی مستطیل چھت کے کناروں سے افق کی پٹی تک پھیلی ہوئی تھی جہاں سے سیاہ اور گلابی گرد دھیرے دھیرے چار چفیرے سرکتی نظر آ رہی تھی۔ ڈوب جانے والے سورج کے نتیجے میں ایک گھنا سناٹا ابھر آیا گلی میں شور مچانے بچے گھروں کو چلے گئے۔ کسی نے نل کی ٹونٹی بند کر دی۔ اب ایک بے قرار چپ چھتوں چھت پھیلی شہر کے گرد تنی افق کی زنگ دار پٹی تک جا پہنچی تھی۔ اس بیکراں خاموشی میں اچانک وہ لمحہ جو اس نے غروب کے منظر کے لیے وقف کیا تھا، واپس مڑا۔ اس کے اندر گزرے زمانوں کا شور لیے پلٹا۔ اسے یوں لگا جیسے غروب ہوتا سورج واپس پلٹ کر اس کے وجود کی فضا میں آ چکا ہو۔ اور پھر وہ ہوا جس کی نہ اُسے طلب تھی اور نہ خواہش۔ دل اور دیواریں عریاں ہو گئیں۔

نیچے صحن میں کوئی اس کا نام لے کر پکار رہا تھا

وہ جلدی سے مڑا اور سیڑھیاں اُتر کر نیچے زہرہ کے پاس صحن میں جا کھڑا ہوا

"شام کو چھت پر نہیں گھومنا چاہیئے۔"

اسے زہرہ کی آواز سنائی دی لیکن وہ چپ رہا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اس نے کیسے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہی بات انہی لفظوں میں اسے کہی جائے گی۔ جتنی دیر وہ زہرہ کے سامنے کھڑا رہا اس کے دل میں پیدا ہونے والے سارے خیالات جانتا رہا۔ جوں جوں دل میں پلنے خیالوں کے پرسوے اس تک پہنچتے رہے اس کا اضطراب بڑھتا رہا اور جب وہ جھنجھلا کر اپنے کمرے میں چلا گیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ، وہ حمزہ نہیں جو تھوڑی دیر پہلے چھت پر ٹہل رہا تھا۔

یہ پہلی رات تھی جب اس نے دلوں کے بھید پانے شروع کیے۔ سارے گھر والے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ چھوٹا بھائی کنڈی لگانے

کے بعد اپنی رائٹنگ میز کے قریب کھڑا سگریٹ سلگا رہا تھا۔ حمزہ نے اسے ایک نظر دیکھا اور جان گیا کہ وہ وقت گزاری کے لیے ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے اور منتظر ہے کہ کب رات کا ایک بجے اور چھت پر جا کر پڑوس میں رہنے والی دوشیزہ سے ملاقات کرے۔ حمزہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی ساری بات کا پتہ چل گیا اس نے پریشان سا ہو کر زہرہ کی طرف دیکھا جو تکیے پر بازو پھیلائے اس کی منتظر تھی۔

حمزہ نے لیٹتے ہی آنکھیں بند کرنا چاہیں اور زہرہ کے چہرے کو بصارت کی حدوں سے دور دھکیلنا چاہا' ایسا نہ ہو سکا۔ زہرہ نے بازو اس کی گردن کے گرد لپیٹ دیا اور کچھ کہنے لگی۔ لیکن حمزہ نے قطعاً توجہ نہ دی کہ وہ پہلے ہی جان چکا تھا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔

"ابھی بہت دن ہیں ۔" حمزہ بولا

"کس بات میں ۔" زہرہ نے حیرت سے پوچھا

حمزہ نے آنکھیں کھول کر اس کے پیٹ کی طرف دیکھا اور کہا:

"تم اس کے بارے میں سوچ رہی تھیں اور ـــــ اور ـــــ اس کے ساتھ اور بھی بہت کچھ ـــــ"

زہرہ نے پریشان ہو کر اسے دیکھا اور اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ وہ نہ صرف اپنی کوکھ میں پلتے بچے کے بارے میں سوچ رہی تھی بلکہ اور بھی کئی باتیں اس کے ذہن میں اٹھ رہی تھیں۔ حمزہ نے ان باتوں کی بو پالی۔ اذیت اور شرمندگی سے اس نے دل میں سوچا۔

"دلوں کے بھید پانا کتنا خراب ہے" زہرہ نے اپنے بچے میں محبوب کی تصویر دیکھی تھی اور اب ـــــ اب وہ اسے یاد کر رہی تھی۔

جب میں نے اس کے بازو پہ سر رکھا تو میں ـــــ میں نہیں رہا ـــــ وہ بن گیا۔ دلوں کے بھید جاننا کتنا عذاب ہے مگر کیا پتہ یہ میرا وہم ہو۔

یقیناً یقیناً۔ ایسا ہی ہوگا۔ میں کسی کے دل کا حال کیا جانوں۔

اس نے آنکھیں بند کر کے کروٹ بدلی گہری سانس لے کر ذہن خالی کر کے سونا چاہا۔

یہ پہلی صبح تھی جب دلوں کے بھید آشکارا ہوئے۔

ایک انوکھا، پُراسرار، خوفیلا حیران کن دن تھا۔ جب دفتر جاتے وقت مسافر گاڑی میں بیٹھے لوگ کھلی کتاب کی مانند اس کے سامنے پھیلے تھے وہ حیرت اور خوف سے کانپنے لگا۔

اسے ڈرائیور کی پچھلی سیٹ پر جگہ ملی۔ فرنٹ سیٹ پر دو لڑکیاں بیٹھی تھیں اور ان کے پیچھے والی سیٹوں پر دفتری لوگ، صبح کے تازہ دم مسافر جنہیں کام پر پہنچنے کی جلدی تھی جب کہ اس کے بالکل ساتھ جو شخص بیٹھا تھا اس کے لیے پریشانی کا سبب بن گیا۔

حمزہ نے سہم کر کندھے سکوڑے اور شیشے سے باہر دیکھنے لگا لیکن یہ باہر جھانکنا اب بیکار تھا، اسے ساتھ بیٹھے شخص کے دل کا راز معلوم ہو چکا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ سب کو بتا دے کہ اس کے ساتھ جو شخص بند گلے کا کوٹ پہنے بیٹھا ہے، جس کے گال پر زخم کا نشان ہے۔ جس نے گولڈن واچ پہن رکھی ہے اور جو اپنا بریف کیس قدموں کے پاس رکھے ہوئے ہے، اپنے ذہن میں کسی کو قتل کرنے کا منصوبہ نہایت مہارت کے ساتھ ترتیب دے چکا ہے۔

حمزہ نے سہم کر اس کی طرف دیکھا، کچھ کہنا چاہا مگر بوکھلا گیا۔ اس کی نگاہ پھسل کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھی لڑکیوں کی پشت سے جا ٹکرائی۔ ان میں ایک مکمل عورت بننے کے مراحل میں تھی۔ حمزہ نے انھیں آئینے میں دیکھا اور یک دم دہک گیا۔ وہی مخصوص بے چینی جو متوقع قاتل کی موجودگی میں اس کے اندر پھیلی تھی اب دوچند ہو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ اُس لڑکی کے دل کی بات جو عورت بننے کے مرحل میں ہے، اس کے ساتھ بیٹھی لڑکی کو بتا دے، اسے

مجبور کرے اور اسے منع کرے کہ اتنی دیر بعد ابارشن خطرناک ہوتا ہے۔

حمزہ کو اپنے بدن میں سنسنی پھیلتی محسوس ہوئی۔ اس کا جی چاہا کہ گاڑی سے اتر جائے یا پھر زور زور سے مسافروں کو بتائے کہ ان کے ہمراہ ایک متوقع قاتل سفر کر رہا ہے اور ۔۔ اور ۔۔ ایک لڑکی ۔۔ جو آٹھ ماہ بعد اپنا بچہ ضائع کروانے جا رہی ہے۔ اسے منع کر دو۔ روکو۔ خدا کے لیے اس زندگی کو جو تمہاری کوکھ میں محبت کے گزرے دنوں کی یاد بن کر نمو پا رہی ہے سماج کے خوف سے ضائع مت کرو۔ رک جاؤ ۔۔ رک جاؤ۔

"روک کے استاد جی" کنڈکٹر کی آواز ابھری

"نن۔ نہیں۔ مجھے یہاں نہیں اترنا" حمزہ کے خشک لبوں سے بمشکل نکلا۔

"خود ہی تو کہا ہے رک جاؤ چلو استاد جی" کنڈیکٹر بولا

حمزہ نے شرمسار ہو کر مٹھیاں بھینچ لیں جو بھیگ رہی تھیں۔ آنکھیں میچ کر اس نے آس پاس کی ہر شے سے رشتہ توڑنا چاہا اور جب پلکوں کے سرے آپس میں مل رہے تھے تو اس نے ڈرائیور کا چہرہ دیکھا اور اسے پتہ چل گیا کہ وہ سڑک پر اپنے آگے جاتی تمام گاڑیوں کو کراس کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے

حمزہ نے اگلے دن اخبار کھولا تو اپنے وہم کی خبریں دیکھیں۔ ایک شخص کہ جس کے گال پر زخم کا نشان بند گلے کا کالا کوٹ ۔ پرانی دشمنی پر قتل اور ایک جوان لڑکی آٹھ ماہ کے بچے کو جنم دے کر مر گئی ۔ بچے کے باپ کی تلاش

حمزہ کے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی ۔ ہاتھ گیلے ہونے لگے۔ اس نے چھوٹے بھائی کا مضمون دیکھے بغیر اخبار پرے پھینک دیا۔ لیکن جس طرح مسافر گاڑی میں شیشے سے باہر جھانک کر اس نے ہر شے سے لاتعلق ہونے کی بے کار کوشش کی تھی اسی طرح اخبار پرے پھینک کر اس نے گزرے دن کے احوال کو نظر انداز کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔ اسے بہت سی باتیں جو ہو چکی تھیں معلوم تھیں۔

حمزہ کے ذہن میں زہر گھل چکا تھا۔ وہ جو بات نہ بھی جاننا چاہتا اسے معلوم ہو جاتی۔ دفتر میں اپنے کولیگز کے ذہن میں جنم لینے ارادے، اس کے نہ چاہنے کے باوجود اس کے علم میں آجاتے۔ راہ چلتے لوگوں کے من کے وسوسے خواہشیں، گھر کے بندوں کے دل کے بھید۔ لوگ اس کے سامنے برہنہ ہوتے چلے گئے۔ بری خواہشیں، نیک ارادے، مثبت منفی خیالات، ذلیل گھٹیا فیصلے، فضول شرمناک سوچیں جنہوں نے آگے جا کر عمل کا روپ اختیار کرنا تھا جوں ہی اس کے سامنے کھڑے، بیٹھے یا گزرتے شخص کے ذہن میں اٹھتیں اس تک پہنچ جاتیں۔ اسے معلوم ہو گیا کہ چیئرمین کی سیکرٹری چھٹی کے بعد اپنے دوست کا بس اسٹاپ پر انتظار کرتی ہے اور اپنے تمام کولیگز کو نامرد سمجھتی ہے۔ اسے یہ بھی پتہ لگ گیا کہ چیئرمین نے اپنی پسند کے آدمی کو ٹھیکہ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور تو اور حمزہ کو گلی میں جو کچھ ہوتا ہے معلوم ہے اسے خبر تھی کہ چھوٹا بھائی آدھی رات کو چھت سے گزر کر پڑوس والوں کی لڑکی سے ملنے جاتا ہے اور دونوں بھاگنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اسے معلوم ہو جاتا، جب زہرہ اس کے پہلو میں لیٹ کر کسی اور سے کیا سوچتی۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ ان کے علاقے کا کونسلر ظاہری طور پر حکومت کی مخالفت کرتا ہے تاکہ ساکھ قائم رہے ورنہ اندر سے اس نے اپنی قیمت لگا دی ہے۔ حمزہ کو یہ بھی خبر ہو جاتی اور کہ اس سے مخاطب شخص بات کرتے وقت کیا سوچ رہا ہے۔ لیکن یہ سارا علم، لوگوں کے دل کی بھید، اس کی خواہش اور ضرورت کے بالکل برعکس اس تک پہنچ جاتا۔ اور یہی اس کا عذاب تھا۔ ابتدا میں اسے اپنے اس وصف پر حیرت بھی ہوئی اور سرشاری بھی۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کا خوف بڑھنے لگا گھٹن پھیلنے لگی۔ اس نے دو تین موقعوں پر لوگوں کو ان کے دل کی بات بتائی تو سب نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا:

"تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں یہ سوچ رہا تھا۔"

"بکواس نہ کیا کرو۔ بالکل غلط بات ہے۔"

"بڑا آیا دل کے بھید جاننے والا۔"

"یار بات تو ٹھیک ہے۔ میں بھی سوچ رہا تھا

اچھا۔ اچھا۔ چھوڑو کوئی اور بات کرو

حمزہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ دل کا بھید جاننے کے باوجود زبان نہیں کھولے گا مگر اپنے گھر میں وہ آزاد تھا۔ ایک دن اس نے اپنے بھائی کو بلایا۔

"آدھی رات کو چھت پہ گھومنا ۔۔ اور ۔۔ اور یہ تم نے فرار کا کیا منصوبہ بنا رکھا ہے ۔۔"

چھوٹے بھائی نے حیران پریشان نظروں سے اسے گھورا اور سٹ پٹا کر رہ گیا۔

حمزہ دل میں ہنسنے لگا لیکن ساتھ ہی اسے اس بات کا خوف ستانے لگا کہ کہیں چھوٹا بھائی راز افشا ہونے کی وجہ سے غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے۔ اب اس نے راتوں کو جاگنا شروع کر دیا۔ اسے پتہ تھا کہ چھوٹا بھائی کس وقت چھت پہ جاتا ہے گو کہ اسے یقین تھا کہ اس کے دل میں جو بات آئے گی مجھ تک پہنچ جائے گی لیکن اپنی تشفی کی خاطر رات کو کئی مرتبہ اٹھ بیٹھتا۔

زہرہ نے اسے اس طرح مسہری پہ ٹانگیں لٹکائے دیکھا تو چونک اٹھی

"خیر تو ہے۔ کیا بات ہے۔"

حمزہ نے چونک کر اسے دیکھا اور کلاوے میں بھر لیا لیکن دوسرے ہی لمحے ایک جھٹکے سے خود کو اس سے الگ کر لیا۔ اس ایک لمحے میں اس نے اپنی بیوی کے دل کا چور دیکھ لیا۔ وہی مخصوص سنسنی اس کے جسم میں اٹھی جو بالآخر شرمساری بن کر اس کو کچوکے دینے لگی۔ وہ بڑا جانگسل لمحہ تھا جب اس نے اپنی بیوی کو کلاوے میں بھرا اور زہرہ کئی سال پیچھے چلی گئی۔

"تمہیں اس سے شادی کرنی چاہیئے تھی۔" حمزہ نے تاسف سے کہا

زہرہ کا منہ کھل گیا۔ حیرت اور خوف سے اس کے نقوش بے ربط ہونے لگے

"آ۔ آپ ــــ کیا کہہ رہے ہیں ــ"

"کیا یہ درست نہیں جب میں تمہارے قریب ہوتا ہوں تم کسی اور کو اپنے قریب لے آتی ہو۔"

زہرہ شرم سے دوہری ہو گئی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ حمزہ نے تاسف اور ندامت کے ملے جلے جذبوں کے ساتھ اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

"جب سے مجھے دل کے بھید پتہ چلنے شروع ہوئے ہیں۔ میری زندگی عذاب بن گئی ہے۔ اور ــــ تو اور ــــ تم بھی اپنے دل کی بات نہیں چھپا سکتیں ــــ"

"م ــــ میں ــــ" زہرہ نے کچھ کہنا چاہا ــــ

"میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ کیا یہ درست نہیں کہ پہلی رات ہی سے تم اس شخص کے ساتھ بستر پر موجود ہوتی ہو جس کے ساتھ تمہیں محبت تھی۔ اور ابھی جب میں نے تمہیں چھوا تھا تو تم نے اس کو یاد کیا تھا۔ تم نے اس بات کی خواہش کی تھی کہ کاش میری جگہ وہ یہاں ہوتا۔ تمہارے بچے کا باپ ہوتا۔ سچ بتاؤ کیا تمہارے ذہن میں یہ بات نہیں تھی۔ تمہیں اس بچے کی قسم جو تمہارے پیٹ میں ہے۔"

زہرہ نے اثبات میں سر ہلایا اور بے ہوش ہو گئی۔

ہم دونوں اوپن ایئر میں بیٹھے تھے

حمزہ کئی دنوں سے میری تلاش میں تھا۔ میری اس سے رفاقت پرانے زمانوں سے چلی آرہی ہے۔ سالوں ملاقات میں تعطل رہتا ہے اور جب ملتے ہیں تو یوں جیسے کبھی جدا نہ ہوئے ہوں۔ ہر بار ہماری گفتگو کا آغاز وہیں سے ہوتا ہے جہاں جدائی کے وقت اختتام ہوا تھا۔ ہم قطعاً ایک دوسرے کو تلاش کر کے، فیصلہ کر کے، تاریخ اور مقام کا تعین کر کے نہیں ملتے۔ صرف ایک دوسرے

کی طلب محسوس کرتے ہیں پھر اچانک کسی دن کسی چوراستے پہ، گلی کے موڑ پہ، گاڑی کی متوازن سیٹوں پر، کسی ہوٹل یا شاپنگ سنٹر کے اندر ملاقات ہو جاتی ہے۔

اس دفعہ حمزہ نے میری شدید طلب محسوس کی۔ میری ضرورت اس کے لبوں پہ پیاس کی طرح پھیلی اور جب اس نے مجھے یاد کیا تو میں لپکا اور جس حالت میں تھا اس کی سمت بڑھا اور اب میں اس کے روبرو، اوپن ایئر ہوٹل کی گیارہویں منزل پر بیٹھا تھا۔ نیچے شہر ایک وسیع متحرک کھلونے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اوپن ایئر ہوٹل جو کہ آخری منزل پہ تھا گاہکوں کی رونق سے آباد ہو چکا تھا۔ سورج کی ترچھی کرنیں شیشے کی میزوں سے ٹکرا کر آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ گیارہویں منزل پہ قائم اس نفیس مصنوعی ماحول میں ہلکی ہلکی موسیقی کے درمیان آوازوں کے جھونکے کھڑکیوں کی راہ سے آتی ہوا میں شامل ہو رہے تھے۔ مختلف میزوں پر مختلف عمر کے لوگ بیٹھے اپنی اپنی پسند کی چیزوں سے دل بہلا رہے تھے۔ جن لوگوں کی کرسیاں کھڑکیوں کے پاس تھیں وہ ایک آدھ نگاہ نیچے رواں دواں زندگی سے لبریز شہر پہ بھی نرم مخملی قالین پہ رکھی میزوں کے درمیان گملوں میں قسم قسم کے پودے لگے تھے۔ بیرے ان کے پاس سے گزرتے وقت احتیاط سے قدم اٹھاتے کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔ سامنے جہاں صندلی کاؤنٹر بنا ہوا تھا ایک قد آور بوتل میں لٹکا منی پلانٹ پھیل کر کھڑکی سے باہر ہوا میں جھول رہا تھا۔ ہوٹل کا منیجر اس بوتل کے قریب بیٹھا بل بنا رہا تھا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو دوپہر ہو چکی تھی۔

حمزہ نے پانی منگوا کر چائے کو کہہ دیا۔

میں نے ایک نظر نیچے ڈالی جہاں شہر اپنی پوری عریانی سمیت لیٹا ہوا تھا اس عریاں شہر کو مسلسل دیکھتے میں لوگ خوف محسوس کرتے ہیں۔ میں نے نگاہ واپس موڑی اور حمزہ کو تکنے لگا۔

"میں اس طرح کی ملاقات کا عادی نہیں ہوں۔ خیریت تو ہے؟"

حمزہ نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اس لیے کہ اسے میرے بولنے سے قبل ہی پتہ چل گیا تھا کہ میں کیا خیال کن لفظوں میں ادا کروں گا۔ میں نے اپنی خفت مٹانے کے لیے اوپن ایئر کے گاہکوں کو تکنا شروع کر دیا۔

کونے والی میز پر کھلی کھڑکی سے ٹیک لگائے ایک تنہا عورت کافی بنا رہی تھی۔ اس کا سیاہ چشمہ سفید شیشے کی میز پر دھرا تھا۔ اس کی انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ بے نیازی سے سر جھٹک کر بالوں کو سنوارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتی تو دوپہر کا سورج ہیرے پر اپنی کوند مارتا۔ ایک لشکارا سا پڑتا ایسے ہی ایک لشکارے نے مجھے مجبور کیا کہ میں اسے دوبارہ دیکھوں۔ اس کے گلے میں ایک پتلی سیاہ ڈوری سے بندھا گول ہار آویزاں تھا جس کی وجہ سے اس کی سفید لمبی گردن بہت نمایاں ہو گئی تھی۔ جب اس نے کافی کا مگ اٹھا کر لبوں سے لگایا تو گلے کی شفاف جلد کا تحرک نہایت آسانی سے مجھ تک پہنچ گیا۔ اور جب لبوں سے مگ ہٹا کر اس نے میز پر رکھا تو اس کی گول کلائی اور پتلی انگلیاں اس سارے ماحول پہ چھا گئیں۔ وہ ایک ایسا چہرہ تھا جو کروڑوں قابلِ دید چہروں سے بنا تھا جسے بار بار دیکھنے کی آرزو کی جا سکتی تھی۔

حمزہ نے اچانک کہا

"تمہیں یہ عورت اچھی لگی ہے۔"

میری محویت ٹوٹ گئی

"تمہیں کیسے پتہ چلا۔"

"میں جان جاتا ہوں۔ یہی میرا المیہ ہے۔ مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کیا سوچ رہا ہے۔ لیکن میری بات کا کسی کو یقین نہیں آئے گا۔ کسی کو بھی یقین نہیں آتا۔ میں اس عذاب سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

میں نے پانی کا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

حمزہ نے اپنی بات جاری رکھی "میری زندگی کے سارے ایک۔ اد ختم ہو گئے

اند لوگوں کے لیے جاذبیت نہیں رھی۔ مجھے رستہ بتاؤ۔"

"یہ کیسے ہوا؟" میں نے سوال کیا۔

"ایک شام میں چھت پر کھڑا تھا اچانک مجھے لگا کہ جیسے زہرہ نے مجھے پکارا ہے اور کہا ہے۔ شام کو چھت پہ نہیں گھومنا چاہیئے۔ میں نیچے اتر آیا تو اُس نے یہ الفاظ جو میں پہلے جان چکا تھا ادا کیئے۔ اس کے بعد اَن گنت موقعوں پر میں نے لوگوں کے من میں پلتی بات پائی اور ڈر گیا ہوں۔ یقین کرو، مجھے شرمندگی بھی ہوئی اور خوف بھی آیا۔ میں نے لوگوں کو قتل کے اور اغوا کے ارادے سے غلط انصاف کی نیت سے، سچی محبت کی خواہش میں دھوکا دینے اور ——— اور احسان کرنے اور گھر بار اجاڑنے کی سوچیں لیے۔ ان چیزوں کے بارے میں دل ہی دل میں باتیں کرتے سُنا ہے، دیکھا ہے اور دھی ہوا ہے جو مجھے معلوم تھا۔ جو میں نے جانا تھا۔ مگر کسی کو سُنا نہیں سکتا۔ ایک آدھ بار بتا کر دیکھا۔ بس نہ پوچھو۔ میرا یہ جاننا اذیت بن گیا ہے اور ——— اور اب جانتے ہو کیا ہوا ہے ——— میں نے اپنی بیوی کے دل کا بھید پا لیا ہے۔ زہرہ ابھی تک میرے ساتھ مجبوراً رہ رہی ہے۔ رات مجھے پتہ چل گیا ہے کہ وہ ابھی تک اس آدمی کے ساتھ سانس لیتی ہے جو اس کا محبوب ہے۔ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ اتنی ٹھنڈی کیوں ہے۔ رات میں نے اسے اپنے محبوب سے باتیں کرتے سن لیا ہے۔

حمزہ نے لمبی سانس لیکر گردن میز کی پشت پر ٹکا دی اور ہانپنے لگا

"تمھیں یقین ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔" میں نے تشویش سے کہا۔ "کہیں تمہارا وھم نہ ہو۔"

حمزہ نے مجھے گھورا اور کہا

"——— یہ عورت، تمھیں اچھی لگی ہے۔ بہت سوں کی طرح تمھیں بھی یہ پسند آئی ہے مگر تم اسے آخری بار دیکھ رہے ہو۔ میں اس طرح کی چیزوں

کا عادی ہو گیا ہوں۔ تمہیں پتہ نہیں ناں کہ قبل از وقت جان جانا کتنا عذاب ہوتا ہے۔ اس طرح اس عورت کے بارے میں اگر میں ـــ میں ـــ چھوڑو تمہیں یقین نہیں آئے گا۔"

"کہو کہو۔ میں نے کہا ـــ بات تو کرو ـــ"

"یہ عورت تھوڑی دیر کی مہمان ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کس بات کا فیصلہ ـــ"

"اگر وہ آج بھی نہ آیا تو یہ اپنی قسم پوری کر دے گی۔"

"کون نہیں آئے گا، کس بات کی قسم ـــ" میں نے حیرت سے کہا

"اسے جس کا انتظار ہے اور اس نے فیصلہ کر لیا ہے ـــ اُسے کوئی نہیں روک سکتا ـــ کاش کوئی روک سکتا۔ وہ اپنی موت پر قادر ہو چکی ہے ـــ"

"تمہارا مطلب ہے خودکشی ـــ" میں نے ہنس کر کہا ـــ "کیسی احمقانہ بات کر رہے ہو۔ زندگی سے لبریز عورت کھڑکی سے کود کر مر جائے ـــ"

میں چائے بنانے لگا جیسے یہ ہماری باتوں کے درمیان کسی وقت آ کر رکھ گیا تھا۔

حمزہ نے ایک طویل اداس سانس لے کر گردن آگے کی اور بولا

"کاش میں نہ جان پاتا لیکن اب کیا ہو سکتا ہے ـــ اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

میں نے بے چینی سے حمزہ کو دیکھا اور پریشان سا ہو کر چائے پینے لگا۔ اپریل کی خوشگوار دھوپ اس کے چہرے پر کانپ رہی تھی ـــ ایک ان جانا صدمہ اس کے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ میں اس کی ساری باتوں پر دل ہی دل میں غور کرتا رہا مگر شبہے کے ساتھ، مجھے یقین نہیں تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے اور جب میں آہستہ سے نگاہیں ٹیڑھی کر کے حمزہ کو دیکھتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی متوقع حادثے کو فراموش کرنا چاہتا ہے۔ آنکھیں بند کیے، ہونٹ بھینچ کر، اپنے وجود کی پوری توانائی

کے ساتھ کسی چیز کو بھلا رہا ہے۔

نہ جانے کتنی دیر گذر گئی۔ کرنیں ذرا ترچھی ہونے لگی تھیں۔ میں نے ہلکے سے اُسے پکارا تو اس نے آنکھوں کے کناروں سے مجھے تکتے ہوئے کہا "تم بے یقینی میں مبتلا ہو اور خوف زدہ بھی ہو۔ تم اسے جا کر اس فعل سے روکنا چاہتے ہو۔ اس سے باتیں کرنا چاہتے ہو۔ اور ــــ اور ــــ تمہیں میرے دعوے پر اعتبار بھی نہیں۔ تمہارے اندر اس وقت متضاد ارادوں کے بگولے اٹھ رہے ہیں ــــ"

اُس نے اپنی بات ختم کی اور گہری اداس آہ بھر کر چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اچانک یکایک مجھے دیوار کی پرلی طرف کا منظر نظر آ گیا۔ وہ سچ کہہ رہا تھا مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ اوپن ایئر کی کھُلی فضا میں جھکتے سورج کی چمکیلی دھوپ کی رنگت بدلنے لگی۔ گاہکوں کا شور بڑھ گیا۔ موسیقی کی آواز اونچی ہو گئی۔ بیروں کے قدم خواہ مخواہ گملوں سے ٹکرانے لگے۔ برتنوں کی بے جا کھڑکھڑاہٹ گیارہویں منزل پہ ناپسندیدہ عنصر بن کر سنائی دینے لگی۔ قدِ آدم شیشے کی بوتل میں لگا منی پلانٹ اچانک سمٹ کر سوکھ گیا اور یہ سب اس کے عظیم مصمّم ارادے کے طفیل تھا جو اس عورت میں پیدا ہو چکا تھا اور جسے بدلنے کے لیے میں نے اپنی جگہ چھوڑی تھی۔ مگر اب دیر ہو چکی تھی کہ جب میں اپنی جگہ سے اٹھا تو وہ مستطیل کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر اپنے لباس کی شکنیں درست کر رہی تھی۔ اس نے بالوں کو نفاست کے ساتھ ایک ترتیب عطا کی۔ گلے میں لٹکے ہار کا زاویہ درست کیا گہری سانس لیکر آسمان سے زمین تک ایک خالی خالی نگاہ دوڑائی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ایک نا ختم ہونے والے سفر پہ روانہ ہو رہی ہے۔ میں لپک کر اس کی طرف بڑھا مگر میرا پاؤں راستے میں رکھے گملے سے جا ٹکرایا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس نے نہایت اعتماد کے ساتھ اپنا پُرسکون چہرہ ہلکے

سے اوپر اُٹھایا آنکھیں بند کیں اور گہرے تیقن کے ساتھ ہوا میں اپنا پہلا قدم رکھا۔

میں نے اسے اپنے سامنے گیارہویں منزل سے نیچے جاتے دیکھا لیکن یقین نہ کیا۔

میں نے اس کے دل کا بھید حمزہ سے پایا پر اعتبار نہ آیا۔ میں یقین و اعتبار سے محروم شخص سوا نیزے پر آئے سورج کی تپش میں جھلستی چیزوں میں ایک چیز اپنے گرد حمزہ کے زندہ قہقہے کو محسوس کرتا ہوں۔

دنوں کے مقدر میں گزر جانا لکھا ہوتا ہے۔ ان گزرتے دنوں میں کبھی کبھار میں حمزہ کو ملنے فونٹین ہاؤس[1] چلا جاتا ہوں۔ اس کی حالت اب قدرے بہتر ہے۔ پہلے وہ دوسروں کے من کے بھید جان جاتا تھا۔ اور اب اپنا حسب نسب اور حال جاننے کے لیے اسے دوسروں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔

---

[1]: فونٹین ھاؤس: ذہنی مریضوں کا ہسپتال۔

مظہر الاسلام

گاچنی

میں آج پھر افسانہ لکھنے بیٹھ گیا ہوں جس کا کلائمکس اس نے پھاڑ دیا تھا۔

سارے دن کی چلچلاتی دھوپ کے سائے پچھلے پہر کے بعد لمبے ہو رہے تھے اس لئے گرمی کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ میں اپنے گھر کے چھوٹے سے لان میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ چڑیاں جو گرمی سے گھبرا کر اپنے گھر کے چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ بیل کے اندر اپنے گھونسلوں میں لوٹ آئی تھیں اور ان کی چہچہاہٹ گھنی بیل کے اندر پھدکتی پھر رہی تھیں۔ مرجھائے پھول آہستہ آہستہ اپنی پتیاں یوں پھیلا رہے تھے جیسے کوئی مریض ہوش آنے کے بعد اپنی مٹھیاں کھول رہا ہو۔ ایسے میں عجیب اتفاق ہوا حیرت کے مارے میری کیفیت پتھر کے مجسمے جیسی ہو گئی۔ ہوا یوں کہ گھونٹ پینے کے بعد چائے کی پیالی میز پر رکھی ہی تھی کہ کسی نے پیالی اٹھالی اور گھونٹ لینے کے بعد پھر میز پر رکھ دی۔ میں نے بےچینی اور گھبراہٹ کے عالم میں ایک اور گھونٹ لیا اور حیرانی سے تنی ہوئی آنکھیں اِدھر اُدھر گھمائیں لیکن وہاں میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی غرض سے کہ محض میرا وہم ہے میری پیالی سے کسی نے چائے نہیں پی۔ لیکن جب پیالی میں آخری گھونٹ رہ گیا تو کسی نے پھر سے پیالی اٹھالی اور خالی کرنے کے بعد واپس میز پر پڑی خالی پرچ میں رکھ دی تب مجھے یقین ہو گیا کہ واقعی میری پیالی سے کوئی اور بھی چائے پی رہا تھا۔ میں نے سوچا آخر وہ کون ہے جو میری جھوٹی چائے پی

رہا تھا اور مجھے بھی اپنی جھوٹی چائے پینے پر مجبور کر رہا تھا لیکن کوشش کے باوجود میں اس کا سراغ نہ لگا سکا اور پھر یہ معمول بن گیا اور میں جب بھی چائے پینے لگتا تو کوئی دوسرا بھی چائے پینا شروع کر دیتا لیکن یہ عجیب بات تھی کہ میرے ساتھ چائے پینے والا مجھے دکھائی نہ دیتا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا کہ شاید وہ نظر آجائے لیکن میری ساری کوشش ضائع چلی جاتی تھیں۔ بات یہیں تک رہتی تو ٹھیک تھا ابھی کل ہی کی بات ہے جب میں کھانا کھانے بیٹھا اور روٹی کا ایک نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا ہی تھا تو اس نے دوسرا نوالہ توڑ لیا۔ میں نے ہاتھ کھینچ لیا اور خاموشی سے بیٹھ گیا کہ دیکھوں کوئی نوالہ توڑتا ہے کہ نہیں۔ روٹی میرے سامنے پڑی تھی اور اس میں سے دو نوالے ٹوٹے ہوئے تھے۔ کافی دیر کے بعد جب کسی نے نوالہ نہ توڑا تو میں کھانا کھانا شروع کیا۔ وہ بھی شروع ہو گیا اور مجھے محسوس ہوا کہ نوالہ توڑنے کے بعد وہ بھی نوالہ توڑ لیتا ہے۔ اور اب میں اس صورتحال سے اس قدر خوفزدہ ہو گیا ہوں کہ کسی کو بتانے سے بھی ڈرتا ہوں۔

عالم یہ ہے کہ جب میں اکیلا کہیں گاڑی میں جا رہا ہوتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرے ساتھ والی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہوا ہے مجھے اس کے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی ہے۔ جب میں سگریٹ سلگاتا ہوں اور اس کا دھواں پھیلنے لگتا ہے تو کوئی دوسری سیٹ کے ساتھ والے دروازے کا شیشہ آہستہ آہستہ نیچے سرکا دیتا۔

کئی دنوں سے میں اس سوچ میں ہوں کہ وہ کون ہے سامنے کیوں نہیں آتا۔ وہ کوئی عورت ہے یا مرد، انسان ہے یا جن اور وہ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ پھر جب اسے دیکھنے کی حسرت میں میری آنکھیں بری طرح تھک گئیں تو میں نے اُسے سونگھنے کی کوشش کی کہ شاید میں اس کی خوشبو سے اسے پہچان سکوں لیکن اس کی خوشبو نے میری حیرت میں اور اضافہ کر

دیا اس کے جسم سے اردو میڈیم سکول کی دوسری جماعت کے کلاس روم جیسی مہک آرہی ہے جس میں سیاہی گاچنی اور ٹاٹوں کی مہک ملی ہوئی تھی۔ پھر اچانک بچوں کے پہاڑا یاد کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔

اک، دونی دونی

دو دونی چار

میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا وہاں کوئی نہ تھا پہاڑا یاد کرنے والے بچوں کی آوازیں شاید اس کے جسم کے اندر سے آرہی تھیں۔ میں نے سامنے پڑی ہوئی پیالی اٹھائی اور چائے کا ایک گھونٹ لینے کے بعد میز پر رکھ دی۔ میں نے پیالی کی طرف دیکھا تو مجھے ایسے لگا جیسے بہت بڑے راز کا انکشاف ہو گیا ہو۔ اس کی لپ سٹک کا رنگ اس کے ہونٹ پیالی پر ہی چھوڑ گئے تھے۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ نشان مٹا رہی ہو۔ میرا جی چاہا کہ میں تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کا نشان نہ مٹانے دوں لیکن ہمت نہ ہوئی اور جب سے مجھے پتہ چلا ہے کہ کوئی لڑکی ہے تو میں حیرت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ حالانکہ وہ مجھے نظر نہیں آتی لیکن جونہی وہ آتی ہے میرے اردگرد کسی اُردو میڈیم سکول کے دوسری جماعت کے کلاس روم کی مہک پھیل جاتی ہے اور پہاڑا یاد کرنے والے بچوں کی آوازیں میرے کانوں کے گرد گھیرا ڈال لیتی ہیں۔

اک دونی دونی

دو دونی چار

میں اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ کسی بات کا جواب نہیں دیتی اس دن میں نے افسانہ لکھ کر دیکھا تو اس نے افسانے کا کلائمکس پھاڑ دیا۔ پھر میں نے اپنی ڈائری پر لکھا کہ آج کل ایک لڑکی میرا پیچھا کر رہی ہے۔ وہ میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتی ہے مگر مجھے

نظر نہیں آتی۔ اس کے جسم سے بچوں کے پہاڑا یاد کرنے کی آوازیں اور دوسری جماعت کے کلاس روم جیسی مہک آتی ہے۔ اس نے میری ڈائری کا وہ ورق بھی پھاڑ کر پھینک دیا۔ میں نے اس طرف منہ کر کے جس طرف مجھے اندازہ تھا کہ وہ بیٹھی ہے قدرے غصہ سے کہا آخر تم چاہتی کیا ہو۔ تم نے میرے افسانے "اینٹی کلائمکس" اور ڈائری کا ورق کیوں پھاڑا ہے۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے اس کے کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی اور پھر دوسری جماعت کے کلاس روم کی مہک اور پہاڑا یاد کرنے والے بچوں کی آوازیں دور ہٹنے لگیں۔ میں نے سمجھا وہ مجھ سے ناراض ہو کر چلی گئی ہے۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں گھر سے باہر آیا اور گاڑی سٹارٹ کی تو ساتھ والی سیٹ کا دروازہ کھلا اور اردو میڈیم سکول کے دوسری جماعت کے کلاس روم کی مہک میرے چاروں طرف پھیل گئی اور بچوں کے پہاڑا یاد کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔

ایک دونی دونی

دو دونی چار

میں سمجھ گیا کہ وہ آ کر میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا بتاؤ تو سہی تم کون ہو؟ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ گاڑی مہک اور پہاڑا یاد کرنے والے بچوں کی آوازوں سے لبالب بھری ہوئی تھی اور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ٹریفک کا شور ہزار ہا میل سے آرہا ہے۔ اچانک مجھے ایک جگہ بریک لگانی پڑی۔ بریکوں کی چیخ گونجی تو ساتھ والی سیٹ سے ہلکی سی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی سی چھا گئی۔ مارکیٹ سے میں نے کچھ چیزیں خریدیں تو کسی نے سگریٹ کا ایک کارٹن شاپنگ باسکٹ میں رکھ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اسی نے رکھا ہے اور جب میں بل ادا کرنے کے لیے کاؤنٹر پر پہنچا تو

مینجر نے بتایا کہ بل محترمہ نے ادا کر دیا ہے۔ میں نے مینجر سے تفصیل اس لیے نہیں پوچھی کہ بات کہیں لمبی نہ ہو جائے۔ جب میں نے گاڑی سٹارٹ کی تو ساتھ والی سیٹ پر اسے محسوس کر کے کہا تم نے بل ادا کر کے اچھا نہیں کیا۔ لیکن اس نے میری اس بات کا بھی کوئی جواب نہ دیا اور اب تو مجھے اس پراسرار لڑکی پر غصہ آنے لگا ہے اور میں نے اس سے کہہ دیا ہے۔ یا تو کھل کر سامنے آؤ یا میرا پیچھا چھوڑ دو اور اگر تم بولنا نہیں چاہتی تو لکھ کر بتا دو کہ تم کون ہو اور کیا چاہتی ہو۔ تم نے میرا بل کیوں ادا کیا ہے لیکن جیسے اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ اب بھی وہ میری پیالی سے چائے پیتی ہے۔ میرے ساتھ کھانا کھاتی ہے اور جب آتی ہے تو اس کے جسم سے اردو میڈیم سکول کے دوسری جماعت کے کلاس روم جیسی مہک اور بچوں کے پہاڑا یاد کرنے کی آوازیں آتی ہیں۔

اک دونی دونی

دو دونی چار

کل سے میری حالت عجیب ہو گئی ہے۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آتی اور جب میں نیند کی گولی کھانے کے لیے الماری کی طرف بڑھتا ہوں تو وہ نیند کی گولیوں کی شیشی اٹھا لیتی ہے اور پھر مجھے اس کے پرس کی دھک سنائی دیتی ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں تم بتاتی کیوں نہیں کہ تم کون ہو۔ میں نے کئی بار کہا ہے کہ لکھ کر ہی بتا دو کہ تم کون ہو اور پھر میں نے اسے دھمکی دے دی کہ اگر تم نے مجھے نہ بتایا کہ تم کون ہو تو میں خودکشی کر لوں گا۔

میری اس بات کا اس پر بے حد اثر ہوا ہے اور اب وہ کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھ کر چھوڑ گئی ہے۔ کاغذ کا یہ پرزہ اب بھی میرے سامنے کھلا پڑا ہے مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ اس پر کیا لکھا ہے۔ میں

اس کاغذ پر لکھے لفظوں کے رنگ اور خوشبو کو تو محسوس کرتا ہوں لیکن انہیں پڑھ نہیں سکتا۔

مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہزاروں بچے میرے اردگرد بیٹھے اپنی تختیوں پر گاچنی مل مل کر پہاڑا یاد کر رہے ہوں۔

اک دونی دونی

دو دونی چار

اور چاروں طرف اُردو میڈیم سکول کے دوسری جماعت کے کلاس روم کی مہک پھیلی ہوتی ہے۔ پھر مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی نے گاچنی کا ڈھیلا میرے مُنہ میں رکھ دیا ہے اور گاچنی میری زبان پر گھلتی جا رہی ہے۔

مرزا حامد بیگ

صیدِ زبُوں

یہ گرمیوں کی ایک دوپہر کا قصہ ہے۔

جب سارا دن تیز گرم لو چلتی رہی تھی۔ بستی کی پر پیچ گلیوں میں مٹی بولائی پھرتی تھی اور چیلیں انڈے چھوڑ گئی تھیں۔

ایسے میں اس بھری پُری آبادی میں ایک وہی تھی جو اپنے گھر سے باہر نکل آئی تھی۔ یہ سب اس کے معمول کے خلاف تھا۔ لیکن ہوا۔

بس پھر کیا تھا، ایک ہنگامہ بپا ہو گیا تھا۔

اس ہنگام کی وجہ کیا تھی۔ کچھ پتہ نہیں۔ یہی سنا ہے کہ وہ ایک سانولی، متناسب گُتا ہوا وجود تھا، اس کی غزالی آنکھیں، ستواں ناک، فراخ پیشانی اور صراحی دار گردن کی چھب نظروں میں نہیں سماتی تھی۔ ایک ہرنی تھی ہرنی جو پوری آبادی میں قلانچیں بھرتی۔ دلوں کو دھڑکن بلاتی ہر طرف پھرتی تھی۔ سب اسے دیکھ کر جیتے تھے۔ اس کے دم سے سارا جگ سانس لیتا تھا اس کا کہا کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس کی مرضی سب کی مرضی تھی لیکن اس کا انجام اچھا نہیں ہوا۔

اس کا سولہواں سال تھا جب وہ بدنام ہوئی ہے

دھان پان سا ناجو، جس کی ابھی مسیں بھیگی نہیں جانے کتنا عرصہ اُسے آتے جاتے سب سے ہنستے بولتے دیکھتا رہا تھا۔ اور اس

سے رہا نہ گیا تھا اور وہ اپنے گھر سے نکل آئی تھی۔

اس چلچلاتی دھوپ میں راجہ آگے بڑھا۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا اور کہہ نہ سکا تھا۔ گلی ویران تھی اور دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن جانے کب اور کیسے، جیسے سب نے انہیں دیکھ لیا۔

کمیں نے بتایا نا کہ وہ قلا نچیں بھرتی دلوں کو دھڑکن بلانی، ساری آبادی میں بھری ہوئی تھی۔ اس کا کہا کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس کی مرضی سب کی مرضی تھی لیکن اس دن سب نے اسے جھٹلا دیا۔

اس دن کسی نے اس کی نہیں سنی۔ سب اپنی اپنی کہہ رہے تھے۔

کسی نے کہا

"ان کا روز کا ملنا جلنا تھا۔"

کیمے نے اس کی بات کاٹی!

"تم کیا جانو ——— جو کچھ ان گنہگار آنکھوں نے دیکھا ہے۔"

فیکے نے لقمہ دیا۔

"کیوں بھئی تاجے، سب کو بتلا ہی دوں، جو کچھ گئی رات ہوا ہے۔ ہم دونوں تو موقع کے گواہ ہیں۔"

بڑھتے ہوئے ہجوم کے بیچوں بیچ، وہ دونوں مجرموں کی طرح نہیں بلکہ سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سیدھے کھڑے رہے تھے لیکن کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور حیص بیص جڑیں کر گئی تھی۔

پھر جانے کب سوچ کر راجہ ایک طرف کو نکل بھاگا

قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اس کی تو محض اکھی میں بھیگی تھیں۔ اس کے نکل بھاگتے ہی سب نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

کیمے نے فیکے کی ہاں میں ہاں ملائی اور فیکے کی تصدیق تاجے نے کر دی۔

ہوا کیا تھا۔

یہ جاننے کی کسی کو کیا پڑی تھی

اور یہ کہ اُس کا سولہواں سال تھا جب وہ بدنام ہوئی ہے ۔ اس کا کہا کوئی ٹال نہیں سکتا تھا ۔ لیکن اس دن اُس کی کسی نے نہیں سنی وہ اپنی ایڑی کی جب سُکھ میں ڈوب کے ناچا کرتی تھی ۔

پھر کسی نے اسے بازار سے بلوایا ہے اور اسے پھر تک چھوٹے لوگوں کا بڑا ہجوم ستا جا رہے دھو چلا ہے ۔

اس منظر کے بعد وہ اپنے گھر کے ایک تاریک گوشے کی تاریکی بن کر رہ گئی پھر اسے کسی نے نہیں دیکھا ۔

اس کے بغیر بستی سوتی تھی ساری آبادی تو اسے دیکھ کر جیتی تھی اس کے دم سے سارا جگ سانس لیتا تھا لیکن جب اس بات کا سب کو احساس ہوا تو وہ اپنے گھر کے ایک تاریک گوشے کی تاریکی بن چکی تھی ۔

کیسے کیسے اور ناچے نے سر جوڑے تب راجے کی ڈھونڈیا پیٹی اب تک دا بہ بات کہاں چھپا رہا تھا ۔ اس ہنگام کے دو روز بعد رات کا آخری پہر ہوگا جب وہ سب سے چھپتا چھپاتا جنگلی سڑک کو چڑھ گیا ۔

زمانے بیت گئے ۔ اس کا کچھ پتہ نہ چلا

بچوں نے اس سے نفرت کرنا اپنے بڑوں سے سیکھا اور بڑے بوڑھے اس سے نفرت کا اظہار کرتے ۔ منہ سے کف اڑاتے ہزیان بکتے عمروں کی ڈھلوان سے نیچے اتر گئے ۔

اس نے کیا ہی کچھ ایسا تھا کہ سب حیران تھے ۔ اس کا جرم اپنے پرایوں کے وہم و گمان سے باہر تھا ۔ سب سنتے تھے اور سن کر رہ جاتے تھے ۔ پر جب سب طیش میں آکر اٹھے تھے تو وہ غائب تھا ۔ ڈھونڈیا پڑی ۔ نیچے کی زمین اوپر اور اوپر کی نیچے کر دی گئی ۔ اس کی کہیں خبر نہ ملی

زمانے بیت گئے ، لوگ بھول بھلا گئے ۔

ایک دن پتہ چلا کہ راجہ گذر گیا ——— خون تھوکتا ہوا

اس کی موت کی خبر نے نئی نسل کے ذہنوں میں اسی بھولی بسری یاد کی کروٹ دی۔ لیکن انہیں اس گئے وقتوں کے قصے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

اکا دکا پرانے لوگوں نے راجے کی موت کا سنا اور ایک دوسرے سے پوچھا "اصل قصہ کیا تھا"

کوئی ایسا نہ تھا جو آنکھوں دیکھی کہتا۔ بس ایک دوپہر کا قصہ تھا۔ جب کیمے قیسے اور راجے نے آپس میں سر جوڑے تھے اور یہ کہ حبیص بیص بجڑیں کر گئی تھی، پھر لوگ اکٹھے ہوتے گئے اور بس ——— ۔ کسی نے اس سالخوردہ تنا سب کسے ہوئے وجود کو یاد کیا جسے دیکھ کر سارا گاؤں سانس لیتا تھا۔

ادھر اپنے گھر کے تاریک گوشے میں اس نے بھی سنا

"گذر گیا ——— خون تھوکتا ہوا"

تب وہ ہڈیوں کا ڈھانچ اور جھریوں کی مٹھی سینہ کوبی کرتی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ پیٹتی ہوئی باہر نکل آئی۔

اس نے گلی میں نکل کر ہر گزرنے جانے والے کو روک روک کر بتایا

"لوگو ——— میرا سولھواں سال تھا جب وہ نامرد، مجھے پوری آبادی کے بیچ تنہا چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا، آخر گذر گیا ——— خون تھوکتا ہوا۔"

کون گذر گیا

نئی نسل اس کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتی تھی۔ انہوں نے تو اس سے نفرت کرنا اپنے بڑوں سے سیکھا تھا اور بڑے اپنی عمر کے ڈھلوان سے نیچے اتر گئے تھے۔

اب وہ تاریک گوشے کی تاریکی، ہڈیوں کا ڈھانچ اور جھریوں کی مٹھی آبادی میں ہر طرف قہقہے لگاتی پھرتی ہے۔ اس سے تعفن کے بھبکے اٹھنے

ہیں۔ جس دہلیز پر بیٹھ جاتی ہے گھر اجاڑ کر رکھ دیتی ہے کون ہے جو اس کا سامنا کرے۔

غلاظت پھانکتی اور جوہڑ کا بدبودار گدلا پانی پیتی ہے اور کہتی ہے۔

"غلیظ روح تو دنیا سے اڑ گئی۔ اب کیسی غلاظت؟"

بستی اجڑ کر رہ گئی ہے۔

کبھے، فیکے اور ناجے کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں اور وہ ایک بار پھر آپس میں سر جوڑے ہوئے ہیں۔

اسد محمد خاں خالد

شہر کوفے کا محض ایک آدمی

ایک ایسے آدمی کا تصور کیجئے جس نے کوفے سے امامؑ کو خط لکھا ہو کہ میرے ماں باپ فدا ہوں، آپ دارالحکومت میں ورود فرمایئے حق کا ساتھ دینے والے آپ کے ساتھ ہیں اور وہ آدمی اپنے وجود کی پوری سچائی کے ساتھ اس بات پر ایمان بھی رکھتا ہو۔ مگر خط لکھنے کے بعد گھر جا کر سو گیا ہو۔

جیم الف ایسا ہی ایک آدمی ہے (بلکہ شاید یہ وہی آدمی ہے) جسے مسلم بن عقیل کے واقعے کی خبر ملی تو اس نے زانو پیٹ لئے، گریباں چاک کیا، بہت دیر تک روتا رہا۔ پھر اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور سو گیا۔

اُدھر گواہی دینے والے آسمان چشم بچوں نے نہر فرات کے کنارے خیمے گاڑے اور صبر کی تاریخ شروع ہوئی۔

جب دس ہزار دینار زادوں نے امامؑ کے مقابل صف بندی کی تو یہ آدمی زیتون کے روغن میں اپنی روٹی چور چور کر کھا رہا تھا۔ پاس ہی دودھ بھرے پیالے میں حلب کے خرمے پڑے بھیگتے تھے اور شیشے کے ایک ظرف میں کوئی عرق تھا اور یہ ظرف یخ سے زیادہ سرد ہو رہا تھا۔

خبر ملی کہ اشرار آمادۂ فساد ہیں تو اس آدمی نے روغن میں ستے ہوئے دونوں ہاتھ طمانیت کے ساتھ اپنے چہرے پر ملے اور کہنے لگا امامؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق غالب آنے والا ہے۔ پھر اس نے ڈکار لی۔ امامؑ کو یاد کیا اور ان

کے لئے اور ان کی حمایت کے لئے اللہ کی نصرت طلب کی اور دستر خوان کے برابر پڑے تکیے سے ٹیک لگائی، پھر رہیں کروٹ بدے کر سو گیا۔

جب خبر آئی کہ بچوں پر پانی بند کر دیا گیا ہے تو روتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ کی ایک ضرب سے عرق کے ظروف اوندھا دیئے اور پکار کر کہنے لگا کہ وائے افسوس! سگِ دنیا ابن زیاد نے اور اس کے کتوں نے اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ اس بار وہ بہت دیر تک روتا رہا اور کرب و انتشار میں جاگتا رہا۔ کہیں صبح ہوتے ہوتے اسے نیند آئی۔

پھر پتا چلا کہ ایک پاکیزہ خصلت جوان بچوں اور بیماروں کے لئے بھرا ہوا مشکیزہ لاتا تھا کہ بدخصالوں کے ہاتھوں شہید ہوا۔ یہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب کے اس نے ایک پہر نالہ و شیون کیا اور سینہ زنی کی اور اب کے بھوک اور پیاس اور نیند اس سے رخصت ہو گئے، اور یہ سوچتا رہا کہ کچھ کرے، اس لئے کہ ان حادثوں کے لئے اس کا دل خون رہتا تھا۔

سو اس نے کچھ اور نہ کیا بس گڑگڑا کر دعا کی کہ بارالٰہا! تیرے محبوب کی آل اپنے گھروں سے نکلی ہے اور تو جانتا ہے کہ یہ لوگ حق پر ہیں اور تو ہی ان کا حامی و ناصر ہے ــــ پھر کیوں کہ اس تمام کاوش سے یہ کسلمند ہو گیا تھا اس لئے روتے روتے اس نے کچھ دیر کو آرام کیا اور دیوار سے ٹکے ٹکے سو گیا۔

پھر کسی نے پکار کر کہا کہ سگِ دنیا شمر ذوالجوشن نے کسی بھیانک جرم کے ارادے سے امامؑ کی طرف گھوڑا بڑھا دیا ہے تب اور تب ہی یہ چیخ مار کر اٹھا ــــ یہ بالآخر اٹھا اور اس نے عجیب کام کیا کہ اپنے چھپر کو سہارنے والی تھونی جھٹکے سے اکھاڑ لی۔ اسے گرز کی مانند گردش دیتا ہوا نہر فرات کی طرف بڑھا اور حق تو یہ ہے کہ ملحے بھر کو اس نے یہ نہ سوچا کہ اس چھپر کے نیچے اس کی عورت اور اس کے بچے بیٹھے ہیں۔

بلاشبہ امامؑ کے لئے اس کی محبت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔

یہ چیبر کی تھوتھنی اٹھائے دوڑا جاتا تھا اور شر پسندوں، بدخصالوں، قاتلوں کے لئے اس کے پاس کلمات نا ملائم تھے اور کبھی کبھی یہ فحش کلامی بھی کرتا تھا اس لئے کہ سخت آزردہ تھا اور لگتا تھا کہ اُن ہزاروں سگانِ دنیا کو، کہ جو بچوں، گواہی دینے والوں کو قتل کرنے آئے تھے، یہ اپنی مغلظات سے پارہ پارہ کر دے گا۔ اس کی فحش کلامی کچھ عرصے تک جاری رہی پھر بند ہو گئی۔ کس لئے کہ آگے مقامِ ادب تھا۔ آگے وہ مطہر سماعتیں تھیں جنہوں نے مقدس رسولؐ کو کلام فرماتے سُنا تھا۔

تو بس ایک لمحے میں اس کی وابستگی اور اس کے باطن کی سچائی نے ظہور کیا اور اس ایک لمحے میں کہ شمر نجس کا وار امامؑ پر ہوتا اور انسانی تاریخ کا سب سے بھیانک جرم سرزد ہو جاتا۔ اس ایک لمحے میں یہ شخص امام اور قاتل کے درمیان کھڑا تھا۔۔

۔۔۔ پھر اس نے ایک دل ہلا دینے والا نعرہ کیا اور اپنی ٹیڑھی میڑھی لاٹھی سے ایسی ایک ضرب لگائی کہ شمر ذوالجوشن اپنے خود کی نخس چوٹی سے اپنے مرکب کے زنگ آلود نعلوں تک ہل کر رہ گیا اور لکڑی ٹوٹ گئی۔

تب شمر نے گھوڑے کو مہمیز کیا اور اسے جو بہت تاخیر سے اور تنہا ہی اپنے ذی حشم مہمان کی سپر بننے آنکلا تھا ــــ اسے روندتا مسلتا ہوا اپنے آخری جرم کی طرف بڑھ گیا۔ یہ شخص گرا ــــ دودھ، پنیر، شہد اور روغنِ زیتون اور تازہ خرمے سے پلا ہوا اس کا بدن امامؑ پر تصدق ہو گیا۔

اور پھر وہ آخری جرم سرزد ہوا جس نے ترائی پر چمکنے والے سورج کو سیاہ کر دیا ــــ اور رات آگئی اور رات میں کسی وقت بلند قامت گھوڑوں پر سوار حُر بن ریاحی کے قبیلے والے آئے اور صرف اپنے آدمی کا لاشہ اٹھا لے گئے۔

اور پھر زمرد اور یاقوت اور مشک و عنبر کے بہتر تابوت لے کر تاریخ آئی۔ جس نے بہتر آسمان شکوہ لاشے سنبھالے۔ اُن میں ایک سربریدہ لاشہ صبر و رضا والے کہ استقامت والے امامؑ کا تھا کہ جن کا قدم بلندی پر تھا سو انہیں بادلوں

پر جگہ ملی۔

پھر سگانِ دنیا کے ورثا اپنے مسخ شدہ حرام مردے کھینچ لے گئے اور میدان خالی ہو گیا۔

مگر یہ آدمی (کہ جس کی کہانی میں نے سنانی شروع کی ہے) یہ وہیں پڑا رہا۔ شمر کے گھوڑے کی لید میں سنے ہوئے اس کے سری پائے بھیجہ اور قیمہ وہیں پڑا رہ گیا جسے صبحدم چیونٹیوں کی پہلی قطار نے دریافت کیا اور آہستہ آہستہ منہدم کرنا شروع کر دیا —— اور یہ انہدام تادیر جاری رہا۔

تو ایک ایسے آدمی کا تصور کیجئے جس نے امام کو خط لکھا ہو اور خط لکھنے کے بعد گھر جا کر سو گیا ہو۔ مگر ایک آخری لمحے میں اپنے باطن کی سچائی اور اپنی وابستگی کا اظہار کرے اور عجیب طرح سے مقبول بارگاہ ہو۔ ایک ایسے آدمی کا تصور کیجئے —— یہ آدمی جیم الف۔ ہوگا (جس کی کہانی میں اس وقت سنا رہا ہوں)

مگر جیسے یہ چند سطریں لکھ کر میں نے سب سے پہلے سنائیں وہ جیم الف تو ایک چھوٹے سے گھر میں لکھ لکھا کر اپنے چھوٹے سے کنبے کو پال رہا ہے۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی سبک باتوں سے گاتی گنگناتی دکھ سہتی ہوئی غزلیں بناتا ہے اور ایک چھوٹی زبان کے چھوٹی چھوٹی اشاعتوں والے جریدوں میں چھپوا دیتا ہے۔ پکی روشنائی میں اپنا نام چھپا ہوا دیکھ کر خوش ہو لیتا ہے۔ مشاعروں میں گا بجا لیتا ہے۔ نہ کبھی اس سے بڑے گناہ سرزد ہوئے نہ اس نے خیر کا کوئی بڑا کام کیا۔ چھوٹی موٹی نیکیوں پر اور ہلکی پھلکی معصیتوں پر اس کا گزارہ ہے۔ میں نے سید الشہداؑ کے نام نامی کے ساتھ اس آدمی کا تذکرہ کرنے کی جسارت اس لئے کی کہ میں اس کی وابستگیاں بتا دینا چاہتا ہوں۔

تو سنیئے بات کوئی پرانی نہیں ہے۔ یہ آدمی ایک بار کسی مشاعرے میں

بلوایا گیا تو میزبانوں سے کہنے لگا "مجھے پیسے نہ دو۔ یہاں سے بیت اللہ قریب ہے مجھے شہر بالکل پیدل، تمہارا کوئی زیادہ خرچ بھی نہ ہوگا۔" پھر عمرہ کرنے گیا تو طواف کرتے ہوئے بچوں کے پن سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ سمجھو تو اتنی عمر میں اس سے یہی ایک نیکی صادر ہوئی ـــــ یا اسے اس کی بی بی کہہ لو۔ کہہ رہا تھا "میں نے حرم شریف میں دنیا کے پہلے مظلوم اور مستقیم آدمی سے لے کر فلسطینیوں تک سب کے لئے دعا کی اور رونا مجھے اپنی ضلالت اور بے بسی پر آتا تھا کہ میں اگر کربلا کے سن ہجری میں ہوتا تو اپنے گھر میں بڑا کلپتا رہتا۔ مجھ میں اتنی استقامت بھی نہ ہوتی کہ جلانے کی لکڑی کھینچ کر ہی ظالموں کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور گھوڑوں تلے روند دیا جاتا۔ کہنے لگا "دیکھ لو میں یاسر عرفات کے سن ہجری میں ہوں اور سوائے گالیاں بکنے اور دعائیں مانگنے کے کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تو کسی جارج ٹینک کے سامنے جا کر کھڑا ہونے کی ہمت نہیں رکھتا۔ مجھے گھڑگھڑاتی ہوئی لوہے کی اس پٹی سے خوف آتا ہے جو لمحے بھر میں قیمہ بنا دیتی ہے ...... مگر میں ضمیر کی اس گھڑگھڑاتی ہوئی آواز سے بھی قیمہ ہوا جاتا ہوں جو ہم میں سے اکثر کو سنائی دے رہی ہے۔" اور آخری بات اس نے مجھ سے یہ کہی کہ بھائی میں بھی اور تم بھی اور ہم سب اصل میں اپنی مصلحت اور منافقت کے کونے میں آباد ہیں اور حق کے لئے جنگ کرنے والی کسی مستقیم ENTITY سے آنکھ نہیں ملا سکتے، خواہ وہ استقامت کی سب سے بڑی علامت حسینؑ ہوں یا ہمعصر تاریخ کے فلسطینی۔

میں اس کا نشانہ قلم سے چھوتا ہوں۔ یہ نائٹ بنانے کی رسم ہے۔ پہلے اس موقع پر قلم کی جگہ تلوار استعمال کی جاتی تھی۔ تو میں اسے مایوسی اور بے بسی کا نائٹ مقرر کرتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں کہ پیارے جیم الف! ہمیں ہمارے پنیر اور روغنِ زیتون اور خرمے کھا گئے ـــ سو اب اپنے گھر جاؤ اور کھانا کھا کر آرام کرو۔

ڈاکٹر آغا سہیل

کھڑکی

سامنے، بالکل سامنے دیوار پر ٹوٹے ہوئے پنکھ کی تصویر آویزاں ہے۔ تصویر کے پہلو میں کھڑکی کھُلی ہے، نیچے فرش پر دو بڑے بڑے فل بوٹ پڑے ہیں۔ کھڑکی سے باہر کھُلا ہوا آسمان ہے جہاں سے پہاڑوں کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ پہاڑوں پر برف جمی ہے، اِکّادُکّا ابر کے ٹکڑے تیرتے نظر آتے ہیں ہوا سرد ہے، کھڑکی بند کرنے کی خواہش ہوتی ہے مگر باہر کے نظارے سے نظر چرانا اچھا نہیں، اس لئے میں نہیں بند کرتا۔

"ڈیڈی"

کھلونوں سے کھیلتے کھیلتے میری بچّی بول پڑی ہے "وہ پلی کا پیڑ وہاں کیوں اُترا ہے؟"

"پولنگ بوتھ بنانے کے لئے آیا ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"وہاں ووٹ پڑتے ہیں۔"

"پر وہاں تو ایک ہی آدمی رہتا ہے، اکیلا آدمی۔"

"ہاں اُسی اکیلے آدمی کے لیے بوتھ بن رہا ہے۔"

بچّی نے کھلونا اُٹھایا اور نقلی رائفل میری جانب تان لی۔

ہینڈز اپ"

میں دونوں ہاتھ اٹھاتا ہوں اور آگے بڑھ جاتا ہوں۔" بے بی آپ نے پھر

دہی کھیل شروع کر دیا"

"مجھے اچھا لگتا ہے"

"مجھے ڈر لگتا ہے بے بی"

میری بچی محظوظ ہوگئی اور رائفل لئے ہوئے باورچی خانے میں میری بیوی کو ڈرانے کے لئے چلی گئی اور میں پھر تنہا رہ گیا۔ تنہا ہوتے ہی میں اٹھا اور اپنے ننگے پاؤں جا کر ان جوتوں میں ڈال دیئے جو فرش پر پڑے ہوئے ہیں۔ میرے پاؤں سات نمبر ہیں جوتے کسی طرح دس نمبر سے کم نہ ہوں گے، سوکھے کھنکھڑ فل بوٹ، جن کے اندر سے مرے ہوئے چوہوں کی بدبو نکلتی ہے اور مجھے مرے ہوئے چوہوں سے سخت نفرت ہے، میری بیوی کو بھی نفرت ہے۔ میری بچی بھی شدت سے نفرت کرتی ہے مگر ہم سب کی خواہشوں کے خلاف یہ جوتے یہاں رکھے ہوتے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس قدر شدید نفرت کے باوجود میں اکثر ان جوتوں میں اپنے پاؤں کیوں ڈالتا ہوں، اگر میری بیوی اور بچی میری اس حرکت کو دیکھ لیں تو مجھے سخت سست سنائیں مگر مجھے پتہ نہیں کہ تنہائی کا ایک لمحہ بھی میسر آجائے تو میں اضطراری طور پر جوتوں کے قریب پہنچ جاتا ہوں، جی تو یہی چاہتا ہوں کہ انہیں اٹھا کر اتنی دور پھینک دوں کہ پھر کبھی یہ نظر نہ آئیں۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں، میری بیوی اور بچی بھی مجبور ہیں۔

ہم نے اکثر چاہا کہ ان بوٹوں کی موجودگی کو ہم یوں نظر انداز کر دیں کہ جیسے یہ ہیں ہی نہیں، جس طرح شتر مرغ اپنے سر کو چھپا کر سمجھتا ہے کہ وہ پورا کا پورا چھپ گیا اسی طرح اکثر اجنبی مہمانوں کے سامنے ہم ان بوٹوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں مگر کچھ ہی دیر بعد چبھتی ہوئی نگاہوں سے نکلتے ہوئے نفرت اور حقارت کے شعلے ہمیں اپنی غلطی کا احساس دلا دیتے ہیں اور ہم سب شرمندہ ہو جاتے ہیں۔ ان جوتوں کی موجودگی میں ہمارے کمرے کا نفیس ماحول غارت ہو جاتا ہے اور ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تاریخ نے ایک بار پھر اعادہ کیا اور شاہی مسجد کو پھر اصطبل بنا

دیا گیا ہو، نعوذ باللہ۔

میری بیوی نے تو اپنی سہیلیوں کو بلانا ہی چھوڑ دیا۔ میری بچی تک اپنی کلاس فیلوز کو یہاں مدعو کرنا مناسب نہیں سمجھتی، ہم سب کے سب بڑے شدید ذہنی کرب کا شکار ہیں، اب تو ہم ان کمبخت جوتوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے مگر یہ ہمارے لاشعور میں ہر وقت ڈٹے رہتے ہیں۔

"اُف"

چائے کا کپ لیے ہوئے میری بیوی داخل ہوئی تو میرے پاؤں جوتوں کے اندر گھسے ہوئے دیکھ کر تلملا اٹھی۔

"یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

میں شرمندہ ہو گیا۔

"بانو ـــــ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں یہ تو کمبخت میرے پاؤں میں بھی نہیں آتے۔"

"اُجڈ"

میری بیوی نے گالی دی، معلوم نہیں مجھے یا جوتوں کو، لیکن مَیں نے یہی سمجھا کہ جوتوں کو دی۔ میں اُچھل کر جوتوں کے باہر برآمد ہوا اور چائے کا کپ لے کر کرسی پر جا بیٹھا، شال پیروں پر ڈال لی اور چائے پینے لگا۔

"ہیلی کا پٹر اُتر گیا؟"

"ہونہہ"

"عجیب بات ہے۔ ایک آدمی کے ووٹ کے لیے اتنا اہتمام!"

"رائے ایک آدمی ہی کی کیوں نہ ہو۔ جمہوریت کے تقدّس!"

"میں کھڑکی بند کر دوں؟"

"کیوں؟"

"سردی ہے۔"

"ہے تو سہی مگر آسمان تو نظر آتا ہے"

میری بیوی کرسی کے ہتھے پر میرے قریب ہی بیٹھ گئی اور پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی اور آہستہ سے بولی۔

"رات پھر میں نے خواب میں دیکھا"

"پھر؟"

"ہاں!"

"کیا؟"

"وہی"

"وہی تو خواب میں بھی دیکھتا ہوں"

اسی لمحے میری بچی بھاگتی ہوئی آئی اور بولی

"ڈیڈی رات میں نے خواب میں دیکھا"

"تم نے بھی خواب دیکھا؟"

"جی ڈیڈی، میں نے دیکھا ـــ میں نے دیکھا

"کہ یہ جوتے ـــ"

"ارے آپ کو کیسے معلوم ڈیڈی"

ہم دونوں میاں بیوی سر نیہوڑا کر بیٹھ گئے ـــ جیسے ہم مجرم ہوں۔

سامنے بالکل سامنے دیوار پر ٹوٹے ہوئے پنکھ کی تصویر آویزاں ہے، تصویر کے پہلو میں کھڑکی کھلی ہے نیچے فرش پر دو بڑے بڑے فل بوٹ پڑے ہیں۔ کھڑکی سے باہر کھلا ہوا آسمان ہے جہاں سے پہاڑوں کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ پہاڑوں پر برف جمی ہے۔ اکا دکا ابر کے ٹکڑے تیرتے نظر آتے ہیں۔ ہوا سرد ہے کھڑکی بند کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ مگر باہر کے نظارے سے نظر چرانا اچھا نہیں اس لئے میں نہیں بند کرتا۔

طاہر نقوی۔

کھڑکی میں اٹکی ہوئی شام

دھوپ دن بھر کی تھکن اتارنے کے لیے گلی میں اُتر آئی اور دھیرے دھیرے دھندلکوں میں تبدیل ہونے لگی۔ پھر یہ دھندلکے گھر گھر جاکر دلوں میں گدگداہٹ پیدا کرنے لگے۔ تیز دھوپ اور گرم ہواؤں سے بچنے کے لیے دن چڑھتے ہی جو کھڑکیاں بند کردی گئی تھیں، اب ایک ایک کرکے دوبارہ کھلنے لگیں۔ اوروں کی طرح جب اس نے اس گلی میں کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھولے تو ہوا کے لطیف جھونکے اس کے جسم پر بھی ایسا تاثر پیدا کرنے لگے جیسے شدید گرمی سے آکر وہ شاور کے نیچے کھڑی ہوگئی ہو اور اب اس وقت اپنی بدلی ہوئی خوشگوار طبیعت کی بنا پر اس نے ماحول کی وسعتوں میں اپنی نظریں بے فکری سے دور دور تک دوڑائیں مگر پھر اگلے ہی لمحے اس کی یہی نظریں چاروں طرف سے سمٹ کر کھڑکی کے نیچے گلی میں کھڑے ان دولوں پر مرکوز ہوگئیں جو آس پاس سے لاتعلق اپنی باتوں میں منہمک تھے۔ وہ کچھ دیر یونہی بے ارادہ کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ اس وقت وہ کھڑکی کے چوکھٹے کے بیچ یوں کھڑی تھی جیسے فریم میں تصویر لگی ہوئی ہوتی ہے۔

پھر یہ شام سمٹ کر گلی میں جھانکتی ہوئی اس کھڑکی میں اٹک کر رہ گئی اور آہستہ آہستہ اسے اپنی گرفت میں لینے لگی۔ اس گرفت میں

انجانے طور سے جانتے ہوئے وہ ایک کتاب اٹھا لائی جس کے موضوع میں وہ ہمیشہ دلچسپی لیتی تھی۔ اب بظاہر اس کی نظریں کتاب پر تھیں مگر ذہن ادھر ہی رہا بلکہ غیر ارادی طور سے اس کی نظریں بھی گھڑی گھڑی ادھر اٹھ جاتیں۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے اور کسی قدر جھنجھلاتے ہوئے دو تین بار اس موٹی کتاب کو زور زور سے بند کیا اور کھولا۔ پھر خواہ مخواہ گنگنانے لگی۔ اس کے باوجود ان کے اپنی طرف متوجہ نہ ہونے سے اسے بڑا عجیب اور سراسر غیر متوقع لگا۔ اسے اپنی نسوانیت کے کسی انجانے جذبے کو ٹھیس پہنچتی ہوئی محسوس ہوئی اور بے چینی سے کھڑکی کے کھلے پٹ کا سہارا لے کر تھکی تھکی کھڑی ہو گئی۔ اس لمحے اسے نجانے کیوں بلند آواز میں کوئی نغمہ گانے کو بھی جی چاہا مگر گھر والوں کے خوف کی وجہ سے اس نے اپنی آواز کو بلند نہیں ہونے دیا۔ اس نے اس کیفیت سے شعوری طور سے بچنے کی خاطر ایک بار پھر بلا مقصد گلی کے دونوں جانب نظر دوڑائی۔

یہ گلی زیادہ نہیں چلتی تھی بس کبھی کوئی ٹھیلے والا آوازیں لگاتا ہوا چلا آیا یا کوئی گاڑی یہاں کے ٹھہرے ہوئے ماحول میں یوں گزر جاتی جیسے جمع شدہ پرسکون پانی میں کنکر پھینکا گیا ہو۔ ذرا فاصلے پہ جا کر یہ گلی بڑے بازار کی معروف اور چوڑی سڑک سے جا ملتی تھی جس کا شور اور ہنگامہ اس گلی کے رہنے والوں کے لیے اب ایک معمول بن چکا تھا۔ بازار کی چہل پہل، ٹریفک کی تیزی، لوگوں کا چلنا پھرنا یہ سب اپنی اپنی جگہ اس وقت دلکش ضرور تھا اور وہ ویسے بھی زندگی کی معمولی سے معمولی خوشی کو فوراً اچک لیا کرتی تھی۔ زندگی کا روشن پہلو دیکھنے کی عادی تھی اور مسرتوں کے غیر محسوس جذبوں کو حیثیت دیا کرتی تھی۔ مگر اس وقت ان چیزوں میں اسے کوئی دلکشی کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے وجود سے اٹھتے ہوئے دھوئیں نے صاف آسمان کو ڈھانپ لیا ہو۔ لیکن ہلکی ہلکی اُمید کی طرح ہوا کے جھونکوں کا احساس ابھی باقی تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے

گھبرا کر پھر ان دونوں کی جانب دیکھا۔ وہ اسی طرح بڑے انہماک سے آپس میں باتیں کر رہے تھے جیسے معاشرے کے سارے مسائل کا حل صرف انہی کی گفتگو میں پنہاں ہو اور اگر انھوں نے اپنی باتوں کا تسلسل ذرا بھی توڑا تو کائنات کی ترتیب بکھر جانے کا خدشہ لاحق ہو جائے گا۔ اسی اثناء اس کی چھوٹی بہن دور ہی سے اسے پکارتی ہوئی آئی اور اس سے کورس کی کتاب میں سے کچھ معلوم کرنے لگی مگر اس نے اس کی اس غیر متوقع بے رخی اور بے زاری کی وجہ سے حیرت سے اسے دیکھتی ہوئی انہی قدموں واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد غیر شعوری طور سے وہ کھڑکی سے ہٹ کر ہڑول کی الماری میں لگے قد آور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور اپنے سراپے کا تفصیلی جائزہ لینے لگی۔ وہ اپنی نسوانیت کے نازک قطرے میں اپنی نفسیات کا پورا دریا دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے ان دونوں پر سخت غصہ آیا اور اسی عالم میں دوبارہ کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔

اس وقت وہ دونوں وہاں موجود نہ تھے۔ اس نے اپنی گردن نکال کر اپنے وجود میں پھیلی ہوئی بے چینی سے مجبور ہو کر جلدی جلدی اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ دونوں گلی کے نکڑ پر واقع کیبن کے پاس کھڑے سگریٹ خرید رہے تھے۔ وہ ان دونوں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے اپنی آسودگی تلاش کرتی رہی۔ ساتھ ہی اس کے دل میں کوئی پُر اشتیاق جذبہ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ سگریٹ پیتے ہوئے وہ اسی جگہ آ کر گلی کے کنارے پر رکھے ہوئے ایک بڑے پتھر پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ ان کی نظریں اب بھی اسی طرح ایک دوسرے پر جمی ہوئی تھیں اس لیے اس کی بے چینی میں اس لمحے مزید اضافہ ہوا اور ذہن کی دھیمی دھیمی سی آنچ پر اس کے احساسات پگھل پگھل کر اس کے دل پر ٹپکنے لگے۔ اس نے ان کے دوبارہ اسی مقام پر واپس آ جانے پر جھنجھلا کر سوچا کہ آخر یہ یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے تا کہ وہ اس دھواں دھواں کیفیت سے بچ جائے۔ وہ دونوں پاس سے گزرنے والے ہر راہ گیر کی طرف لمحے بھر کو ضرور دیکھ لیتے لیکن اس کی جانب سے اسی طرح بے پر

رہے جیسے کھڑکی میں اس وقت وہ نہ ہو بلکہ کھڑکی خالی ہی ہو۔ اسی لمحے اس کا دھیان کالج کے ساتھیوں اور رشتے دار ہم عمر لڑکوں کی طرف لاشعوری طور سے چلا گیا۔ ان سب کو تو اسے دیکھتے رہنے، اس سے بات کرنے اور اس کے نزدیک رہنے کی ہمیشہ ہی تمنا رہتی تھی۔ یہ سوچ کر اس نے پھر نیچے ان دونوں کی طرف دیکھا وہ اسی طرح اب بھی اس سے بے خبر اور اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ وہ اب کالج کے ان ساتھیوں اور رشتہ دار لڑکوں پر جھنجھلا اٹھی کہ وہ سب جھوٹ بولتے ہیں، غلط کہتے ہیں، بہکاتے ہیں اور غصے سے اپنے دانت پیسنے لگی اس کی شخصیت رفتہ رفتہ مردکے سامنے کرب کی چیخ بن کر ہوا میں تحلیل ہونے لگی۔

اپنی کیفیت کی اس شدت میں اس نے کہیں سے گہرائیوں سے آتی ہوئی اپنی ماں کی آواز سنی جو اسے بلا رہی تھی۔ وہ دونوں پر ایک بار پھر پُرامید نظر ڈالتی ہوئی اندر چلی گئی۔ ماں کے بتائے ہوئے کام کو تھکان کا بہانہ کر کے انکار کے بعد جلدی سے پھر کھڑکی کی جانب آ گئی۔ وہ دونوں اب کسی بحث میں اس زور و شور سے الجھے ہوتے تھے کہ ان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ان کی یہ آوازیں اس کے کانوں کے پردوں سے گزر کر اس کے ذہن کی سطح پر کنکریوں کی طرح گر رہی تھیں۔ جنکی چوٹ سے اس کے لاشعور کے کسی جذبے سے ہلکی ہلکی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ اسے ان کی ان باتوں سے قطعی کوئی رغبت نہیں تھی بلکہ بے چینی کے نیچے دبی ہوئی ناگواری پیدا ہو رہی تھی۔ اسی دوران اس نے دیکھا کہ سامنے ہی چلتے چلتے ایک بوڑھی عورت لڑکھڑا کر گری تو وہ دونوں لپک کر اس کی طرف بڑھے، اسے سہارا دے کر اٹھایا اور پھر اپنی اپنی جگہ پر جا بیٹھے۔ جب تک بوڑھی عورت ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی وہ دونوں اسی کی جانب دیکھتے رہے اور شاید اسی کے بارے میں باتیں بھی کرتے رہے۔

جب پڑوس کا کوئی جان پہچان کا شخص گلی سے گزرتا ہوا دکھائی دیتا تو وہ خود کھڑکی سے ذرا ہٹ جاتی اور دوبارہ وہیں جا کھڑی ہوتی۔ اسے ساتھ ہی رہ

رہ کر یہ خیال بھی آتا کہ کوئی ان دونوں کی موجودگی میں کھڑکی میں مستقل اسے کھڑا دیکھے تو جانے کیا خیال کرے گا۔ یہ خدشہ اس کے ضمیر سے برابر اپنا سر ٹکراتا رہا۔ پھر کسی گاڑی کے بریک لگنے کی وجہ سے نہ صرف خود اس نے بلکہ انہوں نے بھی گھبرا کر جائے حادثہ کی طرف دیکھا اور پھر اپنی باتوں میں اسی طرح مصروف ہو گئے جیسے انہیں اپنی باتوں میں ایک لمحے کی تاخیر بھی گراں گذر رہی ہو۔ کھڑکی میں کھڑے کھڑے اسے اپنے وجود پر کوئی بوجھ بڑھتا ہوا محسوس ہونے لگا جیسے یہ لمحات اس کی شخصیت کو مسخ کرنے پر تلے ہوئے ہوں۔

اُداسی کے ساتھ اس کے ذہن میں اب مایوسی جاگزیں ہو گئی تھی جس کے ردعمل کے طور پر لمحے بھر کے لیے اس کے ذہن میں عجیب اور غیر معمولی خیال گھس آیا کہ فوراً دوڑ کر نیچے جائے اور ان دونوں کے عین سامنے جا کر کھڑی ہو جائے مگر چاہنے کے باوجود وہ یہ نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اس نے سوچا نیچے اتر کر ان کے سامنے سے محض گزر جائے مگر یہ بھی اسے نسوانیت کی انتہائی بے عزتی محسوس ہوئی اور اسی لیے اس نے اپنے اس خیال کو بھینچ کر دبا دیا۔ اس وقت وہ اپنے داخلی کرب میں مبتلا ہو گئی اور اس کے وجود کے اندر سے، دل سے، دماغ سے، روح سے دھواں سا اٹھنے لگا۔ پھر یہ دھواں باہر آ کر چاروں طرف پھیلنے لگا۔ اس کیفیت میں وہ اپنے آپ کو ایسا سیاہی سمجھنے لگی جو بھری دوپہر میں چوراہے پر کھڑا ہو۔ وہ اس تیز دھوپ سے بچنے کی خاطر اپنی منتونخ اور فطری آسودگی کے سائے میں چلی جانا چاہتی تھی۔

وقت بہہ بہہ کر اجالے کو اندھیروں کی اترائی میں لے جا رہا تھا۔ ان میں سے ایک نے کلائی کی دیکھ کر دوسرے سے کچھ کہا اور پھر وہ دونوں مخالف سمتوں میں جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے جانے لگے۔ اس لمحے شدت کے ساتھ اس کا جی چاہا کہ کھڑکی سے گردن نکال کر پڑوسیوں اور دوسرے راہ گیروں کی پرواہ کئے بغیر زور زور سے چلائے مگر اس کوشش

میں اس کا گلا رندھ گیا۔ تشنج زدہ کیفیت نے اب اسے جکڑ لیا تھا جس کی وجہ سے اس نے احتجاجی طور سے کھڑکی کے دونوں پٹ اپنی پوری قوت سے بند کئے اور اسی شدید تر کیفیت میں ایک مرتبہ پھر الماری کے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اب اسے اپنا چہرہ انتہائی بھدا اور نقش ٹیڑھے میڑھے نظر آئے۔ اس لیے ہیجانی انداز میں اپنی پوری طاقت سے آئینے پر لگاتار مُکّے مارنے لگی اور اپنے ہاتھوں سے رسنے والے خون سے بے خبر بند کھڑکی کے پاس کھڑی بُری طرح ہانپنے لگی۔

اندھیرا ہو جانے کے باوجود وہ شام اسی طرح اس کھڑکی میں اٹکی رہی!!

زین العابدین

پتھر کی گلی

اس گلی کا نام کیا ہے، معلوم نہیں ۔ البتہ وہ گلی شہر کی تمام گلیوں سے بالکل مختلف ہے کیونکہ آج تک جو بھی اس کے اندر گیا واپس نہیں لوٹا حالانکہ آنے جانے کا ایک ہی راستہ ہے ۔ کہتے ہیں کہ اس گلی میں کوئی بڑھیا جادوگرنی رہتی ہے جس کے بالوں کے جوڑے کی بھول بھلیوں میں ہر جانے والا کھو جاتا ہے یہ بھی مشہور ہے کہ وہ اسے جادو کے زور سے جانور بنا دیتی ہے اور اپنے گھر کے دروازے سے باندھ دیتی ہے تاکہ جب کوئی اس دروازے سے گزرے تو یہ چلانے لگیں اور ان کی چلاہٹ کو سن کر جب وہ آدمی پیچھے کی طرف پلٹ کر دیکھے تو یہ پتھر بن جائے ۔

میرا بھی دوست برسوں پہلے اس گلی کے اندر گیا تھا مگر اب تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی ۔ شاید وہ بھی پتھر کا بن گیا ہو ۔ گلی کے اندر جاتے سے پہلے ایک دن وہ مجھے ہوٹل میں ملا تھا ۔ بڑا پریشان لگ رہا تھا ۔ بال بکھرے ہوتے تھے اور بڑھی ہوئی داڑھی کے درمیان چہرے پر تفکرات کی لکیریں تھیں ۔

"تم اتنے پریشان کیوں ہو؟" میں نے پوچھا

"رات وہ میرے خواب میں آئی تھی ۔ کہہ رہی تھی کہ خود کا سراغ تمہیں میری گلی میں مل سکتا ہے ۔" میں اس کی بات پر مسکرا پڑا اور بولا

"یہ تمہارا وہم ہے"

پھر ہم دونوں نے چائے پی اور ہوٹل سے نکل آئے۔ مگر دوسرے دن سُنا کہ وہ گلی کے اندر گیب تو گیا اب تک اس نے بال بچوں کا منہ نہیں دیکھا ہے شاید اس کی بیوی اور بچے بھی گلی کے اندر جا رہے ہیں۔

کہتے ہیں کہ کئی صدی پہلے صوفیوں کے ایک قافلہ نے اس گلی کو دریافت کیا تھا تاکہ اللہ کا نام پھیلائیں مگر گلی کی خوبصورت جادوگرنی کو ان صوفیوں کی یہ حرکت پسند نہ تھی۔ اس لیے اس نے چند جادوئی مورتیاں ان کے پاس بھیجیں تاکہ وہ انہیں گرفت رکر کے اس کے سامنے پیش کرے مگر مورتیاں موتیاں تھیں ایک پھونک سے گر کر ٹوٹ پڑیں جس سے جادوگرنی آگ بگولا ہو گئی اور جادوئی گھوڑے پر بیٹھ کر آگ برساتی اس جگہ گئی جہاں صوفیاء کرام مقیم تھے اور تحکمانہ لہجے میں بولی

"تمہارے خدا کا تصور غلط ہے" وہ تمہارے ذہن کی پیداوار ہے

"نہیں تمہاری سوچ غلط ہے، کیونکہ تم آدمی سے نفرت کرتی ہو"۔ ایک صوفی نے کہا، "تم ان سے محبت کرو تمہیں خدا مل جائے گا"

"یہ ممکن نہیں، میں ہوا، پانی اور آگ پر قابض ہوں اور آدمی مٹی سے بنا ہے جو پانی کے ایک ریلے کے ساتھ بہہ جائے گا۔ پھر اس نے ایک منتر پڑھا اور سمندر کی لہریں صوفیہ کرام کو بہانے کے لیے آگے بڑھیں، مگر انہوں نے لہروں کو وہیں روک دیا اور سزا کے طور پر ہٹ دھرم جادوگرنی کو گلی کے اندر بند کر دیا اور گلی کے منہ پر بڑا سا پتھر رکھ دیا تاکہ کوئی اسے ہٹا نہ سکے

ساٹھ برس بعد چالیس سال پہلے جب دوسرا قافلہ آیا تو ان میں چند لوگوں نے گلی کی طرف رخ کیا کیونکہ وہ اس کی تاریخ سے واقف تھے۔ جب وہ گلی تک پہنچے تو دیو قامت پتھر کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ اس پتھر کو کون ہٹا سکتا ہے۔ آپس میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ مُنّا پان والا آگے بڑھا

اور بولا "میں ہٹاؤں گا۔" اس کی ہمت دیکھ کر لوگوں نے دانتوں میں انگلیاں دبالیں اور منہ پان والے کو پتھر ہٹانے پر مامور کر کے چلے گئے۔ دوسری صبح آئے تو اس کی آنکھیں کانچ ہو گئیں تھیں۔ پھر الگو مستری نے اس کام کو انجام دینے کا بیڑہ اٹھایا چونکہ وہ کئی دنوں سے بھوکا تھا لہٰذا پتھر کو دھکا دیتے وقت اس کے منہ سے خون کی رال ٹپکی، لوگوں نے فوراً ہسپتال پہنچا دیا جہاں وہ بغیر علاج کے مر گیا۔ اخبارات میں اس کے مرنے کی خبر تو نہ آئی البتہ اسپتال سے دوا کی چوری کی خبر ضرور چھپی۔

انسانوں کے درمیان انسانیت کی موت دیکھ کر لوگوں پر جنون سوار ہو گیا وہ گلی کے منہ سے اس پتھر کو ہٹانے کے لیے ہیا ہیا کی رٹ لگانے لگے مگر پتھر ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا۔ جب لوگ مایوس ہو گئے آسمان کے مشرقی حصے سے سفید لباس میں ملبوس ایک بزرگ اترے اور لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ نراش نہ ہوں اور فلاں اسم اعظم پڑھیں۔ پتھر آپ ہی آپ ہٹ جائے گا۔ پھر وہ بزرگ غائب ہو گئے۔ بس لوگ چیخ چیخ کر بزرگ کی بتائی ہوئی آیات کا ورد کرنے لگے اور اس وقت تک پڑھتے رہے جب تک وہ سو نہ گئے اور جب صبح آنکھیں کھلیں تو دیکھا پتھر غائب ہے اور گلی کے اندر جانے کا راستہ صاف دکھائی دے رہا ہے۔

گلی کے اندر ایک دنیا آباد تھی۔ ہاٹ، بازار، دکان، اسکول، مدرسہ کالج اور یونیورسٹیاں، مزدور، کاشت کار، کلرک، آرٹسٹ، شاعر اور ادیب مگر سب پتھر کے تھے۔ مورت دکھائی دے رہے تھے۔ کچے پکے مکانات بوسیدہ عمارتیں اور ان میں لوگ، برگد کے پیڑ جن سے جٹیں جھول رہی تھیں۔ نیم کے درخت پر گلہریاں بیٹھی نمکولیاں کھا رہی تھیں اور گرگٹوں کے چہرے سیاہ ہو رہے تھے۔ اور ایک حسین بڑھیا مورتی کے سامنے بیٹھی چرخہ چلا رہی تھی اور رسوت کات رہی تھی۔ لوگ اپنی فتح پر ناچتے کودتے،

خوشیاں منانے جونہی بڑھیا کے قریب سے گزرے ان کی آوازیں گنگ ہوگئیں اور وہ پتھر کے بن گئے۔

نواکھلی کا رہنے والا صاحب علی بھی پچھلے برس اس گلی میں گیا تھا۔ مگر لوٹ کر نہیں آیا۔ وہ بھی اسی گلی کا ہو کر رہ گیا جیسے اس پر بھی بڑھیا کا جادو چل گیا ہو۔ ایک دن اس کی بیوی حلیمہ نے تعفن اور تاریکی سے اکتا کر اس سے کہا کہ وہ گلی کو چھوڑ دے مگر اس نے بیوی کی باتوں کو ان سنی کرتے ہوئے نہایت ترشروئی کے ساتھ بنگلہ زبان میں کہا "امی تما کے چھاڑتے پارہی" (میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں) پھر وہ علی امام پینٹر کی دکان پر چلا گیا۔ آرٹ سنٹر ایک ایسی جگہ تھی جہاں گلی کے تمام لوگ آتے، اپنے اپنے گھروں کی تصویریں آڑی ترچھی لکیروں میں پیش کرتے اور علی امام پینٹر سے کہتے کہ ان میں رنگ بھر دے کیونکہ رنگ روشنی ہے اور لکیریں اندھی۔

"کی چھوبی انکچین بھائی" (کیا تصویر بنا رہے ہو بھائی۔ اس نے بنگلہ زبان میں پوچھا۔

"بڑھیا کی" اس نے مختصر سا جواب دیا مگر صاحب علی سمجھ نہ سکا سو اس نے دوبارہ پوچھا

"کون سی بڑھیا کی۔"

"وہی جو چاند میں بیٹھی چرخا کاتتی ہے۔" علی امام نے لکیروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"رنگ بھرو تو معلوم پڑے۔" صاحب علی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور علی امام پینٹر صرف مسکرا کر رہ گیا۔

ابھی دونوں کی گفتگو جاری تھی کہ سہراب آپہنچا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے بھی گفتگو میں حصہ لینا شروع کیا۔ اچانک صاحب علی کی نظر سہراب کی ٹوپی پر پڑی۔ وہ بولا: "تمہاری ٹوپی میں چھید کیسا بھائی۔"

کانٹے دار تار سے الجھ گئی تھی"۔ اس نے جواب دیا مگر علی امام پینٹر نے فوراً بات کاٹی اور پوچھا۔ "یہ کانٹے دار تار تمہیں ملا کہاں سے"۔ اس سوال پر صاحب علی نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور توبہ کرتا ہوا اور درود پڑھتا ہوا مسجد کی طرف چلا گیا، کیونکہ واہی تباہی سننے سے ایمان جاتا رہتا ہے۔ ویسے بھی سورج ڈوب چکا تھا اور مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ سلمان نے ٹوپی اتاری اور علی امام پینٹر سے کہا، "میں کہیں کا نہ رہا بھائی"۔

سہراب لیتھ مشین پر کام کرتا تھا۔ سات آٹھ افراد کا بوجھ اس کے کاندھے پر تھا۔ چار جوان بیٹیاں بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ پیلے کرنے تھے۔ اسی لیے دن رات کام کرتا تھا اور کام نے اسے لاغر بنا دیا تھا۔ اسے نہ اپنا ہوش تھا اور نہ گھر کا۔ گھر میں کیا ہوتا اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ رات گئے گھر جاتا تو بیوی بھی اسے دن بھر کی باتیں بتا کر پریشان نہ کرتی۔ البتہ صبح کے وقت دال، چاول اور آٹے کے لیے پیسے ضرور مانگتی اور آج جب اس کی منجھلی بیٹی کے پیٹ نکل آئے تھے تو اس کے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا کہ وہ علی امام پینٹر کو اپنا راز دار بنائے اور اس سے مشورہ طلب کرے۔ "کیا کروں بھائی۔ کچھ تو مشورہ دو"۔ مگر وہ چپ چاپ بیٹھا سادہ کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہا۔ البتہ اس کے چہرے پر گمبھیر خاموشی ضرور تھی۔ پھر سہراب اٹھا اور چلا گیا۔

اب علی امام پینٹر دکان پر اکیلا رہ گیا تھا۔ اس نے تصویر بنانا بند کر دیا اور دن بھر کے حساب کتاب میں لگ گیا۔ اس کے سر کے اوپر ایک پرانا کیلنڈر جھول رہا تھا اور پیچھے کے کمرے میں عزیز پاؤں سے پریس کی مشین چلا رہا تھا جس کی کھٹ کھٹ کی آواز سے گلی کا سکون ٹوٹ رہا تھا جب وہ حساب کتاب کر چکا تو اپنی ٹوٹی کرسی پر بیٹھے بیٹھے دکان کے سامنے

کھڑے ہوئے۔ بجلی کے کھمبے کو گھورنے لگا۔

"جانے کب اس میں بجلی آئے گی۔ اس نے سوچا۔ پھر وہ آپ ہی آپ مسکرایا جیسے اس بر بڑھیا کے طلسم کے توڑنے کا منتر منکشف ہو گیا ہو ابھی اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ معدوم نہ ہونے پائی تھی کہ مولوی حیرت اللہ اپنے پاجامے کا داہنا پائنچہ اٹھائے کھڑے تھے۔ مولوی حیرت اللہ اس گلی میں تقریباً پندرہ برس سے رہ رہے تھے اور اس مدت میں انہوں نے علی امام پینٹر سے ان گنت شکایتیں کی تھیں کہ وہ گلی کی اس نالی کو کیوں نہیں بند کروا دیتا جس میں دن رات صابن کا پھین بہتا رہتا ہے۔ وہ آج بھی وہی پرانی شکایت لے کر آئے تھے "بھائی نالی کو بند کروانے کی کوشش کرو ہر روز فجر کی نماز قضا ہو جاتی ہے" اور حسب معمول علی امام پینٹر کا جواب سنے بغیر گلی کے اس کنارے واقع گھر میں چلے گئے۔ جہاں ان کی تیسری بیگم انتظار کر رہی تھی۔ مولوی حیرت اللہ کے جاتے ہی اس نے لالٹین کی لو تیز کر دی تاکہ گلی میں روشنی جا سکے مگر جلد ہی اسے لو کم کر دینی پڑی کیونکہ لالٹین سے دھواں نکلنے لگا تھا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے سوچا۔ کل وہ میونسپلٹی والوں سے کہے گا کہ وہ بجلی کے کھمبے میں کنکشن دے دیں تاکہ گلی کا اندھیرا دور ہو جائے۔ پھر وہ اٹھا۔ پریس مشین کا دروازہ بند کیا اور جوں ہی دکان کے پٹ لگانے لگا۔ خوندکار اشرف رابندر ناتھ ٹیگور کی کتاب گتانجلی کی ایک پرانی کاپی بغل میں دبائے آیا اور بولا "بڑی جلدی دکان بند کر رہے ہو۔"

خوندکار اشرف بھی اس گلی کے آخری سرے پر ایک بوسیدہ جھونپڑی میں رہتا تھا، کسی کمپنی میں معمولی کلرک تھا۔ لکھنے پڑھنے اور شاعری کا بے حد شوق تھا لہٰذا اپنی تنخواہ کا نصف حصہ پرانی کتابوں کے خریدنے پر صرف کرتا اور نصف حصہ کرائے، کھانے پینے اور کپڑوں لتوں پر۔ اگر کبھی کبھار

ضرورت پڑتی تو وہ علی امام پینٹر سے قرض لے لیتا اور مہینے کی دس تاریخ تک لوٹا دیتا۔ علی امام پینٹر اس کے اتنی رات کو آنے کا مقصد سمجھ چکا تھا لہٰذا اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ خاموشی کے ساتھ دکان کے پٹ لگاتا رہا پھر خوند کار اشرف خود ہی بولا۔ "دس روپے ہوں گے۔"

علی امام پینٹر نے دکان کو تالا لگایا اور دن بھر کے واقعات کے پلندوں کو اٹھائے اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کا گھر گلی کے آخری سرے پر تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر پاؤں اٹھا رہا تھا کیونکہ اندھیرے میں کسی پتھر یا کسی ایسے شخص سے ٹھوکر کھانے کا امکان زیادہ تھا جو گھر کے اندر کے حبس سے بچنے کے لیے گلی میں سو رہا تھا۔ ابھی وہ بچوں کے پرائمری اسکول کی عمارت طے کر کے داہنی طرف مڑا تھا کہ ایک سایہ نکل کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ وہ ٹھٹھک گیا اور سوچنے لگا کہ اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے۔ کوئی جن تھا یا جادوگرنی بڑھیا کا سایہ مگر اس نے فوراً ہی اس خیال کو جھٹک دیا اور مسکراتا ہوا ایک نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

گلی کے اندر ایک مہیب سناٹا تھا مگر اس سناٹے میں ایک بے چینی تھی کتے اِدھر اُدھر غلاظتوں میں کھانے کی چیزیں اور ہڈیاں ڈھونڈتے پھر رہے تھے علی امام پینٹر آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اب وہ ان جگیوں کی طرف مڑ گیا تھا جہاں جوٹ ملوں میں کام کرنے والے مزدور رہا کرتے تھے۔ اچانک اس کے ذہن میں وہی سایہ کلبلایا جسے وہ تھوڑی دیر پہلے دیکھ چکا تھا۔ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ اب وہ حکیم تراب علی کی دکان کے پاس سے گزر رہا تھا اور ان تاریخی کھنڈرات کی طرف جا رہا تھا جہاں نواب عیسیٰ خاں نے انگریزوں کے کئی افسروں کو بغاوت کے زمانے میں اپنی ننگی تلوار سے ذبح کر کے پھینک دیا تھا۔ اس کھنڈر میں خود رو پودوں کے گھنے جنگل ہو گئے تھے۔ "وہ کون تھا وہ" آپ ہی آپ علی امام پینٹر بڑبڑایا۔ "ایسا

لگتا ہے کہ اسے کہیں دیکھا ہے۔ لیکن کہاں سے آیا تھا کہاں چلا گیا۔"
اس کے آہستہ آہستہ اٹھتے قدم تیز ہو گئے۔ مگر دو کر ہی ملے کسی بچے کے رونے کی آواز سے اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اب وہ کھنڈر کے اس حصے تک پہنچ چکا تھا جہاں سے اس کا گھر قریب تھا اچانک اس کے کانوں میں کھنڈر کے اس چبوترے سے کھسر پھسر کی آواز آئی جہاں انگریزوں کی قبریں تھیں۔ علی امام پینٹر کے پاؤں خود بخود رک گئے اور کان کھڑے ہو گئے۔ کھسر پھسر کی آوازیں جوں جوں اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں اس کے رونگٹے کھڑے ہونے جا رہے تھے، سانسیں پھول رہی تھیں اور مارے خوف و حرارت کے آنکھیں وا ہوتی جا رہی تھیں۔

آواز ــــ کھسر پھسر!! کون ہیں یہ لوگ جو گلی کے خلاف سازش کر رہے ہیں، کون ہیں یہ لوگ جو گلی کے منہ پر پتھر رکھ کر انسان کی پرچھائیوں کو سدا کے لیے محبوس کر دینا چاہتے ہیں۔

اس نے سوچا اور کھڑے کھڑے آہٹ لینے لگا۔ پھر کھسر پھسر بند ہو گئی کیونکہ کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ شاید کتوں کی بھونک ان کے لیے خطرے کی سگنل تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں گھور رہا تھا کہ اتنے میں ایک سایہ کھنڈر سے نکلا اور جونہی اس کے قریب سے گزرا۔ علی امام پینٹر نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور اندھیرے کے باوجود پہچان لیا کہ وہ کون تھا۔ صاحب علی یا سہراب جس کی بیٹی کے پیٹ میں کسی اور کا خون پل رہا تھا۔

پھر وہ پتھر بن گیا۔

اب تیسرے قافلے کا انتظار جو اس گلی کو دریافت کر کے اس کے منہ پر رکھے ہوئے دیو قامت پتھر کو ہٹائے گا۔

نظم

فیض احمد فیض

ایک نغمہ کربلائے بیروت کیلئے

بیروت نگارِ بزمِ جہاں
بیروت بدیلِ باغِ جناں
بچّوں کی ہنستی آنکھوں کے
جو آئینے چکنا چُور ہوئے
اب ان کے ستاروں کی لَو سے
اس شہر کی راتیں روشن ہیں
جو چہرے لہو کے غازے کی
زینت سے سوا پُرنُور ہوئے
اب ان کی دمک کے پرتو سے
اس شہر کی گلیاں روشن ہیں
اب جگ مگ ہے ارضِ لبناں
بیروت نگارِ بزمِ جہاں
بیروت بدیلِ باغِ جناں

ہر کشتہ مکاں، ہر ایک کھنڈر
ہم پایۂ قصرِ دارا ہے
ہر غازی رشکِ اسکندر
ہر دُختر قامتِ لیلیٰ ہے
یہ شہر ازل سے قائم ہے
یہ شہر ابد تک قائم ہے
بیروت دلِ ارضِ لبناں
بیروت نگارِ بزمِ جہاں
بیروت بدیلِ باغِ جناں

(اردو انٹرنیشنل کینیڈا)

اخترالایمان

راستے کا سوال

مَیں جب آیا راہ گزر نے پوچھا
"اتنے سال کہاں تھے ؟
موٹے موٹے سے لگتے ہو
مستقبل کو محفوظ بنانے کی کوشش میں گرداں تھے ؟
کنپٹیوں کے بال بھی سب کھچڑی ہونے کو آئے ہیں
اتنی کاوش کی ہے کیا کچھ جوڑا ؟
سرکاری عمال نے کیا کیا فردجرم لگائی اس محنت کے حاصل پر
شہرت کی بے حد خواہش تھی تم کو
کتنے زینے باقی ہیں اب آخری سیڑھی تک جانے کے ؟
شہر کے رُتبہ والے لوگوں میں آتے جاتے ہو ؟
داد و تحسین ضروری ہے اس ان تھک محنت کی
کیا کوئی گل رو بھی تم پر مرتا ہے
یا ایسے ہی دن کی رات کیا کرتے ہو ؟
وہ گھر جس سے چلنے کا آغاز کیا تھا
کیا اُس گھر کی سیلن، دیواروں کی بُو ذہن میں اب تک باقی ہے۔

اور وہ گھر جس میں تم اب رہتے ہو
اس کے غُرفے اور دریچے حسبِ عادت وا رکھتے ہو؟
کیا ان غرفوں اور دریچوں سے تم کو ایسی آوازیں آتی ہیں
جن سے ظاہر ہو دنیا میں بے حد بے چینی ہے؟
کیا ان غُرفوں اور دریچوں سے بارود کی بُو ــــ
بے بس اور نہتے لوگوں پر بم گرنے کی آوازیں آتی ہیں؟
ماؤں کے رونے، بچّوں کے چلّانے، باپ اور بھائی کے قتل کا چرچا سُننے میں آتا ہے؟
جس میں تم رہتے ہو یہ گھر کتنی اونچائی پر ہے؟
کیا اس گھر سے بیروت کی گلیوں میں بکھری، لاشیں دیکھی جا سکتی ہیں؟
کیا تم اب تک حب الوطنی کے قائل ہو؟
وہ اعلیٰ حکام جو ملکوں ملکوں مسندِ اعلیٰ پر بیٹھے ہیں
دنیا کو پَل پَل خوفزدہ کرتے رہتے ہیں
مہلک ہتھیاروں سے اپنے اپنے گودام بھرے جاتے ہیں
ان کی ذہنی حالت پر شک نہیں ہوتا تم کو؟"

راہ گزر نے اتنی باتیں پوچھیں میں گھبرا کر بھاگا
راہ گزر کے دوسری جانب ایک گڑھا تھا
بے دھیانی میں ٹھوکر کھا کر اس میں پھسلا
بعد میں مجھ پر اور دنیا پر کیا گزری یہ آپ بتائیں
(اُردو انٹرنیشنل کینیڈا)

منیر نیازی

محبت اب نہیں ہو گی

ستارے جو دمکتے ہیں
کسی کی چشمِ حیراں میں
ملاقاتیں جو ہوتی ہیں
جمالِ ابر و باراں میں
یہ نا آباد وقتوں میں
دلِ ناشاد میں ہو گی
محبت اب نہیں ہو گی
یہ کچھ دن بعد میں ہو گی
گزر جائیں گے جب یہ دن
یہ ان کی یاد میں ہو گی

جیلانی کامران

نظم

مجھے ایک موسم نے
اور تیری بے وقت غفلت نے گھائل کیا ہے!
وگرنہ
کوئی اور موسم
کوئی اور تیری طرف آنے جانے کے اوقات ہوتے
تو ایسا نہ ہوتا!

جدائی کے لمبے مہینے میں
جو پھول اُگتا ہے اُس کی مہک میں
مجھے تیرے ہونے کی خوشبو کا احساس ہوتا ہے
مگر کون خوشبو سمجھتا ہے؟

•

مجھے ایک خوشبو نے
اور یوں بلانے کی عادت نے گھائل کیا ہے!

وزیر آغا

ساون کا آخری دن!

ساون!
تیری بھیگی پلکیں
جُھکی ہوئی اچھی لگتی ہیں
ٹپ ٹپ گرتی نرمل بوندیں، شب بھر
ٹین کی ٹھنڈی چھت پر
نازک سی پوروں سے
ٹائپ کرتی ہوئی، اچھی لگتی ہیں
گئے دنوں کے نام
معطّر خط لکھنے، اچھی لگتی ہیں
چھت کے نیلے کاغذ کے نیچے مَیں خود بھی
جیسے اک میلا سا کورا کاغذ ہوں
میرے بدن پر
پوروں کی میٹھی ضربوں سے
لفظوں کے سائے اُترے ہیں

خط کے سارے شبد مجھے پہچان گئے ہیں!

کیا لکھا ہے؟
کیا جانوں میں کیا لکھا ہے؟
کون سی ایسی انہونی سی بات تھی، جس نے
برسوں پہلے
"نہ کہنے" کے پلّو سے
خود کو باندھا تھا
اور پھر
دل کی ڈولی میں محبوس ہوتی تھی
اتنے لمبے، بوجھل سالوں خود سے بھی وہ چھپی رہی تھی
آج اُسے کس مجبوری نے
لفظوں کے لب چھُو لینے پر اُکسایا ہے
گئے دنوں کے نام یہ نامہ لکھوایا ہے؟

ساون کا یہ آخری دن ہے
کل جب بھادوں آجائے گا
ٹین کی چھت پہ اپنے اُجلے پَر پھیلاتا
آنے والی سُرخ رُتوں کے

خوابوں میں جب کھو جائے گا
سب آوازیں تھک جائیں گی
پلکیں تھک کر سو جائیں گی
گنتے دنوں کا نام
منوں مٹی کے نیچے دب جائے گا
اگلا ساون کب آئے گا؟؟

(اُردو انٹرنیشنل کینیڈا)

احمد فراز

بیروت

یہ سر بریدہ بدن ہے کس کا
یہ جامۂ خوں کفن ہے کس کا
یہ زخم خوردہ ردا ہے کس کی
یہ پارہ پارہ صدا ہے کس کی
یہ کس لہو سے زمین یاقوت بن گئی ہے
یہ کس کی آغوش کس کا تابوت بن گئی ہے
یہ کس نگر کے سپوت ہیں
جو دیارِ انگار میں کھڑے ہیں
یہ کون بے آسرا ہیں
جو تیغ قاتلاں سے
کٹی ہوئی فصل کی طرح
جا بجا پڑے ہیں

یہ کون چہرے ہیں
جن کے رخسار و چشم و لب پر
لہو کے قطرے جگر جگر کرتے
موتیوں کی طرح جڑے ہیں

یہ کون ماں ہے
جو اپنے لختِ جگر کو ملبے میں ڈھونڈتی ہے
یہ کون بابا ہے؟
جس کی آواز شورِ محشر میں دب گئی ہے
یہ کون معصوم ہیں؟
کہ جن کو سیاہ آندھی دیئے سمجھ کر بجھا رہی ہے
انہیں کوئی جانتا نہیں ہے
انہیں کوئی جاننا نہ چاہے
یہ کس قبیلے کے سر بکف جانثار ہیں
جن کو کوئی پہچانتا نہیں ہے
کوئی بھی پہچاننا نہ چاہے
کہ ان کی پہچان امتحاں ہے
کہ ان کی پہچان میں زیاں ہے
نہ کوئی بچہ نہ کوئی بابا نہ کوئی ماں ہے
محلسراؤں میں خوش مقدر شیوخ چپ، بادشاہ چپ ہیں
حرم کے سب پاسبان، عالم پناہ چپ ہیں
منافقوں کے گروہ کے، سربراہ چپ ہیں
تمام اہلِ ریا کہ جن کے لبوں پہ ہے
لا الہ چپ ہیں

(اردو انٹرنیشنل کینیڈا)

احمد شمیم

سفر سے واپسی کی خواہش

یہی نگر تھا ہماری آنکھوں ہمارے دل میں
اسی نگر کے سہانے خوابوں کی داستاں
موسموں کی آنکھوں میں جاگتی تھی
اسی نگر کی سُلگتی خوشبو
ہوا کی چادر میں رچ گئی تھی!

ہری رُتوں کی صدا پہ ہم اپنے گھر سے نکلے
تو ساری یادوں کا سر برہنہ جلوس
میلے لباس کی طرح تن سے اُترا
سفر کے پہلے قدم میں دیکھا
تو رنج و راحت کے زاویئے سب بدل گئے تھے
ابد صفت ماتا کے آنگن کی سر برہنہ پکار
گزرے دنوں کی ساری حکایتیں
سب بچھڑنے والوں کو سونپ دی تھیں
نہ بچھڑنے والے امانتوں کے عذاب بن تھے

بچھڑنے والوں کی واپسی کے سراب میں تھے
بچھڑنے والو!
مری صدا شہرِ سبز پرچم سے جب بھی سُننا
ابد صفت مامتا سے کہنا
کہ میرے کمرے میں میرے کپڑوں سے دھول جھاڑے
مری کتابوں میں میرے ہاتھوں کے نقش دیکھے
خموش آنگن میں اُگتے پیڑوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر پکارے
کہ آؤ ـــــ اب شام ہو گئی ہے!

ہری رُتوں کی صدا پہ
سرسوں کا گیت کھیتوں میں بجھ چکا ہے
ہوا کا دوشیزہ دھوپ کا جسم
نیم بیدار خوشبوؤں میں نہا چکا ہے
میں سوچتا ہوں کہ واپسی کے سفر سے پہلے
یہی سماں میرے گاؤں میں ہو
ہر اک صدا شہرِ سبز پرچم کی چھاؤں میں ہو!

(فنون لاہور)

ساقی فاروقی

سوگ نگر ۸۳ء

چوک چوک
خامشی کھڑی ہوئی
جس کے بند کان میں
ایک سبز خوف کے
سُرخ زہر میں بجھی
زرد زرد بالیاں پڑی ہوئی
خون پوش راستے
راستوں میں سولیاں گڑی ہوئی
رات کے طلسم سے
لوگ اداس بھی نہ تھے
روشنی خیال کے آس پاس بھی نہ تھی

زاہد ڈار

نظم

جب انسان پرندوں کو تلاش کرے گا تو وہ اُسے کہیں بھی
دکھائی نہیں دیں گے
جب انسان پھولوں کو تلاش کرے گا تو وہ اُسے کہیں بھی
دکھائی نہیں دیں گے
جب انسان درختوں کو تلاش کرے گا تو وہ اُسے کہیں بھی
دکھائی نہیں دیں گے
جب انسان جانوروں کو تلاش کرے گا تو وہ اُسے کہیں بھی
دکھائی نہیں دیں گے
جب انسان جذبوں کو تلاش کرے گا تو وہ اُسے کہیں بھی
دکھائی نہیں دیں گے
جب انسان انسانوں کو تلاش کرے گا تو وہ اُسے کہیں بھی
دکھائی نہیں دیں گے
جب انسان آئینے میں دیکھے گا تو اُسے وہاں کچھ بھی
دکھائی نہیں دے گا

(ادبِ لطیف لاہور)

محمد سلیم الرحمٰن

نظم

یہ چپ چاپ اندر سے جلتی ہوئی شام جس میں کہیں بھی
نہ ذرّہ برابر ہے حرکت نہ کوئی آواز
بظاہر اسی خامشی کے سہارے زمیں سے ابھر کر،
ستاروں کو چھوتی ہوئی، ایک پھوٹک سی دیوار بن کر کھڑی ہے،
ذرا ٹھیس لگنے سے گر کر
ندارد۔

یہ ماچس کی تیلی رگڑنے کی آواز اور زرد شعلہ
اندھیرے میں سگرٹ کا جلتا سِرا
یا جوالا مکھی کا دہانہ
نہ بولو کہ ہر شے ابھی سانس روکے، کنارے پہ اٹکی
ہوئی ہے، ابھی کچھ نہ تولو

جہاں آگ بجھنے کو ہو کیوں وہاں اتنے سارے
دہکتے ہوئے رنگ اور پُر حرارت تشبیہیں
اندھیرے میں تحلیل ہونے سے پہلے مرے دائیں بائیں

صلاح الدّین محمود

پہلی نیند کا پہلا خواب

اب میں وہ مور ہوں کہ جو میرے بچپن میں زندہ تھا
اور اب میرے خوابوں میں آئندہ کا پرندہ ہے،
اب میں وہ اندھی چڑیا ہوں
کہ جو میرے کاندھے پہ زندہ ہے
مگر میرے خوابوں میں بینائی پاکر، مجھ کو ہر شب
نیند کا بندہ بناتی اور اُڑ جاتی ہے
اب میں اپنے خواب کی سرزمین خود ہوں؟
خواب کی خاک، خواب کی خاک میں ابھی تک پوشیدہ پتھر
خواب میں چہار سمت، ہر سمت سے آکر بہتا پانی،
خواب در خواب میں، آہستہ آہستہ، برسوں سے اُگتا ہوا وہ پودا
کہ جو کل رات، نیند کی سدا جوان کیفیت میں، اپنے پرندے کا
پہلی بار شجر بنا تھا۔
میں وہ پہلا سورج ہوں جو میں نے اپنے پہلے خواب میں دیکھا
اور اب خواب کا آخری چاند بھی میں ہی ہوں،

وُہ آخری چاند
کہ جس کی روشنی میں،
مَیں نے اپنے ایک خواب میں،
مہکتی لکڑی سے، تازہ تازہ، چِرے ہُوئے
کورے تختوں پر
ایک آبائی چاندر کے درمیان،
اپنے ننگے، شبنم سے نم، جِسم کو
مُردہ پایا تھا؟
میری ہتھیلیوں کے پیالوں میں، شبنم کا گھراجل
رات کے لب کی مایا تھا
کہ جِس میں
میرے خواب کا آخری چاند
آپ سے آپ اُتر آیا تھا،
اور مَیں، اب اپنے لہو میں
آپ اپنا سایہ تھا ——

(ادبِ لطیف لاہور)

اختر حسین جعفری

جہاں دریا اُترتا

۱

سرِ شکِ خوں، رُخِ مضموں پہ چلتا ہے تو اک رستہ نکلتا ہے
ندی دریا پہ تھم جائے
لہو نقطے پہ جم جائے تو عنوانِ سفر ٹھہرے
اسی رستے پہ سرکش روشنی تاروں میں ڈھلتی ہے
اسی نقطے کی سُولی پر پیمبر بات کرتے ہیں
مجھے چلنا نہیں آتا
شبِ ساکن کی خانہ زاد تصویرو! گواہی دو
فصیلِ صبحِ ممکن پر مجھے چلنا نہیں آتا
مرے چشموں میں شورِ آب یکجا بر شگالی ہے
ندی مفروض بادل کی
مرا دریا سوالی ہے
رگِ حرفِ زبوں میں جو چراغِ خوں سفر میں ہے
ابھی اُس نقطۂ آخر کے زینے تک نہیں آتا
جہاں جلّاد کا گھر ہے
جہاں دیوارِ صبحِ ذات کے رخنے سے نگہ خشمگیں
بارود کی چشمک ڈراتی ہے
جہاں سُولی کے ممبر پر پیمبر بات کرتے ہیں

۲

اب ان باتوں کے سکے جیب کے اندر کھنکتے ہیں کہ جن پر
قصرِ شاہی کے مناظر
اسلحہ خانوں سے جاری حکم کندہ ہیں
بھرے بازار میں طفلِ تہی کیسہ پریشاں ہے کہ اس کے پاؤں
ٹکسالوں کے رستے سے ابھی نا آشنا ہیں
اور اس کا باپ گونگا ہے

ندی رُک رُک کے چلتی ہے
تکلم رہن رکھنے سے سفر آساں نہیں ہوتا
ہُوا پسپا جہاں پانی
جہاں موجوں نے زنجیرِ وفا پہنی، سپر گرداب کی رکھدی
عَلَم رکھے، قلم رکھے
خفا بادل نے جن پایاب دریاؤں سے منہ موڑا
جہاں تاراج ہے کھیتی
جہاں قریہ اجڑتا ہے
طنابِ راہ کٹتی ہے کہیں خیمہ اجڑتا ہے
وہاں سے دُور ہے ندی
وہاں سے دور ہے بچہ کہ اس کے پاؤں
دریاؤں کے رستے سے ابھی نا آشنا ہیں
اور اس کا باپ گونگا۔ ہے

اُسے چلنا نہیں آتا
فصیلِ صبحِ ممکن پر اسے چلنا نہیں آتا

۳

سحر کے پاس ہیں منسوخ شرطیں صلح نامے کی
صبا، درسِ زیاں آموز کی تفصیل رکھتی ہے
کسی تمثیل میں تم ہو
کسی اجمال میں، مَیں ہوں
کہیں قرطاسِ خالی کا وہ بے عنوان ساحل ہے
جہاں آشفتگانِ عدل نے ہتھیار ڈالے ہیں
بہت ذاتیں ہیں صدموں کی
کئی حصے ہیں سینے میں نفس گم کردہ لمحے کے
کئی طبقات ہیں دن کے
کسی صبحِ مکافاتِ سخن کے منطقے میں تم مقیّد ہو
کسی پچھلے پہر کے صلحنامے کی عدالت میں
کڑی شرطوں پر اپنے دستخط کے رُوبرو مَیں ہوں
سنو، قرطاسِ خالی کے سپر انداز ساحل سے
ہوا اک بات کہتی ہے
اُدھر، اُس دوسرے ساحل سے جو ملاح آیا ہے
زمینیں بیچتی بستی سے کیا پیغام لایا ہے
کوئی تعزیر کی دھمکی ؟
کوئی وعدہ رہائی کا ؟
کوئی آنسو ؟
کوئی چِٹھی ؟

اعجاز احمد

نظم

اپنا وجود، اپنے وجود کی پسماندہ توانائی بار بار
سمیٹ لینے کے جان لیوا عمل میں
تم بھی بار بار کچی نیند کی طرح ٹوٹ گئی ہو
میں نے تمہاری مسکراہٹ کو
بھیگے کاغذ کی مثال پھٹتے دیکھا ہے اور سوچا ہے
کہ خدا جانے اس انسانی
بے رخ جہان میں ایسے نرم، بے کاست، انتشار پذیر
حسن کی نگہداشت کون کر سکے گا

پاس آؤ

میں تمہیں کاغذ کا یہ مسلا ہوا پرزہ
یہ کٹی پھٹی نظم دینا چاہتا ہوں جس سے یہ بارش برسی ہے
یا شاید آنسو
اور لفظوں کی سیاہی پھیلتی چلی گئی ہے
میں یہ لفظ تمہارے سپرد کروں گا تاکہ تم دستانوں

اور بٹوے اور رسیدوں کے ساتھ انہیں بھی
اپنی برساتی کی جیب میں بھر لو
اور چاہو تو تنہائی یا اُچاٹ نیند یا محض رنج کے لمحوں میں
استعمال کر سکو

میں چاہتا ہوں کہ یہ لفظ تم تک پہنچ سکیں
کہ تم نے کہا تھا کہ نظمیں مقدس نہیں ہوتیں
کہ نظمیں کسی کا مقدر بناتی ہیں نہ بگاڑتی ہیں
میں چاہتا ہوں کہ یہ لفظ تم سے کہیں کہ ہاں
اگر زندگی ریاکار نہ ہو تو ہمیں کسی نظم کی حاجت نہیں

(محراب لاہور)

زہرا نگاہ

تھکن

کہاں کی تھکن ہے
یہ کیسی تھکن ہے
دبے پاؤں شہرِ بدن میں یہ اُتری
رگوں میں لہو کی طرح بہہ رہی ہے

اُنگلیاں بارِ ناخن سے بیزار ہیں
میری آنکھوں پہ پلکیں گرانبار ہیں
سانس سینے میں مصروفِ آزار ہے
میرے شانوں پہ رکھا ہوا بانجھ سر بارِ بیکار ہے

یہ تھکن قربتوں کی نہایت نہیں
جس میں آسودگی کی مہک ہو
یہ تھکن راستوں کی مسافت نہیں
روتے منزل کی جس میں جھلک ہو

یہ تھکن فکر کی بھی روایت نہیں
جس سے اوروں کو کوئی بشارت ملے
یہ تھکن عمر کی بھی علامت نہیں
جس سے اوروں کو جینے کی ہمت ملے

یہ تھکن میرے اندر کی اپنی تھکن
(مری کوکھ میں پلنے والی تھکن)
رگوں میں لہو کی طرح بہہ رہی ہے
کہاں کی تھکن ہے
یہ کیسی تھکن ہے

(سیپ، کراچی)

آفتاب اقبال شمیم

نارسیدہ لمحے کا بلاوا

زید! یہ کیسے پھول ہری ہری آشاؤں کے
دن کے صحن میں کھلتے ہیں
نیم جنوں کی خوشبوئیں
سینے کی تختی پر لکھتی رہتی ہیں
بے مفہوم زباں میں حرفِ شکستہ سے
آ مکتب سے بھاگ چلیں
دیکھ! وہاں پر
ریت کا ٹھہرا دریا نیلی بینائی کی
وسعت سے جا ملتا ہے
سُنتا ہے تُو دل میں دُھوپ کی دھڑکن سی؟
ایک تمنّا نا معلوم تعاقب کی
ہم سے آگے آہٹ آہٹ چلتی ہے
آدھے عرش کی دُوری سے
دیکھ! پتنگیں کٹ کر ڈولتی جاتی ہیں

پیچھے پیچھے
ریلے ہی ریلے ہیں اُٹھی باہوں کے
کیا معلوم ہوا کا پرچم کس خوش بخت کے ہاتھ آئے
آ ہم بھی یلغار کریں
پھر کیا
وہ ہم دونوں سے قد آور بھی ہیں، آگے بھی

(فنون لاہور)

نذیر قیصر

عورت

وہ رات کو بستر بچھاتی ہے
اور سارا دن چادر کی شکنوں سے

اپنا زخمی بدن چنتی ہے
اس کی خالی باہوں میں چوڑیاں

اور چھاتیوں میں سناٹے گونجتے ہیں
وہ اپنے دل کا پیالہ

آنسوؤں سے
اور اپنا پیٹ حمل سے بھرتی ہے

(ادبِ لطیف لاہور)

پروین شاکر

فرخ فروغ زاد کیلئے ایک نظم

مصاحبِ شاہ سے کہو کہ
فقیہہِ اعظم بھی آج تصدیق کر گئے ہیں
کہ فصل پھر سے گناہ گاروں کی پک گئی ہے
حضور کی جنبشِ نظر کے
تمام جلّاد منتظر ہیں
کہ کون سی حد جناب جاری کریں
تو تعمیلِ بندگی ہو،
کہاں پہ سر اور کہاں پہ دستار اُتارنا احسن العمل ہے
کہاں پہ ہاتھوں، کہاں زبانوں کو قطع کیجئے
کہاں پہ دروازہ رزق کا بند کرنا ہوگا
کہاں پہ آسائشوں کی بھوکوں کو مار دیجئے
کہاں بٹے گی امان کی چھوٹ
اور کہاں پہ
رحم کے احکام جاری ہوں گے

کہاں یہ نوسالہ بچیاں، چہل سالہ مردوں کے ساتھ سنگین میں پرونے کا حکم ہوگا
کہاں یہ اقبالی ملزموں کو
کسی طرح شک کا فائدہ ہو
کہاں یہ معصوم دار پہ کھینچنا پڑے گا۔
حضور احکام جو بھی جاری کریں
فقط التجا یہ ہوگی
کہ اپنے ارشادِ عالیہ کو
زبانی رکھیں
وگرنہ
قانونی اُلجھنیں ہیں!

(سیپ کراچی)

افضال احمد سیّد

یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں

یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں
کہ میری تلاشی لی گئی
اور میرے دل کو چھین لیا گیا

اور نہ یہ کہ
مجھے باہر نکالنے کے لئے
میرے گھر کو آگ لگا دی گئی

اور نہ یہ کہ
کتے پکڑنے والی قینچی
میری کمر میں پھنسا کر
مجھے ٹرک میں ڈال دیا گیا

اور نہ یہ کہ

جلتا ہوا کوئلہ
اپنی مٹھّی میں چھپا کر
میں نے پوچھا
"میرے ہاتھ میں کیا ہے"
اور
تم کوئی جواب نہ دے سکیں

(ادبِ لطیف لاہور)

نسرین انجم بھٹی

کفارہ

وہ جو ہمیشہ جلدی میں ہوتا ہے، اُسے
آدھی ڈگر پر روک لینا
اور کہنا کہ ہے راجن:
جب تجھے کوئی ایسی نار ملے، جس کے پلو میں ایک ٹوٹی چوڑی کے
دو ٹکڑے بندھے ہوں
اور اس کی ہتھیلی میں چوڑی توڑ کر پیار جتانے کا زخم ہو
اور جو تجھے خواب
اور تو جسے شک سمجھتا ہو، تو مجھے یاد کر لینا
اور میرا کوئی نام نہ رکھنا
اور یہ بھی کہنا کہ "ہے پوُرن:
جب رات گھٹ کر آدھی رہ جائے
اور چاند بڑھ کر پورا
تو کوئی خواب نہ دیکھنا اور کوئی دعا نہ مانگنا
کہ کوئی چاند تم سا پوُرا
اور کوئی خواب تم سے سندر نہیں
ایسے میں تم لیس آئینہ دیکھنا

یا جھیلوں میں اپنا مُکھ" اور اس وقت تک دیکھتے رہنا
جب تک کبوتروں کی آنکھ نہ لگ جائے
اور وہ تمہیں اپنی آنکھوں میں بند نہ کرلیں
اور اس سے کہنا
تم جو میری آنکھوں کے قیدی ہو
اس شرط پر آزاد ہو سکتے ہو کہ
اپنی ہنسی چھوڑ جاؤ
میری آنکھیں لے جاؤ
تیز دھوپ میں تم پر سایہ کریں گی
جڑواں بیٹیاں ہیں، ہنسیں گی تو اکٹھی اور روئیں گی تو اکیلی
تم ان سے دونوں موسم مانگ سکتے ہو
اور اگر تم بہت سے لوگوں سے گزرو اور گزر نہ سکو
تو ان سے اپنا صدقہ اتار دینا
اور اس سے یہ بھی کہنا کہ ہے موہنا!
بیت جھڑ کے پنکھ
ان بالکوں میں بانٹ دینا، جو تجھ سے پریم ودّیا پڑھنے آئیں
اور جانتے سمے
پھولوں کے موسم
ناگنوں کو دے جائیں
اور اس سے کہنا کہ ہے دِسیا
ماگھ کی رات اپنا جنگی جیونٹی سے مانگے
تو سمجھ لینا کہ ابھی سنجوگ کے دن میں کوئی دم باقی ہیں

اور جاگنے والے سونے والوں سے
اور سونے والے جاگنے والوں سے اچھے ہیں
اور اس سے یہ نہ کہنا کہ رہے نروئی !
آگ میں اگ جیوڑا رہتا ہے ۔ جس کے پنکھ نہیں
ہوں گے
اور جس کے نین ناچنا بھول گئے ہوں گے
اور جس کا من کچی ہدرا جیسا ہو گا
اور جو اپنے پریتم کے کسی جنم کا کفارہ ہو گا) اور چپ رہنا

یوسف کامران

اکیلے سفر کا اکیلا مسافر

میں نے برسوں زندگی کی قہقہہ بار فضاؤں میں
مسرتوں کے جھُولے جھُولے
اب ماتم کدے میں سوگوارِ حیات لئے
خون کے آنسو بہا رہا ہوں
رات صبح ہونے تک میری آنکھوں میں بسیرا کرتی ہے
اور دن میرے جوتوں کے تسموں میں رہتا ہے
میرے جوتوں میں ریت بھری ہے
اور میری جیب میں ہوائیں
یادوں کی چادر اوڑھے اَنگنت تنہائیاں
اور میں ستاروں کی زنجیریں اپنی کلائیوں پہ باندھے
گہری بے خیالی میں گھوم رہا ہوں
کاغذ پر لکھے لفظوں نے مجھے دھوکہ دیا
میں اپنی نظمیں اب صرف پتھروں پر لکھوں گا

(ادبِ لطیف لاہور)

تنویر انجم

اک طویل جنگ کے بعد

میں نے اپنی زندگی
خواب دیکھنے، لڑنے اور خار چننے میں ضائع کی

مجھے افسوس ہے
خواب مجھے خوش کرتے رہے
اور محبت کے لمحوں کو ملتوی کرتے رہے
بہت معمولی باتوں کے لیے
مجھے ذلیل کیا گیا
اور میرے تخیل نے
مجھے ان باتوں سے طویل جنگوں میں ضائع کیا
جنھیں چند لفظوں سے شکست دی جا سکتی تھی
میری عبادت گاہ کو کسی گھر سے آگ نہیں ملی
مجھے آتشدان کو روشن رکھنے کا طریقہ جاننے کے لیے
اپنے دل کو جلانا پڑا
اور اتنی دور تک جانا پڑا
کہ عبادت گاہ کو واپس آنا بے معنی ٹھہرا

کسی نے مجھے کوئی طریقہ نہیں بتایا
کوئی اس راہ پر نہیں آیا
جہاں آزاد ہوائیں
میرے لیے کانٹے اگاتی رہیں
اور میری ضد تمہارے لیے راستے آسان کرتی رہی

مجھے افسوس ہے
میری زخمی انگلیاں
جب تک تمہارے لیے پھولوں کا ہار بنا پائیں گے
پھول مرجھا چکے ہوں گے
اور تم بہت سے تحائف لے کر
اپنی کامیاب محبت اور آزادی کا جشن منانے جا چکے ہو گے

سلیمان شکیب

پہاڑوں پر میں ننگے پاؤں چلنا چاہتی ہوں

حدودِ شہر سے باہر
کڑکتی دھوپ میں چٹیل پہاڑوں پر
میں ننگے پاؤں چلنا چاہتی ہوں
مجھے محسوس ہوتا ہے
ہوا صحرا میں تنہائی کا نوحہ پڑھ رہی ہے
چٹانوں کے بدن
میرے گلابی نرم تلووں سے کچل جانے کی حسرت میں
سلگتے ہیں
دہکتے پتھروں کے ہونٹ!
میری انگلیوں کے لمس کی چاہت میں جلتے ہیں
کسی ذی رُوح کے قدموں کی آہٹ کو ترستی یہ چٹانیں
منتظر ہیں اُن کی جو دُکھ بانٹ لیتے ہیں
قریب آتے ہیں
دُوری کی خلیجیں پاٹ لیتے ہیں

میں اُن سے جا ملوں گی اور سرگوشی کروں گی
سنو! میں بھی دُکھی ہوں
فرق بس یہ ہے، تمہیں تنہائی کا غم ہے
مجھے لوگوں سے مل کر دکھ ملے ہیں
سُنو
تنہائی بے شک جانگسل ہے دشمنِ جاں ہے
مگر تنہائی میں پھر بھی اماں ہے
یہ دُکھ کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو، لیکن رگِ جاں سے قریب
آئے ہوئے لوگوں کے
بخشیدہ دکھوں سے پھر بھی کم ہے
کم ہی ہوتا ہے
اسے سہنا بہت مشکل سہی
ممکن تو ہوتا ہے!!

(فنون، لاہور)

کشور ناہید

سانول موڑ مہاراں

خلا پہن کے ہوائیں پر مارنا
زندگی ہوتی
تو میرا ہی آشیانہ، سب سے اونچا ہوتا
بل کھاتی سڑکوں، گھنے جنگلوں
بہتے دریاؤں اور اترتی آبشاروں میں سے
کوئی بھی تو تم سے رشتہ نہیں بناتا ہے
تمہاری دھار، چاقو کی سی تھی
مگر صرف چاقو کا دستہ بن کر
تم نے خود ہی پناہوں کے پردے چاک کئے
تمہاری زندگی کی ہر صبح
سورج کی منڈی میں بے بھاؤ اُٹھالی گئی
تمہیں پرمٹ پر جتنی آزادی ملتی ہے
اس کا راشن تو ایک صبح کے لئے بھی ناکافی ہوتا ہے
میں اب سمندر کی سب سے اونچی لہریں

خود کو تحلیل کر کے
ریت بن کے بکھر چکی ہوں
ساحل سمندر، میری وسعت
اور آنسوؤں کی طرح نمکین پانی، میری حیات ہے
آگ لگے پیروں کے ساتھ تڑپتی چڑیا
میرے سینے پہ آگرتی ہے
ہوا اور تیز چلتی ہے
رات اور گہری ہوتی ہے
محبت مرنے کی قیمت دے کے حاصل ہوتی ہے
سمندر کی سب سے اونچی لہر اور میں
ساحل پہ بکھری ریت اور میں

(معاصر لاہور)

حسن عباس رضا

بشارت اب سوا نیزے تک آپہنچی

مَیں جس دن تیسویں دیوار تک پہنچا
تو یادوں کی طرح
پیچھے گزر جاتی ہر اک دیوار نے
مجھ کو صدا دی تھی

میں آج اکتیسویں دیوار پر ہوں
اور اب بھی
میرے کشکولِ سماعت میں صداؤں کے وہ سکّے گر رہے ہیں
جو کسی بازار یا دکّان پر چلتے نہیں ہیں۔
اور بہت پیچھے کو رہ جاتی
کسی دیوار سے اب بھی صدا آتی ہے۔
آجاؤ، حسن عباس! آجاؤ!!
کہ گلیوں اور بازاروں میں
کینچے کھیلتی عمریں
تمہیں آواز دیتی ہیں۔

تو میں اک جست میں اُن موسموں کو
اُن دنوں کو لوٹ جاتا ہوں
جہاں مجھ سے مرا چنچل سجیلا بچپنا
ایسے لپٹ جاتا ہے
جیسے مدتوں کے بعد دو بچھڑے ہوئے محبوب ملتے ہیں۔
میں اُس سے پوچھتا ہوں ——
"خواب ہوتی ساعتوں کی کس گلی میں
میری خوشیوں کا خزینہ دفن ہے؟"
تو، وہ
مری انگلی پکڑ کر
مجھ کو اک ایسی گلی کے موڑ پر لے کر پہنچتا ہے۔
جہاں سے دُور تک دکھلائی دیتی ساری گلیاں
ایک دُوجی سے جُڑی اس طرح لیٹی ہیں
کہ جیسے دو بدن پیوست لیٹے ہوں

میں اُن گلیوں میں آوازہ لگاتا ہوں کہ:
"کوئی ہے —————؟
اگر موجود ہے تو باہر آ جائے
کہ ناموجود لمحوں سے گلے ملنے
حسن عباس آیا ہے
تمہارا دوست آیا ہے۔"

ابھی میری صدا

گلیوں کے اُجڑے بام و در کو چوم کر واپس نہیں آتی
کہ ہر گھر کے شکستہ در سے
اُجلے، مسکراتے، پھول چہرے
مجھ سے ملنے کے لیے
گرتے، سنبھلتے، دوڑتے آتے ہیں
میں سب سے گلے ملتا ہوں
اُن کو چوم لیتا ہوں
وہ مجھ سے
اور میں اُن سے بیت جانے والے ماہ و سال کا
احوال کہتا ہوں
میں جب ان کو بتاتا ہوں
کہ میں شاعر ہوں
اور حرف و سخن کی بادیہ گردی میری تقدیر ٹھہری ہے
تو وہ ہنستے ہیں
اتنے زور سے ہنستے ہیں
جیسے شہر کے سارے کلیساؤں میں سوئی گھنٹیاں
اِک ساتھ بج اٹھیں

وہ کہتے ہیں
کہ تم جیسا کھلنڈرا اور لاپروا
بھلا شعر کیونکر کہتا ہے
کہ اب تو شعر کہنا
اک عذابِ مستقل ہے ۔

تم نے کیونکر اس عذابِ جانستان کو
اپنے سینے سے لگایا ہے ؟"

تو میں اُن سب کی صورت دیکھتا رہتا ہوں
اُن سے کچھ نہیں کہتا
نہیں کہتا
کہ لمبی چپ کی وا آغوش
مجھ کو اپنی باہوں میں جکڑ لیتی ہے
اور میں چپ کی بند آغوش میں سمٹا ہوا
خاموش رہتا ہوں
میں اُن سے کچھ نہیں کہتا
اور اُن کا ہاتھ تھامے
خواب ہوتے باغ کی اُس سمت لے چلتا ہوں
جس کی ہر روش پر
میری گزری ساعتوں کے نقش کندہ ہیں
حسیں یادوں کے سجرے باغ میں ہر سُو
گلاب و نرگس و نسرین کے پھولوں پر بیٹھی تتلیاں
آہٹ ابھرتے ہی
ہوا کے دوش پر اُڑتی، مچلتی، لہریئے لیتی
ہمارے جال ہاتھوں سے پھسل جاتی ہیں ۔
اور ہم مٹھیوں پر پھیل جاتے رنگ
آنکھوں سے لگا لیتے ہیں ۔
اُن کو چومتے ہیں

آنکھ بادل سے برستی بارشیں
میری ہتھیلی پر کھلے تتلی کے رنگوں سے گلے ملتی ہیں
اس باہم رفاقت سے
ہتھیلی پر مرے، بچپن
مرے ہمزاد کی تصویر ابھرتی ہے
مَیں اس کو دیکھ کر روتا، سسکتا ہوں

اسی اثنا میں میرے یار سارے
تتلیوں کو قید کرنے کی مسلسل کوششوں سے تنگ آکر
میری جانب لوٹ آتے ہیں
مجھے روتا، سسکتا دیکھ کر ہنستے ہیں
اتنے زور سے ہنستے ہیں
جیسے شہر کے سارے کلیساؤں میں سوئی گھنٹیاں
اک ساتھ بج اٹھیں
وہ مجھ کو قہقہوں کے درمیاں
میداں کی جانب لے کے چلتے ہیں
جہاں سب بھول ہاتھوں میں
پتنگیں اور رنگلی چرخیاں ہیں
اور مَیں ان میں گھرا
رنگیں پتنگوں کو
کھُلی روشن فضا میں پینچ لڑتے اور کٹتے دیکھتا ہے۔
میرے ہاتھوں میں بھی اب
مانجھا لگی اک ڈور کی چرخی ہے
اور میری پتنگ اڑتی

ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی ڈوجی پتنگوں سے
گلے ملتی
فلک کی وسعتوں میں تیرتی ہے
دفعتاً اک پیچ لڑتا ہے
میری مانجھا لگی ڈور اب مرے ہاتھوں میں
اتنی تیز رفتارانہ چلتی ہے
کہ جیسے ماؤں کی آغوش سے نکلے ہوئے بچے
بڑھاپے کے سمندر تک پہنچ جاتے ہیں
—— اور پھر دفعتاً انگشت میں یوں ڈور کھبتی ہے
کہ جیسے اپنا خنجر
اپنے سینے میں اُتر جائے
مرے پنڈے میں سسکاری اُبھرتی ہے
میں سسکی لے کے چاروں سمت تکتا ہوں
وہاں کوئی نہیں ہے !!
اب نہ ہاتھوں میں پتنگیں ہیں
نہ پیارا دوں
اور یادوں کے شناسا پھول سے چہرے
—— میں اب تنہا کھڑا ہوں
خود کو جوانی سے گلے ملتا ہوا محسوس کرتا ہوں ——
مگر میں پھر بھی تنہا ہوں
بہت تنہا —— !!
اچانک خواب ہوتے پردۂ سیمیں پہ خواہش رنگ
تصویریں اُبھرتی ہیں ——

کسی کو چاہتے
اور چاہے جانے کی تمنا
میرے دل آنگن میں
کلیوں اور غنچوں کی طرح
انگڑائی لیتی ہے، چٹکتی ہے ـــ

میری خوش قسمتی
میری ازل تنہائی کو یوں ڈھانپ دیتی ہے
کہ جیسے ماں کی ممتا
لاڈلے بچوں کے سب عیبوں پر پردہ ڈال دیتی ہو
مجھے شہرِ جفا میں
چاہتے، اور چاہے جانے کی تمنّا ہی نہیں رہتی
کہ مجھ سے اتنی بے پایاں محبت
اور چاہت آن ملتی ہے
کہ پھر کوئی تمنّا، کوئی خواہش ہی نہیں کھلتی ـــ

گلابی عمر کی روشن جبیں شہزادیوں
کومل سجیلی لڑکیوں کی ہاتھ دیکھاؤں پر
میرا نام روشن چاند کی صورت دمکتا ہے
دھنک کے رنگ میں ڈوبے ہوئے پیراہنوں کا شمیانہ
میری پیاسی آنکھ کے صحرا میں کھلتا ہے
تمنّا، دُودھیا، دل کی
صورت میرے آنکھ میں اُترتی ہے

مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ گویا میں مقدّر کا سکندر ہوں
کہ جس دم بھی جسے چاہوں
اُسے زیرِ نگیں کر لوں ـــــ
ـــــ مگر ـــــ
حیران کن خوشیوں کے ہونے بھی
مری تنہائی مجھ پہ غالب آتی ہے
مری بے چینیاں
میرا تجسّس
ساحلِ اُمید کی جانب نگاہیں وا کیے
بُت کی طرح استادہ رہتا ہے۔

میں سُنتا ہوں
کہ رس ٹپکاتی شہد آگیں صداؤں کی جگہ
اب شہر کی گلیوں میں
بازاروں میں، محلوں میں
برسنے تازیانوں کی کرخت، اور خوف پھیلاتی صدا کی
حکمرانی ہے ـــــ
سجل جسموں سے اب خوشبو نہیں اُگتی
کہ وحشت بال کھولے
کوچہ و بازار میں
دہشت ملی بارود کی بدبو اُگلتی ہے۔

مرے یارو
مرے پیارو کے نام
شہرِ مسکن سے نہیں
زنداں سے آتے ہیں
کہ سارے قاصدوں نے
بیعتِ جبر و ستم کر لی ہے ——
مری بے چینیوں
میرے تجسس کا سمندر
لمحہ لمحہ ایسے طوفانوں کی زد پر ہے
جو آنے والی ساعت کی سبھی طغیانیوں کے بعد
کالی رات کا
سا لا مقدر ہیں ——

میرا بچپن
جوانی کی سجل انگشتری میں وہ نگینہ ہے
وہ آئینہ ہے
جس میں اچھے موسم
چاند جیسے اجلے منظر دیکھ لیتا ہوں
—— وگرنہ ——
ہاتھ کی ریکھاؤں میں
میرے مقدر کا سکندر
فاتحینِ وقت کے اُس فیصلے کا منتظر ہے
جس کے بعد

آواز کا روشن، جگر سورج
سیہ شب کی اندھیری گود میں گر جائے گا !! ——
لیکن
سیہ شب مختصر ہے ——
اُس کی کالی کوکھ ہے
میری تمناؤں کا
وہ سورج بھی اُبھرے گا
جو میری
اور تمھاری آرزوؤں کے گلابوں کو
سجل رنگینیاں دے گا
وہ سورج تو بہت نزدیک ہے
اُس کی بشارت
اب سوا نیزے سے بھی نزدیک تر ہے
اور بھی نزدیک تر
نزدیک تر ——

جاوید شاہین

مَیں نے رات سے پوچھا

مَیں نے رات سے پوچھا
"میرے گھر سے چوری ہو جانے والا خواب
تمہارے پاس تو نہیں؟
میرے ہمسائے کے بچّوں کا خواب
گھروں میں بیٹھی جوان لڑکیوں کے خواب
شہر سے ہجرت کر جانے والے سارے خواب
تمہارے پاس تو نہیں؟"
رات میری آنکھوں میں جھانک کر بولی
"اتنے سارے خوابوں کا چوری ہو جانا
اور شور نہ مچنا
اتنے سارے خوابوں کا قتل ہو جانا
اور سراغ نہ ملنا
اتنی ساری خوں آلود لاشوں کا دریا میں بہا دیا جانا
اور پانی کا رنگ تک نہ بدلنا
کیسے ممکن ہے

تمہاری مرضی کے بغیر
تمہاری شرکت کے بغیر"

پھر وہ گود میں اٹھایا ہوا چاند
میری طرف بڑھا کر بولی
"اس کے سر پر ہاتھ رکھو اور قسم کھاؤ
اپنی بے گناہی کی
اپنی معصومیت کی"
اور مَیں اُس کا منہ تکتا رہ گیا

اصغر ندیم سیّد

نظم کیسے تیار کی جائے؟

نظم کیسے تیار کی جائے؟
ایک لفظ تاریخ سے
ایک بغاوت سے
ایک غدر سے
لے لو
ان کی آنکھوں پر پٹی باندھو
دھوپ میں کھڑا کرو
بھوکا پیاسا رکھو
مشکیں کس دو
جو لفظ ثابت قدم رہے
اُسے اٹھا لو
ایک محبت لوک گیت سے
ایک مُٹھی میں دبے دِل سے
ایک سمندر سے
لے لو
انہیں تیزاب میں ڈال دو

اونچی عمارت سے گرا دو
کالی آندھی آنکھوں میں اُڑا دو
جو محبت بچ جاتے
اُسے اٹھا لو
ایک نفرت گھاس میں گرے دن کی آنکھوں سے
ایک بادشاہ کی خواہش سے
ایک جنگی قیدی کی بندوق میں بچی گولی سے
لے لو

پھر انہیں دودھ پلاؤ
شہد چٹاؤ
گرم کپڑے میں لپیٹو
جس میں زہر باقی رہے
اُسے اٹھا لو
ایک بیج نئے سال کی پہلی آواز سے
ایک سب سے قدیم تہذیب کے پہلے مُعلّم سے
ایک سورج کی خرُ جبین سے
لے لو

انہیں پتھر پر رکھ دو
جتنا ہو سکے گرمی پہنچاؤ
موسموں کی ہوا سے محفوظ رکھو
جو بیج زندہ رہ جائے
اُسے اٹھا لو

اب

اس چُنے ہوئے لفظ سے
محبت سے
نفرت سے
اور بیج سے
نظم کے تار بناؤ
نظم بنانا مشکل کام ہے
تار بناتے رہو
یہی بہت ہے۔

انشائیہ

محمد خالد اختر

مشاہیر کے خطوط

سالگرہ کا تحفہ بھیجنے والوں کے نام

(پیروڈی)

مکرمی سلمہ اللہ تعالےٰ

آپ کے "برتھ ڈے" کے تحفے کا بدل شکر گزار ہوں۔ وہ ترکی ٹوپی یا فیض کیپ جو میری برسوں کی رفیق تھی بوسیدہ اور میلی چکٹ ہو چکی تھی۔ بیگم اور عشرت میاں نے بارہا کہا کہ اس کی جان چھوڑیے اور نئی ٹوپی بازار سے خرید لیجئے۔ مگر میری طبیعت اس کا ساتھ چھوڑنے پر مائل نہ ہوتی۔ پھر مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ ایسے تردّد کروں آپ کے تحفے نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔ فوراً زریں فیتوں والے ڈبے کو کھول، شاندار ٹوپی کو سر پر رکھا اور آئینہ دیکھا۔ اپنی نئی ہیئت کو دیکھ کر ٹھٹک گیا اور "بوڑھی گھوڑی لال لگام" والی کہاوت یاد آ گئی۔ دل نے کہا "میاں اکبر حسین کیوں اپنی ہنسی اڑواتے ہو، پہلی ٹوپی ہی ٹھیک تھی"۔ مگر وہ ٹوپی بیگم نے ملازم کو دے دی تھی اب آپ کی ٹوپی پہنے پھرتا ہوں۔ آپ نے فی الواقع مروّت کی۔ ٹوپی کے ساتھ خود بھی تشریف لے آتے تو مزے آجاتے۔ میں تو تمام خیالات اور مضامین لیے ہوئے آپ کا منتظر رہا کہ آؤ گے تو خوب گپیں اڑیں گی اور منصوبے تیار کیے جائیں گے۔ آپ نے میرا حال دریافت کیا تو سُن لیجئے!

افسوس ہے کہ زندہ ہوں، کہنا بُرا ہے حال

کیا مختصر جواب یہ ہوتا کہ مر گیا

کیا کہوں ایک مدت سے کن مصیبتوں میں گھرا ہوں تفصیل کیا عرض کروں ۔ عنقریب دنیا سے ریٹائر ہوا چاہتا ہوں ۔

خواجہ حسن نظامی کو صدر بنا ئیے ۔ مجھے اس خارزار میں کیوں گھسیٹتے ہیں ۔ وہ صوفی نہاد بزرگ ہیں اور اپنے تصوف کے کاروبار میں دنیا کو بھی نہیں بھولے ...... یا لاہور کے اقبال صاحب کو لے آیئے وہ بھی صوفی صافی ہیں اور اس پر مستزاد بار ایٹ لا ۔

آپ کا ترقی خواہ سید اکبر حسین ۔ الہ آباد

بی بی —

پانچ روز ہوئے میں نے اپنی سالگرہ کا "جشن" منانے کی خاطر ٹیلی ویژن کے ان آرٹسٹوں کو جو میرے ڈرامے "دسمبر" میں تھے ۔ "لنچ" پر مدعو کیا تھا ۔ آپ کو اس لیے نہیں بلایا تھا کہ آپ شاید نہ آسکیں ۔ گپیں ہانکی جا رہی تھیں اور میں ایک تازہ بتازہ لطیفہ سنا رہا تھا کہ ایک چیختی ہوئی آواز کان میں پڑی "کس کو کہہ رہے ہو" ۔ میرا لطیفہ بیچ میں رہ گیا اور سب ہنسنے لگے ۔ کچھ سمجھ نہ آئی کہ یہ گلو بادشاہ کے بھائی کہاں سے نمودار ہو گئے ۔ اتنے میں چارلی چیپلن کی قد، کاٹھ اور حلیے کے ایک صاحب جنہوں نے تیتری نما مونچھیں رکھی تھیں دروازے میں سے داخل ہو کر سیدھے میری طرف بڑھے ۔ ان کے ہاتھ میں پنجرہ تھا اور پنجرے میں ایک عدد طوطا ۔ اب بات سب کی سمجھ میں آ گئی اور لوگ ہنسی کے مارے بے حال ہو گئے ۔ اس نوجوان نے پنجرہ چٹائی پر رکھا اور جیب سے ایک بھاری بھرکم سا لفافہ نکال کر مجھے دیا ۔ اس پر "برتھ ڈے بے بی ٹو ڈے" لکھا تھا اور آپ نے کچھ کشیدہ کاری بھی کی ہوئی تھی ۔ بات میری سمجھ میں آ گئی اور میں نے لفافے کو فوراً اندر کی جیب میں ڈال لیا ۔ چارلی چیپلن صاحب سمجھدار نکلے ، انھوں نے بھی راز افشا نہ کیا ۔ ورنہ یہ راز عطاء الحق قاسمی کے سوا میں نے کسی کو نہیں بتایا ۔ وہ صاحب بس پانچ منٹ بیٹھے اور چل دیئے ۔ میں نے پوچھا کہ اپنا تعارف ،

کرانے جا بیے۔ وہ فرمانے لگے، "نام تو میرا کچھ اور ہے۔ سب میجر کہہ کہہ کر پکارتے ہیں۔ طوطے کو سنبھال لیجئے۔" میجر صاحب یہ کہہ کر ہوا ہوئے اور پیچھے یار لوگوں کے پیٹوں میں ہنسی کے مارے بل پڑ گئے۔ کھانے کے دوران یہ پنجرے والے گلو بادشاہ دو دو منٹ کے وقفے کے بعد "کس کو کہہ رہے ہو" کی رٹ لگائے جاتے۔ عموماً وہ یہ فقرہ عین اس وقت ارشاد کرتے جس وقت میں کسی خوبصورت لطیفے کا آغاز کر رہا ہوتا یا اسے ختم کر رہا ہوتا۔ آپ کے طوطے نے میری لطیفہ گوئی کا مزا کرکرا کر دیا اور دل چاہا اس کی گردن مروڑ دوں۔ دعوت کے بعد جب چار ساڑھے چار بجے لوگ رخصت ہو گئے۔ میں نے اُن کے جاتے ہی آپ کا خط بلکہ قصۂ طویل غسل خانے کی چٹخنی کو اندر سے لگا کر پڑھا۔

خاتون دیکھیں آپ شرارتوں سے باز آجائیں! آپ نے لکھا ہے کہ گلو بادشاہ کو میجر تین سو روپے میں لنڈا بازار سے خرید کر لایا ہے جہاں یہ طوطے بکثرت مل رہے ہیں۔ آپ نے ناحق میری خاطر اتنا خرچ کیا۔ بہرحال آپ کی جدت کی داد ضرور دیتا ہوں۔ ویسے بی بی ہم اس گھر میں پٹس PETS نہیں رکھتے۔ بچوں کو ان کا شوق تو ہے مگر ہماری چتکبری بلی جو دیکھنے میں آپ کی طرح بڑی مسکین ہے جلدی یا بدیر ان کو   کر جاتی ہے۔ آپ کی کیس ہسٹری (CASE HISTORY) نما خط کا تفصیلی جواب تو بوقتِ ملاقات عرض کروں گا جو جلد از جلد ہونی چاہیئے۔ یہ جواب بھی تاخیر سے دے رہا ہوں۔ اصل میں دنیا کی بے معنی مکروہات وقت کو اس طرح نگلتی ہیں کہ اللہ! اللہ! کبھی کبھی تو اس بے بسی کا احساس ہوتا ہے جو اسکوٹر پر اس اناڑی شخص پر طاری ہوتی ہے جسے اسے روکنا نہ آئے ......
خیر شاید اسی کا نام زندگی ہے۔

میرا ڈرامہ "سمندر"، آپ کو اور آپ کے بھائی بہنوں کو (سوائے آپ کے والد بزرگوار کے) بہت پسند آیا۔ اس کے لیے بہت بہت شکریہ۔ آپ نے

سمندر کے بارے میں جو روشن روشن اور دل خوش کرنے والے جملے لکھے ہیں ان سے میرا حوصلہ بہت بڑھا ہے۔ آپ کے والد بزرگوار کو تو میرا کوئی ڈرامہ اچھا نہیں لگتا۔ ان کی مرضی ہے میں نے ٹیلیویژن کو ان کے خلاف نہیں بھڑکایا کہ ان کے اسکرپٹ، ایکسپیٹ (ACCEPT) نہ کریں۔ سمندر میں بھنور اتنے پڑتے جا رہے ہیں کہ کشتی ایک بھنور سے نکلتی ہے تو دوسرے میں پھنس جاتی ہے۔ کشتی کا رخ ساحل کی جانب ہو ہی نہیں رہا۔ ٹیلی ویژن والے جو ہمیشہ مجھ پر مہربان رہے ہیں مُصر ہیں کہ اسے سترہ ۱۷ قسطوں میں ختم کر دیا جائے ورنہ میں اس سیریل کو تیس چالیس قسطوں تک لے جا سکتا ہوں۔ یہاں میرے دوست نما دشمن ایسے ہیں جو بظاہر تو میری کامیابی پر میری پیٹھ تھپکتے ہیں۔ مگر اندر ہی اندر جل کر راکھ ہوئے جاتے ہیں۔ ایک اس قسم کے زہریلے سانپ کا قصہ تو میں غالباً آپ کو سنا چکا ہوں جو بولتا ہے تو ایسے لگتا ہے جیسے منہ میں مینڈک پھنسا ہے۔ پھر ایک سنسر صاحب ہیں وہ اتنی کانٹ چھانٹ کرتے ہیں کہ ہر قسط کا اسکرپٹ مجھے تین چار بار اُن کے مزاج کے مطابق موزوں کرنا پڑتا ہے۔ عجب مصیبت ہے۔ ان رکاوٹوں کی وجہ سے میرا کام بہت بڑھ گیا ہے۔

میرا مشورہ آپ کو یہ ہے کہ ٹیلی وژن آرٹسٹ اور سٹار ہونے کا خیال چھوڑ دیں۔ اس کے لیے بگ گنز (BIG GUNS) کی سفارش لازمی ہے اور اب تو حالات اتنے رو بہ زوال ہیں کہ سفارش سے بھی کام نہیں چلتا کیا بتاؤں بڑے چکر ہیں۔ دور کے ڈھول سہانے۔ میں اس معاملے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ بی بی گھر بیٹھ کر امور خانہ داری کی طرف توجہ دیں۔ سوئٹر، جرابیں وغیرہ نٹ کریں۔ مجھے ایک ہاتھ سے بُنے ہوئے سویٹر کی ضرورت ہے۔ کہیں تو اگلی ملاقات پر وُول (WOOL) لیتا آؤں۔ ... آپ نے لکھا ہے کہ اگلے روز آپ ٹی وی اسٹیشن پر گئیں تو ان

ان لوگوں نے آپ کو اندر نہ جانے دیا۔ دراصل اب اسٹیشن پر سیکورٹی بہت سخت ہو گئی ہے۔ چند روز ہوئے خود میرے ساتھ بھی یہ واردات 'زہریلے سانپ' کی ایما پر کی گئی۔ اس دن اتفاق سے میں سیکورٹی کارڈ گھر بھول آیا تھا۔ سیکورٹی کے معنک موٹے سے آدمی نے مجھے روک دیا۔ میں نے اسے کہا کہ میں امجد اسلام امجد ہوں۔ وہ بولا 'کہنے تو سب یہی ہیں۔ پندرہ منٹ کی حبص بیص اس کے ساتھ کی اور بڑی مشکل سے اپنے بلڈ پریشر کو قابو میں رکھا۔ اتنے میں جنرل مجیب الرحمٰن تشریف لے آئے۔ معنک آدمی نے انھیں سلوٹ مارا اور جنرل صاحب میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر مجھے اندر لے گئے۔ سیکورٹی والے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ویسے آپ ٹی وی اسٹیشن کو نے کیا گئی تھیں؟

میری شاعری کی دو کتابیں دسمبر میں انشاء اللہ آجائیں گی۔ سمندر کو بھی 'وارث' اور 'دہلیز' کی طرح کتابی شکل میں چھپوانے کا اہتمام ہو رہا ہے اور پھر اس کے بعد ان کی رونمائیوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ایک اور ٹی وی سیریل کا پودا ذہن میں اُگ رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اگلے کئی مہینوں تک ایسے ہی کاموں میں اُلجھا رہوں گا اور دم مارنے کی فرصت نہ ہو گی۔ پر بھی کوئی زندگی ہے۔

عطا چھٹی یا ساتویں بار صحیح سلامت ہندوستان سے لوٹ آیا ہے آئندہ سال مارچ تک شاید اس کی ایل سلواڈور EL - SALVADOR میں بحیثیت تھرڈ سیکرٹری تعیناتی ہو جائے۔ جنرل صاحب اس پر خاصے مہربان ہیں اسے ابھی اپنے تک رکھیں اور اپنے والد بزرگوار سے تو ہرگز ذکر نہ کریں۔

میرا ابھی اگلی جنوری میں فلسطین جانے کا ارادہ تھا مگر اب معلوم ہوا ہے کہ وہاں ابھی تک اسرائیلیوں کا قبضہ ہے۔ ابھی ابھی میری چھوٹی بیٹی بھاگی بھاگی آئی ہے اور بازو سے جھنجھوڑ کر کہہ رہی ہے۔ ابو۔ ابو گلو بادشاہ کو بلی نے

کھالیا ہے..... بی بی۔ میں نے کہا تھا نا کہ آپ نے خواہ مخواہ اپنی جیب پر بوجھ ڈالا۔ دوسرا طوطا بھجوانے کی تکلیف نہ کریں۔

اگر مناسب سمجھیں تو اپنے والد بزرگوار کو میرا سلام کہہ دیں۔ عطا کہہ رہا تھا وہ ہر ایک سے کہتے پھرتے ہیں کہ میں نے سمندر کا پلاٹ الیگزینڈر ڈوما کے ناول "دی کاؤنٹ آف مانٹی کرسٹو" سے اڑایا ہے۔ حالانکہ میں نے ڈوما کا یہ ناول پڑھا ہی نہیں۔ وارث اور دہلیز کے بارے میں بھی کئی لوگ ان ڈراموں کے مصنف ہونے کے دعویدار بن کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔

ہاں آپ کا یوسف وڑائچ ان دنوں لاہور ہی میں ہے اور حسب دستور خفقان کے مرض میں مبتلا۔ بلکہ اب خفقان بڑھ گیا ہے۔ اس کو ملنے یا اس سے ٹیلیفون پر بات کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اللہ اس پر رحمت کرے۔

پھر کب ملاقات ہوگی اور کس جگہ؟

صرف اور صرف آپ کا

امجد

ویسے وہ میجر کون تھا جو طوطا لیکر میرے پاس آیا تھا۔ آپ کا دوسری شادی کرنے کا تو ارادہ نہیں؟ میرے سر کے بالوں کی پوزیشن ایک جرمن ہیر ٹانک کے استعمال کی وجہ سے قدرے بہتر ہے۔

جناب من دام اقبالکم و فضل اللہ امالکمُ!

تسلیم!

دو ماہ پہلے جب آپ کی لاہور میں تشریف آوری ہوئی تھی اور آپ نے بندے کے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا تھا۔ میں نے گفتگو کے دوران اپنے سن پیدائش سے آپ کو مطلع کیا تھا اور غالباً باتوں باتوں میں اپنے گھوڑے کی وفات حسرت آیات کی داستان بھی آپ کو سنائی تھی۔ آپ نے

نہ صرف یہ کہ اس غریب کی تاریخ پیدائش کو ذہن میں رکھا بلکہ ٹھیک میرے جنم دن پر ایک گھوڑے کے تحفے سے بھی نوازا۔ مجھ گناہگار پر آپ کے پہلے بھی بہت احسانات ہیں۔ اس احسانِ عظیم کا بدلہ کیونکر چکاؤں گا؟

صبح جمعہ خان آپ کا محبت نامہ اور گھوڑا لے کر پہنچا۔ گھوڑا خوبصورت اور اصیل معلوم ہوتا ہے اور جمعہ خان نے یقین دلایا ہے کہ شوخیاں نہیں کرتا۔ میں نے اسے باغ علی کوتوال کے مکان پر بندھوا دیا ہے بلکہ پہلا مرحوم گھوڑا بھی وہیں بندھتا تھا۔ میرے گھر کے صحن میں اتنی جگہ نہیں۔ چارے گھاس وغیرہ کا انتظام بھی کر دیا گیا ہے۔ خاطر جمع رکھیں۔

کل اس پر بیٹھ کر کالج جاؤں گا۔ میں گھوڑے کو ہمیشہ آہستہ آہستہ چلاتا ہوں میرا دستور یہ ہے کہ دو شاگرد ساتھ ہوتے ہیں۔ ایک دائیں دوسرا بائیں۔ ان کو سبق پڑھاتا جاتا ہوں یہاں تک کہ کالج آجاتا ہے۔ پہلا گھوڑا میرے اس معمول کا عادی ہو گیا تھا۔ اس گھوڑے کا رویہ کیا ہو گا؟ کل پتہ چلے گا۔ آپ کو کل احوال لکھ بھیجوں گا۔

آپ کے مرحمت نامے سے احساس ہوا کہ آپ نہایت دل شکستہ اور رنجور ہیں۔ ہرگز ہرگز نہ گھبرائیے۔ حضرت مولانا گل حسن شاہ قادری قلندری موجود ہیں۔ میں ان کی خدمت میں آپ کے وسوسے عرض کروں گا۔ انشاء اللہ وہ توجہ کریں گے اور آپ کی سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ شاید ایک ہفتے کے اندر اندر وہ خواب میں آپ سے ملاقات کریں۔ داڑھی مونچھ منڈے ہیں۔ اُن سے مناسب تکریم و تعظیم سے ملیں اور کل حال بلاکم و کاست کہہ ڈالیں۔ اللہ ان کے صدقے سے سب اچھا کر دے گا۔

ماسٹر گرچند پر پچھلے دنوں جنوں نے غلبہ پایا اور انہیں پاگل خانے لے گئے۔ ٹم صاحب بہادر پرنسپل کی گھوڑے پر سے گرنے سے ٹانگ ٹوٹ گئی۔ خدا سب کی مشکلیں آسان کرے۔ والدعا بالتماس الدعا!

محمد حسین عفی عنہ پروفیسر عربی۔ گورنمنٹ کالج۔ لاہور

فکر تونسوی

ایک اکیلا تنہا

میری بیوی اکلوتی ہے۔ دوسری بیوی بھی آسکتی تھی لیکن میری بیوی نے اعلان کیا کہ میں بیوی اور سوتن دونوں کا رول ادا کر سکتی ہوں اور اس عمدگی سے کہ آپ کو احساس بھی نہیں ہوگا کہ اس میں بیوی کون ہے اور سوتن کون؟

لہٰذا دوسری بیوی لانے سے پرہیز کیا۔ وقت کی بھی بچت بیوی کی بھی بچت!

لیکن بیوی کے اکلوتے پن سے ایک ٹریجڈی پیدا ہوگئی کہ جب بھی شام کو گھر لوٹتا، وہی کل والی بیوی موجود۔ گھر کی کوئی چیز سانس لیتی تو لگتا بیوی سانس لے رہی ہے۔ وہ پورے گھر پر یوں چھاگئی جیسے میرے گھر میں میرا وجود ہی نہیں ہے۔ جب وہ مجھے خاوند کہتی ہے تو مجھے محسوس ہوتا جیسے میں خاوند نہیں صرف تخلص ہوں اس شاعر کا جو شاعر تو کہلانا چاہتا ہے مگر شعر نہیں کہہ پاتا۔

میرا کئی بار جی چاہتا کاش! میری بیوی بال بچوں سمیت، فقط ایک دن کے لیے کہیں چلی جائے تو میں پورے گھر پر اپنی انفرادیت ٹھونس سکوں چاہے ایک دن کے لیے مجھے تنہائی کی بادشاہت مل جائے۔ آخر بچہ سقہ بھی تو ایک دن کا بادشاہ بنا تھا۔ کتنا خوش ہوا تھا وہ! کوئی تاریخ بچہ سقہ کا ذکر کیے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی۔

اچانک ایک دن بیوی مجھ سے مخاطب ہوئی "سنو شہر میں ایک عظیم سنت سوامی گیشور جی مہاراج . . . . آئے ہوئے ہیں ۔

میں جانتا تھا، یہ سوامی عظیم فراڈ تھا مگر احتیاطاً اپنے آپ کو فراڈ کے بجائے سنت کہتا تھا۔ میں نے بیوی سے کہا "ہاں، آیا ہوا ہے۔ مگر فقرہ ابھی ادھورا ہے۔ اسے مکمل کر دو۔"

وہ بولی "اس لیے کل صبح سے دن بھر ہماری پوری فیملی سنت جی کے ست سنگ میں گزارے گی ۔"

میں نے پوچھا "کیا میں پوری فیملی میں اپنے آپ کو شامل سمجھوں ؟"

اُس نے جواب دیا "سوری ! چونکہ گھر اکیلا ہو گا اس لیے آپ کو یہاں رہ کر ہی گھر کا محافظ بن کر رہنا ہو گا ۔"

"آپ کا مطلب ہے گھر کا چوکیدار ؟"

سچ مانیے مجھے تیس سال بعد بیوی پر پیار آگیا ۔ تیس سال بعد وہ مجھے اپنی ہی بیوی لگی اور نہ صرف بیوی پر پیار آگیا بلکہ اس سنت پر بھی۔ وہ واقعی عظیم سنت تھا، عظیم فراڈ نہیں تھا۔

صبح جب بیدار ہوا تو پوری فیملی، چوکیدار کے سوائے جا چکی تھی ۔ بیدار ہوتے ہی میں نے زندگی میں پہلی بار سچے دل سے انگڑائی لی ۔ مگر انگڑائی لیتے لیتے تپائی پر رکھے ایک کاغذی پُرزے پر نظر پڑی ۔ پُرزے پر سب سے اوپر لکھا تھا "ہدایت نامہ خاوند"

بے صبری سے بچہ سفر تے وہ پُرزہ اٹھا کر پڑھا، لکھا تھا :۔

۱۔ آپ کی بیڈ ٹی، فرج میں رکھ دی ہے ۔ گرم کر کے پی لینا فرج کھولتے وقت گیلا ہاتھ نہیں لگنا چاہیئے ۔

۲۔ کل رات دہی جمایا ہی نہیں تھا ۔ کیونکہ کل ہی ڈاکٹر بجاج سے پوچھ لیا

تھا کہ دہی آپ کے لیے مضر صحت ہے۔ اس لیے ڈبل روٹی اور دہی کا ناشتہ آج مت کیجئے گا۔ انڈے کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ اگرچہ میرے خیال میں انڈا بھی آپ کے لیے کم مضر صحت نہیں ہے۔ لیکن زیادہ سے کم مضر بہتر ہوتا ہے۔

۳۔ آج کا لنچ ملتوی کر دیجئے۔ ہفتے میں ایک لنچ کے فاقے کی عادت ڈالیئے میں سنت سمالگم کی عادت ڈال رہی ہوں تو کیا آپ فاقے کی عادت نہیں ڈال سکتے؟ اور پھر بیوی کے لیے تو لوگ تخت و تاج چھوڑ دیتے ہیں آپ تو صرف لنچ چھوڑ رہے ہیں۔

۴۔ شمی دھوبن کپڑے پریس کر کے لائے گی، آپ صرف کپڑوں کی طرف دیکھیئے گا، شمی کی طرف نہیں۔ کیونکہ سنا ہے، شمی کی سرمگیں نگاہوں نے اپنا ہی نہیں کئی دوسروں کے گھر بھی برباد کئے ہیں اور ہاں، وہ پریس کرنے کے عوض اجرت مانگے گی، اسے ایک پیسہ مت دیجئے۔ میں خود اس سے حساب کر لوں گی کیونکہ اس نے آپ کی قمیض کے دو بٹن توڑ ڈالے تھے۔ بٹنوں کی قیمت کاٹنی پڑے گی جو میں خود کاٹوں گی، کاٹنا آپ کا بزنس نہیں۔

۵۔ اگر ٹرانزسسٹر پر یہ گانا بجنا شروع ہو جائے "ہم تم اک کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے" تو ٹرانزسسٹر فوراً بند کر دیجئے گا کیونکہ گانا بجتے ہی ایک چڑا اور چڑیا ٹرانزسسٹر پر آکر بیٹھ جاتے ہیں اور ٹرانزسسٹر پر اپنی بیٹیں چھوڑ جاتے ہیں۔

۶۔ چونکہ آج آپ کی دفتر سے چھٹی ہے، اسلیئے خطرہ ہے کہ آپ کے مفت خور دوست آدھمکیں گے، چائے، پھل، بسکٹ وغیرہ سے عیش کریں گے سگریٹیں پھونکیں گے، سگریٹ کی راکھ سے قالین اور صوفہ سیٹ پلید کر جائیں گے۔ تاش کھیلیں گے۔ ممکن ہے آپ کو جوئے پر بھی مجبور کر دیں اور آپ اپنی مجبوری کو تقاضائے الٰہی سمجھ کر قبول

کرلیں ۔ لیکن یاد رکھیے، یہ گھر ہے نہ کہ لنگرخانہ اور کلب ۔ لہٰذا ایسی کوئی نازیبا حرکت مت کیجیے گا ۔

احتیاطاً میں نے پڑوس کے ایک ملازم کا منھ میٹھا کرنے کے لیے کہہ دیا ہے کہ وہ آج میرے گھر کی ہر واردات کی رپورٹ مجھے شام کو دے دے وہ جھوٹ نہیں بولتا ۔ آج کل کے زمانے میں بھی جو جھوٹ نہ بولے، میں اسے دیوتا سمجھتی ہوں ۔ میں اس ملازم کا نام نہیں بتا رہی ۔ ورنہ وہ مجھے یہ بھی بتا دے گا کہ صاحب نے مجھے آپ سے زیادہ منہ میٹھا کرنے کی پیشکش کی تھی ۔

۷ ۔ آج ایک جیوتشی آئے گا، وہ ایک ٹھگ ہے، آپ سے دس روپے لے کر آپ کے ہاتھ کی لکیریں دیکھے گا اور کہے گا کہ آپ ستر برس تک جئیں گے ۔ دس روپے مزید دیں گے تو وہ ستر برس بڑھا کر اسّی برس بڑھا دے گا ۔ لہٰذا اسے پانی کا ٹھنڈا گلاس پلا کر ٹال دیجیے کہ میری بیوی گھر پر موجود نہیں ہے ۔ اس کی عدم موجودگی میں میں اپنی عمر نہیں بڑھا سکتا ۔ لہٰذا کل تشریف لائیے ۔

اطلاعاً عرض ہے کہ ہدایت نامہ خاوند کسی پُراسرار ناول کی طرح کافی طویل تھا اس لیے میں نے درمیان میں ہی چھوڑ دیا کیونکہ سر میں درد ہونے لگا تھا چونکہ بیوی موجود نہیں تھی جو میرا سر دباتی اس لیے اناسین کی سر درد کی گولی ڈھونڈ کر کھالی ۔ ورنہ بیوی نے تو مجھے اناسین سے بھی محروم کر رکھا تھا اناسین کو بیوی سمجھنے کا لطف زندگی میں پہلی بار آیا ۔

اناسین کے بیویانہ استعمال کے بعد میں نے پورے گھر پر نگاہ ڈالی، وہ نگاہ جس میں آزادیٔ کامل کا سرور تھا ۔ وہ سرور جو عمر قیدی کو جیل سے رہا ہونے کے بعد ملتا ہے ۔ ہاں آج میں واقعی اس گھر کا مختارِ کل ہوں، جو چاہوں گا کروں گا بلکہ نہ چاہوں گا نہ کروں گا اور مکرر بلکہ وہی کروں گا

جو نہیں چاہوں گا۔

چنانچہ آزادی کے جوشِ مسرت میں، بچے کی گیند اٹھالی جو قالین پر پڑی تھی اور اسے طفلانہ یلغار کے طور پر سامنے کی دیوار پر زور سے دے مارا۔ دیوار پر ٹیگور کی فریم شدہ تصویر لٹکی ہوئی تھی۔ گیند دیوار کے بجائے تصویر پر جا لگی، جس سے تصویر کا شیشہ کرچی کرچی ہو کر قالین پر بکھر گیا اور پھر یک نہ شد دو شد کہ گیند جو نیچے لوٹی تو تپائی پر رکھی ایش ٹرے نے اپنی پوری سگریٹوں کی راکھ سے قالین کو نورعلی نور کر دیا۔

پڑوسی کے جاسوس ملازم کا نام مجھے معلوم نہیں تھا، اس لیے میں نے اسے پکارا "اے بے نام رپورٹر!! آکر دیکھ لے۔ کیا تو اسے میری نازیبا حرکت کہے گا؟"

وہ بولا "نہیں صاحب!"

"شاباش! بھلا تو ہی بتا۔ قالین پر گیند کیوں پڑی تھی۔ کیا فیکٹریاں اسی لیے قالین بناتی ہیں کہ ان پر گیند کھیلی جائے؟"

"نہیں صاحب!"

"اور میں نے کئی بار اپنی بیوی سے کہا کہ کوئی ایسی ایش ٹرے لاؤ، جو قالین پر گرے تو راکھ کا ایک ذرہ بھی قالین پر نہ گرے۔ بولو کہا تھا کہ نہیں؟"

"کہا تھا صاحب!"

"اور اب یہ شیشے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اور ایش ٹرے کی راکھ کون اٹھائے گا —— کیا میں؟"

"نہیں صاحب! میں"

"تو پھر اٹھاؤ"

"ایک منٹ میں اٹھاتا ہوں صاحب!"

اور ایک منٹ انتظار کیا ۔مگر ملازم نے کوڑا نہیں اٹھایا بلکہ غائب ہو گیا ۔چنانچہ چھوٹی کلاس کے ملازموں پر میرا اعتماد اٹھ گیا ۔ اور پھر ایک منٹ بعد کیا دیکھا کہ گھر کے بادشاہ نے سراسیمگی میں آج کا تازہ اخبار اٹھایا ۔ اخبار پڑھا بھی نہیں تھا اور یوں بھی اخباروں میں پڑھنے کے لائق ہوتا بھی کیا ہے ۔سوائے دو چار نئی شادی شدہ دُلہنوں کے مٹی کے تیل سے جلنے کی خبروں کے —— ایسی خبریں پڑھنے سے تو بہتر ہے کہ اخبار میں ایش ٹرے کی راکھ بھر لی جائے —— چنانچہ بادشاہ نے اخبار میں راکھ اور شیشے کے ٹکڑے اکٹھے کئے مگر قالین پر راکھ کے دھبے صاف چغلی کھا رہے تھے ۔

" دھبوں کو برش سے صاف کر دینا چاہیئے ۔"

مگر برش کہاں ہو گا ؟ عام طور پر دیکھا تھا بیوی ایک تپائی کے نیچے برش رکھ دیتی تھی ، چنانچہ فوراً تپائی کے نیچے ہاتھ ڈالا مگر وہاں برش موجود نہیں تھا بلکہ ایک ٹیلیفون ڈائرکٹری پڑی تھی ۔ بڑا طیش آیا ۔اس گھر میں کوئی چیز ٹھکانے پر نہیں ملتی ۔ قالین پر گیند ، برش کی جگہ ڈائرکٹری ! پورے گھر کا ڈھانچہ بگڑ چکا ہے ۔گھر کی از سرِ نو تنظیم کرنا ہو گی بہرکیف اپنا سفید رومال رگڑ رگڑ کر راکھ کے دھبے صاف کئے ۔ٹیگور کی بے شیشہ تصویر اتار لی ۔ اس سالی کو آج مسٹر تلی رام بھاٹیہ فریم میکر سے فوراً نیا شیشہ فٹ کرانا ہو گا ۔ ورنہ اگر پڑوسی ملازم نے جھانک لیا تو . . .

. . . . . ؟ چنانچہ ڈائرکٹری اٹھا کر بھاٹیہ کا ٹیلی فون نمبر دیکھا ۔شکر ہے ، برش کی جگہ ڈائرکٹری پڑی تھی ورنہ یہ بھی نہ جانے ملتی یا نہیں ۔ ٹیلی فون پر نمبر گھمایا ، حسب دستور رانگ نمبر یعنی بسم اللہ ہوٹل کا نمبر مل گیا ۔ دوسری بار نمبر گھمایا تو پھر رانگ نمبر ۔چوتھی بار گھمایا تو اپنے ہی ٹیلی فون کی ڈائل ٹون غائب ! —— ملازم کی طرح ٹیلیفون پر سے بھی اعتماد اُٹھ گیا ۔

جھنجھلا کر باتھ روم چلا گیا تاکہ میلے ہاتھ اور میلے رومال کو صابن سے دھو ڈالوں
حیرت ہوئی کہ صابن اپنی مقررہ جگہ پر واقعی مل گیا۔ کئی مرتبہ صابن مقررہ جگہ
پر نہیں ملتا تو بیوی عام طور پر شکایت کرتے دیکھی گئی تھی کہ پڑوسن اپنے
چوہوں کو ہمارے باتھ روم کی طرف بھیج دیتی ہے، جو ہمارا صابن اٹھا کر پڑوسن کے
باتھ روم تک پہنچا دیتے ہیں مگر اس وقت صابن کی ٹکیہ موجود تھی۔ شاید پڑوسن
کے چوہے آج اپنے میں قدرے لیٹ ہو گئے تھے لیکن یہ بات عجیب تھی کہ صابن
کے پاس ایک لمبی چوڑی قینچی پڑی تھی۔ حالانکہ باتھ روم کا قینچی سے تعلق ایسے
تھا جیسے کسی شریف گھرانے کا بیٹا ڈاکو بن جائے۔

چنانچہ قینچی اٹھا کر اپنے قبضے میں کر لی۔ بیوی آگئی تو اُسے ان کے بیٹے کی
ڈاکہ زنی پر شرمندہ کروں گا۔

بیڈ ٹی ـــــ ؟ اوں ہوں۔ فرج والی چائے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔
اپنی چائے خود بنا کر پیوں گا۔ کم از کم آج تو اپنی انفرادیت کا مظاہرہ کرنا
ہی پڑے گا۔ چنانچہ کچن میں گھس گیا۔ چائے بنانے کی پوری تکنیک معلوم
تھی۔ کئی برس پہلے کچن گائیڈ کا مطالعہ کیا تھا۔ اس لیے نہ صرف چائے بلکہ
لنچ تک تیار کر سکتا تھا۔ کچن میں گھستے ہی ایک گھٹن کا احساس ہوا تو کھڑکی کی چٹخنی
کھولنا چاہی۔ چٹخنی سخت تھی چنانچہ زور بازو آزمایا لیکن جو بادشاہ بیس پچیس
برس تک گدی سے دست بردار رہا ہو، اس میں زور بازو کہاں رہتا ہے چنانچہ
سامنے ایک ہتھوڑی نظر آئی۔ چٹخنی پر ہتھوڑی کی آزمائش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چٹخنی بھی
ٹوٹ گئی اور ہتھوڑی بھی ـــــ لیکن آزادی کی تعمیر میں کچھ تخریب بھی تو ہو
ہی جاتی ہے۔ لہٰذا اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ ہوا کے دو
چار صاف ستھرے جھونکے اندر آگئے تو طبیعت باغ باغ ہو گئی۔

اور اب چائے کی کیتلی ؟ ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کیتلی کی صحیح نشست گاہ معلوم
نہیں تھی اس لیے کیتلی نہیں ملی۔ چنانچہ اسٹیل کا ایک برتن اٹھایا، اُس میں

پانی بھرا اور گیس کے چولھے پر دھر دیا۔ مگر پھر خیال آیا کہ ایک ٹکنیکل غلطی ہو گئی ہے ماچس سے چولھے کی گیس پہلے جلانی چاہیئے تھی۔ اب ماچس کی تلاش شروع ہوئی۔ ایک ماچس کھولی، ایک بھی تیلی سے محروم، دوسری ماچس فقط ایک تیلی۔ اسے جلایا تو تھوڑی سی جلی اور گیس تک پہنچنے سے پہلے بجھ گئی۔ ماچس فیکٹریوں کے خلاف اخبار میں ایک آرٹیکل لکھنا پڑے گا کہ یہ پبلک سے دھوکا کرتے ہیں۔ (ویسے فیکٹری دھوکا نہ کرے تو کیسے جیئے؟) مسالہ کم لگاتے ہیں۔ تیلیوں کی تعداد نہ صرف کم بھرتے ہیں بلکہ آدھی تیلیاں تو پر شکستہ بھی رکھ دیتے ہیں۔

مگر یہ اپنی شکست تھی۔ جو گھر کے آزاد مالک کے شایاں نہیں تھی۔ چنانچہ فوراً اپنی خواب گاہ کی طرف بھاگا اور اپنا سگریٹ اور لائٹر اٹھا لایا۔ واپس کچن میں پہنچا، تو کیا دیکھا، ایک بلی کڑاہی میں رکھا ہوا دودھ نوش فرما رہی ہے۔

میں نے پوچھا "کتنا دودھ نوش فرمایا؟"

بلی بولی "آدھ کلو"

میں نے کہا "میری بیوی کی عدم موجودگی کو غنیمت سمجھ کر یہ ناؤ نوش فرما رہی ہو۔"

وہ مجھ سے ڈری نہیں، بھاگ نہیں گئی۔ تھوڑا سا دور جا کر بیٹھ گئی اور بولی "میاؤں"، مجھے یوں لگا جیسے کہہ رہی ہو آپ کا شکریہ۔ ورنہ مالکن کے ہوتے کبھی چمچہ بھر پینے کو دودھ نہیں ملا۔ یہ شکریہ میری مردانہ برتری کا اعتراف تھا۔ پوچھا "کدھر سے آئی ہو، کیا اس کھلی کھڑکی سے؟"

وہ بولی "مکرر میاؤں"

میں نے کہا "فوراً اسی کھڑکی سے بھاگ جاؤ۔ شرافت نفس سے ناجائز فائدہ اٹھانا شرفاء کا کام نہیں۔ بہر کیف مالکن کے لوٹنے پر دودھ نوشی کا ذکر نہ کرنا ورنہ ہم دونوں کو سولی کا شکار ہونا پڑے گا۔"

مگر میری وارننگ پر بھی وہ نہیں بھاگی۔ وہ شاید میری وارننگ کو

بھی پلاسٹک کا کھلونا سمجھتی تھی جو ہاتھ لگانے ہی یوں ٹوٹ جاتا ہے جیسے اسے بنایا ہی اسی لیے گیا ہو۔ کئی بلیاں واقعی بیویوں سے بھی زیادہ ڈھیٹ ہوتی ہیں۔ مرد کی طاقت کو تسلیم ہی نہیں کرتیں اپنی سی کیے جاتی ہیں۔

چنانچہ مشتعل ہو کر میں نے زور سے لانڈا اس پر فرمایا تو وہ جیسے شبیم شبم بڑبڑاتی ہوئی کھڑکی سے واپس کود گئی۔

اپنی اس فتح پر میرا سر غرور بلند ہو گیا۔ اب اس عالمِ غرور میں چائے پینے کا لطف دُگنا ہو جائے گا ــــ مگر چائے کا پیکٹ اور پھر چینی کا ڈبہ؟ وہ کہاں رکھا ہو گا؟

اس یقین کے ساتھ کہ دونوں چیزیں اسی کچن کے کسی خانے میں ہوں گی، میں نے کچن کے پچیس خانے کھولے اور بند کیے مگر دونوں چیزیں غائب!

ماتھے پر پسینہ آگیا تو سوچا، آگ جلا کر پہلے پانی تو اُبال لیا جائے، اتنے میں چائے اور چینی قریب کی مارکیٹ سے لے آؤں گا۔ چنانچہ لائٹر سے آگ جلا دی اور اوپر پانی کا برتن رکھ کر سکھ کا سانس لیا اور فوراً مارکیٹ کی طرف بھاگا۔ راستے میں خیال آیا، اوہ! کھڑکی بند کر لینی چاہیے تھی۔ اگر بلی پھر کھڑکی سے میاؤں کرتی ہوئی یقیناً آدھ کلو دودھ کا نروان کرنے آگئی تو......

چنانچہ واپس آگیا تو دیکھا، پانی تیزی سے اُبل رہا ہے اور یہی وہ نازک مقام ہے، جب کہ چائے کی پتی اس میں ڈال دینی چاہیے۔ ورنہ......؟

ورنہ کیا، چائے کی پتی تھی ہی نہیں، لہٰذا اُبلتا ہوا پانی بڑی احتیاط سے نیچے اُتار کر رکھ دیا۔ یہ خیال بعد میں آیا کہ گیس کی آگ پہلے بند کر دیتا تو اُبلتے پانی کی ہنڈیا اُتارنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ خواہ مخواہ اپنی دائیں چھنگلیا جل گئی۔

مگر جونہی ہنڈیا اُتاری، آدھے گز پر دیکھا چینی کا نیلا ڈبہ رکھا ہے۔ ہت تیرے کی! تو پہلے نظر کیوں نہیں آیا؟ او مہربان من! مجھے پہلے تم نہیں

چائے کا پیکٹ چاہیئے ۔ بتاؤ وہ کہاں رکھا ہے ؟"

پیچھے بیٹھی چڑیا نے کہا "چوں چوں چوں" میں نے کہا "چوں چوں نہیں چائے، چائے، چائے ۔"

میں نے عقب میں غضب ناک نگاہوں سے چڑیا کی طرف دیکھا ۔ وہ ایک کاغذ کے پیکٹ پر بیٹھی راگ بہاری الاپ رہی تھی ۔ پیکٹ پر جلی حروف میں لکھا تھا "لپٹن چائے ۔"

چڑیا کو جھٹکے سے اڑا کر کہا "تھینک یو میڈم ۔ اگلے جنم میں میں تمہارا جیون ساتھی بنوں گا کہ تم نے آڑے وقت میں مجھے چائے کا پیکٹ مہیا کر دیا ۔"

چڑیا چوں چوں کرتے اڑ گئی جیسے کہہ رہی ہو تم مردوں کے وعدے کا کیا اعتبار ؟ ایک چڑے نے بھی ایک مہینہ پہلے مجھ سے ایسا ہی وعدہ کیا تھا اور اس کے بعد آج تک نظر نہیں آیا ۔ نہ جانے کہاں "کھے" کھاتا پھر رہا ہے ؟

بہر کیف دونوں مطلوبہ اشیاء کے دستیاب ہونے پر اپنی مالکانہ طاقت کی نشاط سے سرشار ہو گیا ۔ ابلتے پانی کی ہنڈیا پھر چولہے پر رکھی ۔ جب وہ تیزی سے ابلنے لگا تو چائے کا پیکٹ کھولا مگر یہ کیا ! اس میں چائے کے بجائے گڑ نکلا ۔ غصہ بیوی پر بھی ، پیکٹ پر بھی کہ دیتے ہیں دھوکہ یہ بازیگر کھلا ۔ لیکن پھر یہ سوچکر اپنے آپ کو پرچا لیا کہ گڑ کی چائے ، چینی کی چائے سے زیادہ مقوی اور لذیذ ہوتی ہے ، آج وہی پی لیں گے ۔ ــــ مگر چائے ؟ مسئلہ تو پھر وہیں کھڑا ہے ۔ چائے کی پتی تو بیڈ ٹی کی عمارت کا بنیادی پتھر ہے ۔

ہائے ! اری میری اکلوتی بیوی ! تو کہاں ہے ؟

اور کچن کے دروازے پر سے آواز آئی "میں یہاں ہوں ۔"

تیزی سے پسینے کے دو چار قطرے میرے ماتھے سے ٹپکے اور ہنڈیا

کے ابلتے پانی میں جا گرے، دروازے پر سچ مچ میری اکلوتی بیوی کھڑی تھی۔ اور پوچھ رہی تھی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کر دیا۔ "مگر تم سنت جی کے سماگم سے اتنی جلدی کیوں لوٹ آئیں؟"

وہ بولی۔ "سماگم ایک ہفتہ کے لیے ملتوی ہو گیا ہے۔ سنت جی ایک ہفتے کے مون برت کے بعد سماگم فرمائیں گے۔ لیکن میں پوچھتی ہوں یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے کہا، "چائے کی پتی نہیں مل رہی ہے۔"

اور میں جس نیلے ڈبے کو چینی کا ڈبہ سمجھ رہا تھا بیوی نے اس ڈبہ کا ڈھکنا کھول کر کہا، "اس میں رکھی ہے چائے۔ مگر میں چائے بنا کر رکھ گئی تھی؟"

میں نے کہا "سوری میڈم" فرج کا دروازہ آپ غلطی سے کھلا چھوڑ گئی تھیں، لہٰذا وہ چائے بلی پی گئی۔"

کرنل محمد خان

نہ خدا ہی ملا......

(شاعر، جو افسر بھی ہے۔ اپنے دفتر کی میز پر بیٹھے کچھ سوچ رہا ہے۔ اس کا پی اے ملحقہ کمرے میں فون سُن رہا ہے۔)

پی۔ اے: (فون پر اپنے صاحب کو) "سر، آپ کے لئے ٹیلی فون ہے۔"

شاعر: "کس کا ہے؟"

پی۔ اے: "آرزو شاہ پوری کا ہے۔"

شاعر: "آرزو؟ یہ مرد ہے یا عورت؟"

پی۔ اے: "مرد ہے حضور۔ آپ سے اصلاح لینا چاہتا ہے۔"

شاعر: "ارے میاں کہہ دو صاحب دفتر میں نہیں یا کوئی اور بہانہ بنا دو۔ میں ایک اہم فائل دیکھ رہا ہوں۔"

پی۔ اے: "بہت اچھا حضور۔" (پی۔ اے آرزو شاہ پوری کو با آواز بلند ٹرخاتا ہے۔ شاعر پی۔ اے کے ٹرخانے کے انداز سے محظوظ اور مطمئن ہوتا ہے۔)

(شاعر مصروف ضرور ہے مگر فائل میں نہیں، شاعری میں! قلم ہاتھ میں لینے کی بجائے دانتوں میں دبائے آنکھیں بند کئے کچھ سوچ رہا ہے۔ ادھر پی۔ اے کے کمرے سے ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے اور ساتھ ہی کسی کو ٹرخانے کے لیے پی۔ اے کے کلمات گونجتے ہیں۔ شاعر کو تجسس پیدا ہوتا ہے کہ اب کس نے فون کیا ہے۔ پی۔ اے سے پوچھتا ہے۔)

شاعر: "کس کا فون تھا؟"

پی اے: "بیگم صاحبہ تھیں۔"

شاعر: "شاباش ۔کیا کہا تھا۔"

پی۔اے: "میں نے کہا تھا صاحب میٹنگ میں گئے ہوئے ہیں۔"

شاعر: "بالکل ٹھیک ۔ان سے مصروفیت کا بہانہ بھی نہ کرنا۔"

پی۔اے: "میں جانتا ہوں صاحب۔مصروفیت کا بہانہ سن کر شاید وہ آپ سے زیادہ مجھے صلواتیں سنائیں۔"

شاعر: "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، بہت باتیں نہیں کرتے۔"

(شاعر بدستور سوچ رہا ہے اور پی۔اے کے ٹیلی فون کی پھر گھنٹی بجتی ہے۔پی اے حسب معمول فون کرنے والے کو ٹال دیتا ہے ،شاعر کسی قدر لاپروائی سے پوچھتا ہے)

شاعر: "اس دفعہ کون تھا؟"

پی۔اے: "کوئی یاسمین تھی۔"

شاعر: (یک لخت چونکتے ہوئے) "یاسمین تھی؟"

پی۔اے: "جناب"

شاعر: "تو نالائق بتایا کیوں نہیں؟"

پی اے: "حضور آپ کی ہدایات کی رُو سے آپ تو دفتر میں ہی نہیں۔"

شاعر: "دیکھو میاں پی۔اے۔ادھر آؤ اور غور سے سنو۔بے شک ہم مصروف ہیں بلکہ یہاں موجود ہی نہیں لیکن زندگی میں ہر قاعدے کی مستثنیات بھی ہوتی ہیں، سمجھے؟"

پی۔اے: "میں معافی چاہتا ہوں۔اگر زحمت نہ سمجھیں تو مجھے مستثنیات کے نام لکھ دیں۔"

شاعر: "نام لکھوانے کی ضرورت نہیں۔آئندہ ٹیلی فون آئے تو اس کے منہ پر

ہاتھ رکھ کر مجھ سے پوچھ لیا کرو۔"

پی اے: "بہت اچھا حضور"

(ایک وقفے کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے۔ شاعر پوچھتا ہے)

شاعر: "اب کے کون ہے؟"

پی۔اے: "شمشیر حیدرآبادی ہے۔"

شاعر: "ٹرخادو۔ ٹرخادو۔"

(پی۔اے شمشیر حیدرآبادی کو ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ پھر ایک مزید وقفے کے بعد گھنٹی بجتی ہے۔ پی۔اے ٹیلی فون کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے شاعر کو بتاتا ہے)

پی۔اے: "سر، کوئی خاتون ہے مگر نام نہیں بتاتی۔"

شاعر: "بے وقوف، خواتین سے نام نہیں پوچھا کرتے۔ لاؤ، ٹیلی فون میری طرف کر دو۔"

پی۔اے: "یہ لیجئے، بات کریں۔"

شاعر: "ہیلو"

زنانہ آواز: "ہیلو"

شاعر: "کون صاحبہ ہیں؟"

زنانہ آواز: "نہیں پہچانا مجھے؟ میں ثمینہ ہوں۔"

شاعر: "اوہیلو ثمینہ۔ کتنی بڑی عمر ہے تمہاری! میں تمہارے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔"

ثمینہ: "کیا سوچ رہے تھے میرے متعلق؟"

شاعر: "یہی کہ کتنی خوبصورت، کتنی پیاری، کتنی . . . ایں . . . ایں، میرا مطلب ہے کتنی اچھی ہو تم۔"

ثمینہ: "بس صرف اچھی ہوں؟ اور کچھ نہیں؟"

شاعر: "بھئی کیوں قصیدہ کہلواتی ہو۔ ویسے اس وقت ایک غزل ہی لکھ رہا ہوں تم پر!"

ثمینہ: "مجھ پر؟ غزل؟ ذرا مطلع تو سناؤ۔"

شاعر: "م۔م مطلع تو ابھی مکمل نہیں ہوا۔ اگلا شعر سُن لو۔"

ثمینہ: (شوق سے) "سناؤ۔"

شاعر: شام آئی تو شفق کی صورت
تیرے عارض ترے گیسو چمکے

ثمینہ: "یہ شعر تو میں نے پہلے بھی سنا ہے۔"

شاعر: "کس سے؟"

ثمینہ: "یاسمین سے۔"

شاعر: "یاسمین سے۔"

ثمینہ: "ہاں ہاں۔ وہ کہتی تھی ایک خوشامدی شاعر نے مجھ پر لکھا ہے۔"

شاعر: "کوئی اور شعر ہوگا اور شاعر بھی کوئی اور ہوگا۔ میں یاسمین جیسی لڑکی پر اپنا شعر ضائع نہیں کر سکتا۔"

ثمینہ: "آپ جانتے ہیں یاسمین کو؟"

شاعر: "جانتا تو نہیں، دیکھی ضرور ہے۔ اسے شاعرہ ہونے کا مغالطہ ہے۔ ایک روز اصلاح کے لئے آئی تھی۔"

ثمینہ: "پھر دی اصلاح؟"

شاعر: "توبہ کرو۔ اسے تو وزن کا ہی شعور نہیں۔ پھر اس کی شکل بھی وزن سے باہر ہے۔"

ثمینہ: "اتنی بدصورت تو نہیں وہ۔"

شاعر: "مگر وہ ثمینہ بھی تو نہیں۔ معلوم ہے تم کتنی حسین ہو؟"

ثمینہ: "چھوڑیئے بھی۔ اچھا دیکھیں۔ اگر بہت مصروف نہ ہوں تو میں

آپ کے دفتر آجاؤں؟"

شاعر: ضرور۔ وہ کیا کہا ہے غالب نے۔ ہزار بار برو۔ صد ہزار بار بیا!"

(ثمینہ داخل ہوتی ہے۔ شاعر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ایک مسرت کے عالم میں کہتا بلکہ گاتا ہے۔)

شاعر: "وہ آئیں گھر میں ہمارے . . . . آیئے آیئے، کہاں بیٹھو گے؟"

ثمینہ: "کرسی پہ بیٹھوں گی اور کہاں بٹھائیں گے؟"

شاعر: "ہم تو چاہتے ہیں تمہیں سر آنکھوں پہ بٹھائیں۔"

(ثمینہ اس فوری بے تکلفی پر ابرو اٹھاتی ہے۔ شاعر پانسہ بدلتا ہے)

شاعر: "بھئی محاورہ کہہ رہے تھے۔" (مسکرا دیتا ہے)

ثمینہ: "میرا خیال ہے محاورے کی نسبت کرسی زیادہ آرام دہ رہے گی۔"

شاعر: "یہ تمہارا خیال ہے مگر جیسی تمہاری مرضی بیٹھو۔"

ثمینہ: "ہاں تو آپ کہہ رہے تھے آپ نے ایک غزل لکھی ہے۔"

شاعر: "ایک غزل نہیں، ایک خاص غزل! صرف تمہارے لئے۔"

ثمینہ: "زہے نصیب۔ ارشاد۔"

شاعر: "مطلع عرض کیا ہے،

جب تری یاد کے جگنو چمکے
کتنے مہتاب لبِ جُو چمکے"

ثمینہ: "یہ سب میری یاد کا نتیجہ ہے؟"

شاعر: "جی ہاں۔ آپ کی یاد کا۔"

ثمینہ: "مجھے آپ مت کہیں۔ مَیں آپ سے پندرہ برس چھوٹی ہوں۔"

شاعر: "گویا میں بوڑھا ہوں؟"

ثمینہ: "نہیں، میرا یہ مطلب نہ تھا۔ ویسے آپ کے سر پر چند اور بال ہوتے

تو آپ بالکل اکیس برس کے لگتے۔"

شاعر: "(سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) "ہاں، یہ ذرا معمر لگتا ہے۔"

ثمینہ: "چھوڑیئے ان باتوں کو خواہ مخواہ رومان توڑ دیتے ہیں۔"

شاعر: "واہ واہ کیا دل کی بات کہی ہے! بے شک تمہاری موجودگی سراسر رومان ہے۔"

ثمینہ: "اب اگلا شعر تو سنائیں۔"

شاعر: "ضرور، ضرور۔ عرض کیا ہے!

تیری آواز سے خوشبو پھیلی

تیری آہٹ سے گلستاں چمکے"

ثمینہ: "بہت خوب مگر اور تو کسی نے آج تک نہیں کہا کہ میری آواز اتنی خوشبو دار ہے۔"

شاعر: "بھئی اور لوگ بدذوق ہیں حسینوں کی خوشبو سونگھنے کے لئے شاعر کی ناک چاہیئے اور یہ خاکسار پیدائشی شاعر ہے۔"

ثمینہ: "مانتے ہیں، مانتے ہیں، آگے کیا لکھا ہے۔"

شاعر: ہم نے اُس وقت دھنک کو دیکھا

جب فضا میں ترے بازو چمکے

(ثمینہ جھٹ اپنے عریاں بازو کو اٹھا کر دیکھتی ہے اور مطمئن ہو کر کہتی ہے۔)

ثمینہ: "مکرّر، مکرّر"

(شاعر خوش ہو کر ثمینہ کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر اس کا دھنک رنگ بازو اور بلند کرتا ہے اور اس طرح رومان کو عروج پر پہنچا کر شعر دہرانا ہی چاہتا ہے کہ دروازے سے یاسمین داخل ہوتی ہے۔ یہ غیر متوقع دخول رومان کا ستیاناس تو کر ہی دیتا ہے، شاعر کی زبان کو بھی لڑکھڑا دیتا ہے۔ شاعر کے منہ سے بمشکل نکلتا ہے۔)

شاعر : "یہ ، یہ ، یاسمین تم ؟"

یاسمین : "جی ہاں میں ، مگر شاعر صاحب اپنی کپکپی پہ قابو پایئے اور محترمہ کی فرمائش پوری کیجئے ۔ شعر مکرر عطا فرمایئے ۔"

شاعر : "ک ۔ک ۔ک کون سا ش ش شعر ؟"

یاسمین : "چلیں آپ کپکپایئے ۔ شعر میں دُہرا دیتی ہوں ۔"

(یاسمین ترنم سے شعر الاپتی ہے)

ہم نے اس وقت دھنک کو دیکھا
جب فضا میں ترے بازو چمکے

(ثمینہ یاسمین کے منہ سے وہی شعر سن کر حیران ہوتی ہے اور شاعر سے پوچھتی ہے ۔)

ثمینہ : "شاعر صاحب ۔ یہ شعر یاسمین تک کیسے پہنچا ؟"

یاسمین : "ثمینہ بی بی ۔ کل انہوں نے میرا بازو اٹھا کر اسی طرح یہ شعر مجھ تک پہنچایا تھا بلکہ پوری غزل پہنچائی تھی ۔ ٹھیک کہتی ہوں نا ، شاعر صاحب ؟"

(شاعر بدستور کپکپی میں مبتلا ہے ۔ اسے سمجھ نہیں آتا کہ کیسے ان دو لڑکیوں کے ساتھ نپٹے ۔ مگر اسی لمحہ ایک تیسری بی بی اندر داخل ہوتی ہے ۔ یہ شاعر کی بیگم ہے ۔ بیگم کو دیکھ کر شاعر کی کپکپی بے تحاشا آٹومیٹک ہو جاتی ہے ۔ ثمینہ اور یاسمین فرنیچر سے ٹکراتے ہوئے باہر نکل جاتی ہیں ۔ بیگم ایک لمحے کے لیئے شوہر کی شکل کا جائزہ لیتی ہے اور غصے سے زیادہ رحم کھا کر کہتی ہے)

بیوی : "تم سے لڑنا فضول ہے مگر ایک بات ۔ اب گھر کا رُخ نہ کرنا ۔ سُن لیا ؟ گھر مت آنا ۔"

(بیوی آخری تین الفاظ پیس پیس کر ادا کرتی ہے اور آرام سے دروازہ بند کر کے باہر چلی جاتی ہے)

شاخسانہ

جناب شاعر اب ایک ریسٹ ہاؤس میں رہتے ہیں۔ جہاں کوئی بیوی ہے نہ محبوبہ۔ فقط ایک بوڑھا چوکیدار ہے۔ چوکیدار کا کہنا ہے کہ جناب شاعر بڑے آزردہ ہیں۔ کچھ لکھتے پڑھتے نہیں۔ بس ایک شعر گنگناتے رہتے ہیں۔ چوکیدار کو پورا شعر تو یاد نہیں مگر کہتا ہے اس کے پہلے چند الفاظ کچھ اس طرح ہیں۔

نہ خدا ہی ملا۔ ۔ ۔ ۔

(نیرنگ خیال)

غزل

فراقؔ گورکھپوری

دَورِ فلک کچھ رُکا رُکا سا
قافلہ کچھ ٹھہرا ٹھہرا سا

تھمی تھمی سی گردشِ دوراں
روزِ قیامت رُکا رُکا سا

دل اُمڈا سا آنکھ بھری سی
آج تو حُسن بھی ہے اپنا سا

بے لنگر ہے پریم کی کشتی
رُوپ بھی ہے چڑھتا دریا سا

عِشق ہو امرت یا ہو۔ ہلاہل
ایک جہاں ہے پیاسا پیاسا

دِل کو تجھ سے دل سے تجھ کو
ایک جھجھک سی اِک کھٹکا سا

آج نہ جانے کیوں ہوتا ہے
دل میں درد ہلکا ہلکا سا

آج یہ کون ہے میرے آگے
کچھ دیکھا کچھ اَن دیکھا سا

عشق میں ایک عذاب سا دل پر
سر پر رحمت کا سایا سا

دیکھ فراقؔ خوشی پھر اپنی
اس میں ملا لے غم تھوڑا سا

(سیپ کراچی)

فیض احمد فیض

خواب بسیرا

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچوں میں کسی حُسن کی جھلکن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
ممکن ہے کوئی وہم تھا ممکن ہے سُنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اِک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آکے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اِک بیر نہ اک مہر نہ اِک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا نہ پرایا کوئی میرا

مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن مرے دل یہ تو فقط ایک گھڑی ہے
ہمت کرو جینے کو ابھی عمر پڑی ہے

(دوران علالت میو ہسپتال لاہور میں لکھی گئی)

ہم کو تو بس ہجومِ مقابر دکھائی دے
دیکھو اگر تمہیں کوئی زائر دکھائی دے

خاموش ہو تو اس پہ گماں ہو کلیم کا
باتیں کرے تو دل کوئی ساحر دکھائی دے

کانوں میں آ رہی ہیں نوائیں ہزار ہا
آنکھوں کو صرف ایک ہی طائر دکھائی دے

چاہیں جو دیکھنا تو دکھائی نہ دے کہیں
ہر وقت ہر جگہ جو بظاہر دکھائی دے

پھرتے ہیں دشت دشت غزالانِ تشنہ کام
شاید کوئی سراب کہیں پھر دکھائی دے

ہم ہیں کہ اِک غبارِ تمنّا سفر میں ہے
رستہ دکھائی دے نہ مسافر دکھائی دے

درپیش اُسے بھی تھا یہی آشوبِ آگہی
آدم مُجھے تو اپنا معاصر دکھائی دے

پیدا کئے ہیں اُس نے کچھ ایسے بھی نیک لوگ
ہر شخص جن کو فاسق و فاجر دکھائی دے

نکلے ہو ٹیکتے ہوئے انجم عصائے نُور
اندھوں کو کیا ورائے مظاہر دکھائی دے

(معاصر لاہور)

محشر بدایونی

رہا بھی ہو کے ہم اِک آس ہی میں رکھے گئے
اسیرِ حلقۂ خفتہ پری میں رکھے گئے

گزرنے والی تھی کیا موجِ سرکشی کوئی
کہ پتّھروں کی طرح ہم گلی میں رکھے گئے

بنے وہ کیسے تماشہ تہِ فلک جو چراغ
بُجھا دیئے گئے اور روشنی میں رکھے گئے

سفر کا شعلۂ مشعل بلند کر کے بھی لوگ
گھروں میں رکھے گئے کس خوشی میں رکھے گئے

رقم جو نام ہوئے فردِ راز داری میں
ہم اہلِ صدق صفِ گمرہی میں رکھے گئے

اُٹھا کے گھر سے، ہمیں اور تھا کہاں رکھنا
ٹھکانا دشت ہی تھا دشت ہی میں رکھے گئے

کچھ اور صورتِ جاں پروری نہیں تو نہ ہو
کئی سوال تو دستِ تہی میں رکھے گئے

یہاں صِلے کی بھی پروا نہ کی کچھ اہلِ خبر
ستائشوں ہی سے گُم شاعری میں رکھے گئے

(سیپ کراچی)

حبیب جالب

ذرّے ہی سہی کوہ سے ٹکرا تو گئے ہم
دل لے کے سرِ عرصۂ غم آ تو گئے ہم

اب نام رہے یا نہ رہے عشق میں اپنا
رُوداد وفا دار پہ دُہرا تو گئے ہم

کہتے تھے جواب کوئی نہیں جاں سے گزرنا
لو جاں سے گزر کر انہیں جھٹلا تو گئے ہم

جاں اپنی گنوا کر کبھی گھر اپنا جلا کر
دِل اُن کا ہر اک طور سے بہلا تو گئے ہم

کچھ اور ہی عالم تھا پسِ چہرۂ یاراں
رہتا جو یونہی راز اُسے پا تو گئے ہم

اب سوچ رہے ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے
پھر اُن سے نہ ملنے کی قسم کھا تو گئے ، ہم

اُٹھیں کہ نہ اُٹھیں یہ رضا اُن کی ہے جالب
لوگوں کو سرِ دار نظر آ تو گئے ، ہم

(اُردو انٹرنیشنل کینیڈا)

احمد مشتاق

یہ کِس ترنگ میں، ہم نے مکان بیچ دیا
درخت کاٹ لیے سائبان بیچ دیا

دری لپیٹ کے رکھ دی، بساط الٹ ڈالی
چراغ توڑ دیئے شمعدان بیچ دیا

خزاں کے ہاتھ خزاں کے نیازمندوں نے
نوائے موسمِ گُل کا نشان بیچ دیا

اُٹھا جو شور تو اہلِ ہوس نے گھبرا کر
زمین لینے پہ دیدی کِسان نے بیچ دیا

یہی ہے بھوک کا عالم تو دیکھنا اِک دِن
کہ ہم نے دھوپ بھرا آسمان بیچ دیا

(محراب لاہور)

ظفر اقبال

ہوائے دل بھی نہ تھی، موسمِ دعا بھی نہ تھا
بدن پہ وقت کچھ ایسا کبھی پڑا بھی نہ تھا

بکھر گیا تھا ذرا سادہ رنگِ راز، تو اب
مجھے ہی فکر تھی ساری، اُسے پتا بھی نہ تھا

جِھجک کے پھول بنا اور مجھے خبر نہ ہوئی
وہ ایک بوسہ جو کچھ اتنا بے صدا بھی نہ تھا

ذرا سی جرأتِ رندانہ چاہیئے تھی وہاں
بلند اب کے بہت خوشۂ خطا بھی نہ تھا

اُسی کے خواب سے روشن ہے شامِ دشتِ ہوس
وہ داغِ عکسِ تماشا کہ جا بجا بھی نہ تھا

ردا روی میں ہی خط اُس نے لکھ دیا، ورنہ
اُداس تجھ سے جُدا ہو کے وہ ذرا بھی نہ تھا

کھُلی تھی آنکھ مری منظرِ نظر سے پرے
کھڑا تھا چوک میں اور کوئی راستہ بھی نہ تھا

وہاں اُچھال کے پھینکا تھا موجِ دل نے مجھے
جہاں سے خلق بھی غائب تھی اور خدا بھی نہ تھا

میں ایک سانس کی سلوٹ پہ مر مٹا تھا ظفرؔ
کہ میرے چاروں طرف ہالۂ ہَوا بھی نہ تھا

(معاصر لاہور)

محسن احسان

ہوائے تند زیاں کار ہے نظر رکھیے
طنابِ خیمہ امید کھینچ کر رکھیے

یہ اور بات کوئی پھل بھی دسترس میں ہو
مگر نگاہ میں اشجارِ باثمر رکھیے

کسی کو بھی نہیں اب اختیارِ سنگ زنی
دکانِ شیشہ گراں دن میں کھول کر رکھیے

زمانہ بے ہنری کو ہنر سمجھتا ہے
یہ ہے کمالِ ہنر، دستِ بے ہنر رکھیے

سمیٹ کر نہ کوئی ریگِ کہکشاں لایا
مہ و نجوم پہ کس واسطے نظر رکھیے

کھلے ہیں ہم پہ بتدریج سب محاسنِ شیخ
دلوں میں بغض و عداوت، نظر میں شر رکھیے

ہوا میں کیجئے نہ تعمیر بام و درِ حسن
ذرا مکان کی بنیاد پر نظر رکھیے

(ادبِ لطیف لاہور)

سلیم شاہد

مَیں کچھ کہوں جو اگر جان کی امان ملے
زمیں بچھونا ملے چادر آسمان ملے

یہ وہم تھا مرے خوابوں میں کون آئے گا
کھُلی جب آنکھ ترے پاؤں کے نشان ملے

بچھڑنے والے انہیں موسموں میں لَوٹتے ہیں
عجب نہیں وہ کسی صُبح مجھ سے آن ملے

وہ دھوپ سی، وہ دریچہ وہ ابر کا ٹکڑا
خدا کرے کہ مری آنکھ کو زبان ملے

ہے آج شام کے ڈھلنے کا انتظار بہت
کڑی ہے دھوپ کہیں سر کو سائبان ملے

(ماہ نو لاہور)

رئیس فروغ

سائے میں سایہ ملا نہیں
دائرہ پورا ہوُا نہیں

دن بھر جگنو بنا رہا
شام ہوئی تو جلا نہیں

آنکھوں کی چنگاریوں سے
اُس کا بازو بچا نہیں

قامت اُس کا بُرا نہ تھا
لیکن مجھ پر سجا نہیں

کالے بادل اُلجھے رہے
ہوا کا جادو چلا نہیں

مَیں بھی ہوں دشمن بنا ہُوا
موسم بھی کچھ بُرا نہیں

جنگل آئے گزر گئے
پاؤں میں کانٹا چُبھا نہیں

صحرا جاتا کہاں کہاں
دریا ساتھی مِلا نہیں

کوئی بھی جس کے پیچھے نہ تھا
وہ دروازہ کُھلا نہیں

گِن لیتا تھا ارب کھرب
ستّر سال جیا نہیں

ہاتھ کا پنکھا ٹھہر گیا
اب سونے میں مزا نہیں

(سیپ کراچی)

ذوالفقار احمد تابش

ہے گرچہ خواب مگر اصلِ خواب میں کیا ہے
یہ اک تماشا سا برپا نقاب میں کیا ہے

ہیں کِس کی چھوٹ سے روشن یہ بام و در سارے
خروشِ آب ہیں بطنِ حباب میں کیا ہے

یہ میرے عیب و ہنر بھی تو مجھ کو ہیں توفیق
تو عذر خواہئ خوب و خراب میں کیا ہے

حدودِ عمر پہ پھیلی یہ کیا مسافت ہے
اس امتحانِ سفر کے نصاب میں کیا ہے

یہ کون ہے جو بلاتا ہے اس وجود کے پار
یہ نطقِ نو ساحریِ حجاب میں کیا ہے

یہ رنگ کیا ہے یہ نرمی کہاں سے آتی ہے
لبوں کی سرخی، گدازِ گلاب میں کیا ہے

طلب یہ کیا ہے جو دل کو اداس رکھتی ہے
حریمِ جاں میں رگِ اضطراب میں کیا ہے

یہ روشنی سی ہے کیسی تمہارے ماتھے پر
نجانے فصلِ گلِ ماہتاب میں کیا ہے

(ادبِ لطیف لاہور)

ایوب خاور

ہوا نے رُت کو تماشہ بنا دیا آخر   چراغ و شیشہ و دل کو بُجھا دیا آخر

فصیلِ کوچۂ پندارِ جاں کی لرزش دیکھ   کسی نے آج اسے بھی گرا دیا آخر

گزر گئے مِرے موسم، بکھر گئے مِرے خواب   نظر کے سامنے صحرا بچھا دیا آخر

بس ایک خواب سا بھیجا تھا اُس نے میرے نام   ہوائے زرد نے وہ بھی گنوا دیا آخر

وہ کچھ نہ تھا مگر اِک خامشی کا قصہ تھا   کہیں کہیں سے اُسے بھی سُنا دیا آخر

اور اب کی بار تو میری اَنا تھی اُس کا ہدف
سو مَیں نے صُلح کا پرچم جلا دیا آخر

(معاصر لاہور)

یُوں اہتمامِ ردِ سحر کر دیا گیا
ہر روشنی کو شہر بدر کر دیا گیا

اپنے گھروں کے سُکھ سے بھی روکش دکھائی دیں
لوگوں کو مبتلائے سفر کر دیا گیا

چہروں سے رنگ ہاتھ سے آئینے چھین کر
بے چہرگی کو رختِ نظر کر دیا گیا

اب جسم و جاں پہ حقِ تصرّف طلب کرے
ظالم کو اس قدر تو نڈر کر دیا گیا

در پے تھے ہر شجر کے تعفّن شعار لوگ
محروم خوشبوؤں سے نگر کر دیا گیا

وہ قحطِ غم پڑا ہے کہ اک ٹیس کے لئے
اہلِ کرم کا دست نگر کر دیا گیا

(اردو انٹرنیشنل کینیڈا)

آئینہ آسا یہ خوابِ نیلمیں رکھوں گا مَیں
اور اس اجلے ستارے پر یقین رکھوں گا مَیں

عُمر بھر خوش آئے گی کیا میری تنہائی مجھے
رابطہ ہر چند لوگوں سے نہیں رکھوں گا مَیں

شہر میں اتنا اندھیرا ہے کہ اک دن بھول کر
طاقچے میں پھر چراغِ اوّلیں رکھوں گا مَیں

آئے گی جب میرے حصّے میں یہ ساری کہکشاں
نام اِک مہرِ منوّر کا زمیں رکھوں گا مَیں

راس آتی ہی نہیں جب پیار کی شدّت مجھے
اِک کمی اپنی محبت میں کہیں رکھوں گا مَیں

ایک سایہ سا گزر جائے گا موجِ نور سے
جب اُجالے میں وہ شاخِ یاسمیں رکھوں گا مَیں

ہاں یہی مٹی وراثت ہے مرے اجداد کی
لَوٹ کر اپنی کمائی بھی یہیں رکھوں گا مَیں

(ادبِ لطیف لاہور)

جمال احسانی

وہ بھی ملنے نئی پوشاک بدل کر آیا
مَیں جو کل پیرہنِ خاک بدل کر آیا

اے زمیں زاد، تری رفعتیں چھونے کے لئے
تجھ تلک مَیں کئی افلاک بدل کر آیا

اُس کو راس آئی ہے یہ بزمِ جہاں، جو بھی یہاں
اپنا پیمانۂ ادراک بدل کر آیا

عشق میں کوئی تکلّف کی ضرورت تو نہیں
پھر وہ کیوں دیدۂ نمناک بدل کر آیا

ہم سے کر بے سر و سامانیٔ ہجرت یہ سوال
اُس سے مت پوچھ جو املاک بدل کر آیا

آنسوؤں سے نہ بدل پایا، رُخِ بادِ جمالؔ
پر مزاجِ خس و خاشاک بدل کر آیا

(سیپ کراچی)

عتیق جیلانی

اندھیرا تھا، دریچہ سامنے تھا — وہ چہرہ تھا، اُجالا سامنے تھا

نئے موسم مُرتّب ہو رہے تھے — نئی دنیا کا نقشہ سامنے تھا

اُسی انجان رستے کی رفاقت — وہی تنہا ستارہ سامنے تھا

حدیثِ ہجر از بر ہو رہی تھی — کتابِ جاں کا صفحہ سامنے تھا

مری اپنی اَنا کا مسئلہ تھا — مرا اپنا حوالہ سامنے تھا

عتیق احمد وہی پیاسی طلب تھی
وہی بے اَنت صحرا سامنے تھا

(معاصر لاہور)

سلطان سکون

بہت مٹھاس جو اپنی زباں میں رکھتا ہے
وہ ایک تیرِ ستم بھی کماں میں رکھتا ہے

ملے بھی وہ تو کبھی ٹوٹ کر نہیں ملتا
خلش ضرور کوئی درمیاں میں رکھتا ہے

یہی تو اُس کا ہُنر ہے کہ اپنی باتوں سے
ہر اک کو حلقۂ حسنِ گماں میں رکھتا ہے

ہوائیں اُس کے لئے آندھیاں اُٹھاتی ہیں
جو پیڑ ایک بھی پتا خزاں میں رکھتا ہے

وہ کس پہ وار کرے، درگزر کرے کس سے
کئی عدو جو صفِ دوستاں میں رکھتا ہے

سکونؔ صبر کا پھل اور کوئی ہو کہ نہ ہو
دُکھوں کی دھوپ میں امن و اماں میں رکھتا ہے

(فنون لاہور)

مضمون

فیض احمد فیض

پاکستانی تہذیب کے اجزائے ترکیبی

ہر قوم کی تہذیب یا کلچر کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اس قوم کے اقدار اور احساسات اور عقائد جن میں وہ یقین رکھتی ہے۔ دوسرے اس کے طریقے اس کے آداب اور اس کے اخلاق ظاہری اور تیسرے اس کے فنون۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر جس معاشرے میں لوگ اپنی زندگی بسر کرتے ہیں وہ معاشرہ جن چیزوں کو عزیز رکھتا ہے یا جن کو مقدس یا حسن سمجھتا ہے اس کے مطابق وہ اپنی زندگی ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر جب اس معاشرے کی صورت اور اس کے حالات بدلتے ہیں، تو یہ اقدار بھی اس کے ساتھ بدل جاتی ہیں اور پھر انہی عقائد اور احساسات کا اظہار مختلف فنون کرتے ہیں۔ لیکن ان فنون سے بھی لوگوں کے جذبات اور احساسات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، ان میں ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ یہ تینوں عوامل ایسے ہیں جو ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور آپس میں منسلک بھی رہتے ہیں۔ جب آپ قومی تہذیب کا ذکر کرتے ہیں، تو پھر آپ کلچر یا تہذیب کے خصائص پر بعض عمومی چیزوں کا اضافہ کرتے ہیں۔ یہ کہ اس قوم کی تاریخ اور جغرافیہ کیا ہے اور اس قوم کی معاشرت کا انداز کیا ہے۔ ایک قوم کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی تہذیب دوسری قوموں کی تہذیب سے جدا ہوتی ہے۔ جس طریقے سے کلچر کے تین پہلو ایک دوسرے سے منسلک ہیں اسی طرح قوم اور کلچر یا قومیت اور تہذیب بھی لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے کہ آپ کسی ایسی

قوم کا تصور نہیں کر سکتے جس کی کوئی تہذیب نہ ہو اور نہ ہی آپ کسی تہذیب کا تصور کر سکتے ہیں جو کسی نہ کسی قوم یا گروہ سے وابستہ نہ ہو۔ اب یہ ساری باتیں ذہن میں رکھیے اور فیصلہ کرنے کی کوشش کیجئے کہ پاکستان کی قومی تہذیب کی ماہیت اس کی موجودہ صورت اور اس کے اجزاء کیا ہیں؟

ایک بات واضح ہے کہ پاکستان کی قومی تہذیب پاکستان کی تہذیب ہے یعنی اس قوم کے امتیازی نشانات کیا ہیں جو اس کو دوسری قوموں سے ممیز کرتے ہیں۔ ایک تمیز تو اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ پاکستانی قوم کی دو امتیازی خصوصیات ہیں۔ ایک یہ کہ وہ پاکستانی ہے۔ دوسری یہ کہ اس کی اکثریت مسلمان ہے۔ تو گویا دو ترکیبی عناصر ہوئے آپ کی قومیت کے، جس میں سے ایک کو تو پاکستانیت کہئے اور دوسرے کو اسلامیت یا مسلمیت۔ اب سوال یہ ہے کہ قوموں کی تہذیب کے جو تین پہلو ہم نے متعین کئے تھے یعنی تاریخ، جغرافیہ اور معاشرتی نفوذ، ان کی کیفیت پاکستانی قوم میں کیا ہے؟

یہاں سے ہماری مشکلات شروع ہوتی ہیں اس لئے کہ سیاسی اعتبار سے اس گروہ کی عمر صرف ۲۹ برس ہے جس کو قوم کہتے ہیں۔ آج سے ۲۹ برس پہلے جب کوئی پاکستان ہی نہ تھا تو ظاہر ہے کوئی پاکستانی قوم بھی نہیں تھی، لیکن وہ خطہ جسے ہم پاکستان کہتے ہیں اس کی تاریخی عمر پانچ ہزار سال ہے جو کہ ہم موہنجو داڑو سے شروع کرتے ہیں۔ اب پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کو یعنی دس بیس برس کی عمر کو ہم ایک دوسرے سے کیسے مطابق کریں اور اس میں کس قسم کی مطابقت پیدا کرنی چاہیئے۔ سب سے پہلے ہم یہی پوچھ سکتے ہیں کہ ۲۹ برس پہلے جب پاکستانی قوم نہیں تھی، تو ہم کیا تھے؟ اس کے پہلے بھی تو آخر کوئی ہماری تعریف ہوگی۔ کوئی ہمارا نام ہوگا تو وہ کیا تھا؟ اس سلسلے میں غرض یہ ہے کہ اس سے پہلے ہمارے نام دو طرح کے تھے اور دو طرح سے ہمیں پہچانا جاتا تھا۔ تہذیبی اعتبار سے ہمارے نام مختلف علاقوں کے نام تھے، یعنی ہم پنجابی، سندھی، بلوچی، پٹھان اور بنگالی تھے، لیکن ہم پاکستانی نہیں تھے اور سیاسی اعتبار سے ہم ہندوستانی مسلمان تھے تو اس طرح بھی پاکستانی مسلمان نہیں تھے۔ ویسے جو ہمارے علاقائی اعتبار سے پہلی جو تعریف تھی اس کا حلقہ پاکستان

سے چھوٹا تھا اور جو دوسری تعریف تھی یہی ہندوستانی مسلمان کے اعتبار سے تو اس کا حلقہ پاکستان کی موجودہ قوم سے زیادہ وسیع تھا۔ چنانچہ پہلی مشکل جو ہمیں درپیش ہے وہ بہت سی قوموں کو درپیش نہیں ہے یعنی ۲۹ برس میں ایک مخصوص تہذیب کے خدوخال کو بیان کرنا۔ دوسرے ملکوں کو یہ مشکل اس لئے درپیش نہیں ہے کہ دنیا کی بیشتر قومیں جیسے جیسے پروان چڑھتی گئیں، ان کا نشوونما ہوتا گیا۔ ویسے ہی ان کی تہذیب بھی ترقی کرتی گئی اور پروان چڑھتی گئی، حتی کہ ایک خاص وقفے کے بعد اس کی قومیت اور تہذیب کی شخصیت اور انفرادیت مخصوص ہوگئی۔ چنانچہ ایرانی، مصری، سوڈانی یا عراقی لوگوں کو ہماری جیسی مشکل درپیش نہیں۔

ہمیں یہ مشکل کیوں درپیش آئی؟ اس لئے کہ قوم کا تصور دنیا بھر میں نسبتاً نیا ہے اور یہ تصور اس وقت پیدا ہوا جبکہ پہلی دفعہ جمہوریت کا تصور پیدا ہوا۔ یہ دونوں تصورات قریب قریب دو سو برس پرانے ہیں۔ اس سے پہلے ساری دنیا میں جاگیرداری FEUDAL یا نوابی نظام رائج تھا۔ اس وقت قوموں کا تصور نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت یا تو حسب و نسب کا تصور تھا یا نسل کا تصور تھا یا قبیلے کا تصور تھا، لیکن کلی طور پر کسی ایک قوم میں قومیت کا تصور نہیں تھا اور قوم کا تصور اس لئے نہیں تھا کہ اس وقت معاشرہ اس کے عوام، خواص، امرا اور ان کی رعایا میں بٹا ہوا تھا اور ان دو طبقوں کی تہذیبیں الگ الگ تھیں۔ ان کے معاشرتی آداب بھی الگ الگ تھے۔ ان کا آپس میں ربط سیاسی نوعیت کا تھا۔ سماجی ربط بہت تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں جتنے بھی ملک اور ان میں جتنی بھی تہذیبیں تھیں وہ یا نسل کے نام پر تھیں یا خاندانوں یا بادشاہوں کے نام پر تھیں۔ پہلی دفعہ کسی معاشرے کے مجموعی طور پر ایک قوم سمجھنے کا تصور اس وقت پیدا ہوا جب کہ مجموعی طور پر سب لوگ نظریاتی اعتبار سے برابر اور ان کے حقوق ایک طریقے سے مساوی سمجھے جانے لگے۔ یہ اس وقت ہوا جبکہ جاگیردارانہ نظام ختم اور اس کی بجائے جمہوری نظام یا صنعتی نظام رائج ہوا۔

ہمارے ہاں یہ اس لئے نہ ہو سکا کہ پیشتر اس کے کہ ہمارے ہاں جاگیرداری یا بادشاہی نظام ترقی یافتہ صورت اختیار کرتا، ہم غلام ہوگئے اور غیر ملکی حکمران یعنی انگریز ہم پر قابض

ہو گئے اور انہوں نے اپنے معاشرتی یا سیاسی تصور کے مطابق ہم پر حکمرانی شروع کر دی۔ یہ عمل کوئی ابھی سے نہیں ہوا بلکہ سولہویں صدی کے بعد جبکہ یورپی ممالک طاقتور ہوئے اور انہوں نے امپیریلزم یا سامراجیت کی بناء ڈالی اور جہاں جہاں بھی وہ پہنچے انہوں نے یہ کوشش کی کہ وہ ملک معاشرتی ترقی کی جس سطح پر پہنچا ہے اس سے آگے نہ بڑھنے پائے اور اس کا نظام، جو بھی اس وقت کا نظام ہے وہ وہیں کا وہیں منجمد ہو جائے اور اس میں آگے حرکت نہ ہو سکے۔ چنانچہ اگر وہ کسی قبائلی علاقے میں پہنچے جہاں بہت ہی پرانا قبائلی نظام رائج تھا تو وہاں وہی نظام منجمد ہو کر رہ گیا اور وہ نظام وہاں پہ قائم ہے اگر وہ کسی ایسے علاقے میں جا پہنچے جہاں پر جاگیرداری یا نوابی نظام رائج تھا تو انہوں نے کوشش کی کہ اس نظام کو وہیں منجمد کر دیا جائے اور اس کی معاشرتی اور سیاسی ترقی یافتہ صورتیں پیدا نہ ہوں۔ یہی نہیں بلکہ وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھے اور جس نظام پر انہوں نے قبضہ جمایا۔ اس کی جو بری باتیں تھیں، جو پیچھے لے جانے والی باتیں تھیں جو پسماندہ رکھنے والی باتیں تھیں۔ ان کو قائم رکھا اور اس کی جو خوبیاں تھیں اس میں جو محاسن تھے ان کو زائل کر دیا چنانچہ ہمارے ہاں بھی یہی ہوا کہ جب انگریز یہاں آئے تو اس وقت جو ہمارا کافی ترقی یافتہ جاگیرداری نظام یہاں رائج تھا۔ اس کی خوبیاں مثال کے طور پہ آپس میں وضع داری، رکھ رکھاؤ، مروت، نفاست پسندی، علم پروری، ہنر دوستی۔ یہ سارے خصائص اس نظام کے انہوں نے ختم کر دیئے اور اس کی بری باتیں مثلاً دیار داری، خوشامد پسندی، تملق، تقدیر پسندی، توہم پرستی، تکبر، دوسروں میں ایک خاص طرح کا بے جا مقداری کا جذبہ۔ ان سب برائیوں کو مستقل کر دیا۔ ان کو جاری رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری قوم ترقی کر کے اس مقام تک نہ پہنچ سکی جس کے بعد قومیت اور قومی تہذیب کے خدوخال صحیح طریقے سے واضح ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک مشکل تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب انگریز یہاں سے رخصت ہوئے تو جو ہم کو ورثے میں ملا وہ پوری طرح تشکیل شدہ اور تراشیدہ اور بالغ قومیت نہیں تھی۔ پوری طرح سے پختہ اور مخصوص تہذیب نہیں تھی بلکہ اس کی بجائے جو ہم کو ملا وہ قومیت کے لئے RAW MATERIAL تھا۔ خام مسالہ تھا اور اسی طرح

قومی تہذیب کے بھی بکھرے ہوئے اجزا تھے اور اس کا بھی خام مسالہ تھا اور اس کو تشکیل کرنے کا کام اور اس کی ذمہ داری ہم پہ ڈال دی گئی جو کہ اس وقت بھی ہماری ذمہ داری ہے جسے ہمیں کسی نہ کسی طریقے سے سرانجام دینا ہے۔ اب یہ مشکل آپ ذہن میں رکھئے اور پھر یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کیجئے کہ ہم ان خصائص کا جو میں نے قومی تہذیب کے بیان کئے ہیں، اپنے آپ پہ کیسے اطلاق کرتے ہیں۔

پہلی بات تاریخ کی ہے کہ ہم اپنی تاریخ کہاں سے شروع کریں۔ سیاسی اعتبار سے تو ہماری عمر ۲۹ برس ہے اور تاریخی اعتبار سے ہماری سرزمین کی عمر پانچ ہزار برس ہے اب یا تو ہم اپنی تاریخ ۵۰۰۰ برس سے شروع کریں یعنی موہنجو داڑو سے۔ اب تک جتنا زمانہ گزرا ہے، وہ ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ اس لئے کہ ہمارے خطّے کی تاریخ وہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے چند قباحتیں پیدا ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ اگر آپ موہنجو داڑو کو اپناتے ہیں تو موہنجو داڑو کے بعد جتنے دور گزرے ہیں وہ سب آپ کو اپنی تاریخ کا حصّہ ماننے پڑیں گے۔ ان ادوار میں برہمن تہذیب کا دور بھی ہے، بدھ تہذیب کا دور بھی ہے، یونانی تہذیب کا دور بھی ہے۔ اگر ان تمام تاریخی ادوار کو آپ اپنی تاریخ اور اپنی تہذیب کا جزو مانتے ہیں، تو پھر آپ کو اس زمانے کے جو بڑے بڑے ہیرو ہو گزرے ہیں، مفکر گزرے ہیں، فن کار ہوئے ہیں، ان کو بھی اپنے تہذیبی مورثوں میں شمار کرنا پڑے گا۔ مثلاً اشوک، چندر گپت، سکندر اعظم، پورس، راجہ رسالو وغیرہ۔ اگر آپ ہیرو مانتے ہیں، تو پھر آپ کو اپنے سیاسی نظریات میں تھوڑی بہت ترمیم بھی کرنا پڑے گی، کیونکہ تاریخ کا یہ جز آپ کا ہندوستان کے ساتھ اور موجودہ بھارت کے ساتھ مشترک ہے اور پھر یہ غلط فہمی پیدا ہونے کی گنجائش ہے کہ اصل میں تو تاریخ کا تھوڑا سا حصّہ ہی مختلف ہے، باقی تاریخ وہی ہے جو ان کی ہے۔ فرض کیجئے کہ آپ یہ نہیں کرتے، آپ اس قباحت سے نپٹنے کے لئے دوسری صورت اختیار کرتے ہیں اور اپنی تاریخ ورودِ اسلام سے شروع کرتے ہیں۔ محمد بن قاسم سے یعنی بجائے پانچ ہزار سال قبل مسیح سے شروع کرنے سے آٹھ سو سال بعد مسیح اپنی تاریخ شروع کرتے ہیں۔ اس میں بھی مختلف قسم کی اُلجھنیں ہیں۔ بڑی اُلجھن تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو

مسلمان باہر سے اس خطے میں آئے، وہ ایک تہذیب سے تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا تعلق مختلف تہذیبوں سے تھا۔ پہلے عرب آئے، پھر محمود غزنوی کے ساتھ غزنہ اور ہرات کے ترک غلام آئے اور تغلق، خلجی، غوری پٹھان آئے اور مغل آئے۔ بیچ میں ایرانی بھی آئے۔

اب یہ جتنی تہذیبیں ہیں، ان کی اپنی اپنی تاریخ ہے، یعنی اگر آپ عربوں سے اپنا رشتہ ملاتے ہیں۔ تو ان کی تاریخ امراالقیس اور متنبی تک پہنچتی ہے۔ اگر آپ غوریوں سے، تغلقوں اور خلجیوں سے اپنا رشتہ ملاتے ہیں تو ان کی تاریخ چنگیز خاں وغیرہ سے ملتی ہے تو سوال یہ ہے کہ ہم ان تہذیبوں میں سے جو کہ ایک تہذیب نہیں تھی (اگرچہ دین ان سب کا ایک تھا) کس قومی تہذیب کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑیں تو ظاہر ہے کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو فوقیت نہیں دے سکتے۔ اس لئے کہ مسلمان کی حیثیت سے تو وہ سب برابر ہیں اور ان کی تہذیبیں اپنی اپنی جگہ بڑی تہذیبیں ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی قوم ایسی نہیں ہے جو اپنی تاریخ اسلام سے شروع کرتی ہے۔ ان میں جتنی بھی مسلمان قومیں ہیں، جن میں وہ قومیں بھی شامل ہیں جو ہندوستان میں وارد ہوئیں۔ ان میں سب ہی اپنی تہذیب کو تاریخ اسلام سے پہلے سے شروع کرتے ہیں جو زیادہ ORTHODOX اور زیادہ دیندار لوگ ہیں، وہ تو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کرتے ہیں۔ ان میں سے جس کی نظر جہاں تک بعض کی یقطان اور قحطان تک پہنچی، کسی کی ملکہ سبا تک پہنچی۔ بہر صورت وہ جسے اپنی تاریخ کا عمدہ دور سمجھتے ہیں، وہ دور سیستان اور حیلہ کی بادشاہتوں کا امراالقیس اور متنبی کی شاعری کا زمانہ ہے جو کہ اسلام سے پہلے کا زمانہ ہے۔ اسی طرح ایرانی ہیں جو کہ اپنی تاریخ درفش کاویانی سے شروع کرتے ہیں۔ عراقی ہیں تو بابل کی تہذیب سے اپنا سلسلہ ملاتے ہیں۔ کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں ہے جو کہ اپنی تہذیبی تاریخ درودِ اسلام کی بجائے اپنے تاریخی ماخذ اور اپنے ابتدائی زمانہ سے شروع نہ کرے، تو اس لئے اگر ہم درودِ اسلام سے شروع کریں تو دینی طور پر تو ہم اس کا جواز پیش کر سکتے ہیں لیکن تہذیبی طور پر یہ مشکل ہو جاتا ہے۔ ہماری بہت سی چیزیں ہیں جن کا کوئی تعلق عرب سے نہیں ہے نہ کوئی تعلق اسلام سے ہے۔

چنانچہ دو مشکلیں ہیں اگر آپ پاکستانیت پر زور دیں یعنی خطۂ زمین کی تاریخ پر

زور تو پھر بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہندوستان سے مل جاتی ہیں اور اس صورت میں آپ کی تہذیب میں اسلام کا عنصر دب جاتا ہے۔ اگر اسلامیت کو واحد بنیاد قرار دیں تو پھر پاکستانیت کا عنصر دب جاتا ہے اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی تہذیب اگر محض اسلامی تہذیب ہے، تو پھر ایرانی، تورانی، سوڈانی اور انڈونیشیا والوں سے کس طرح مختلف ہے۔ اس مشکل کو تو یہاں چھوڑیئے اور آگے چلئے۔ دوسرا پہلو لیجئے یعنی جغرافیائی پہلو۔ ہماری تہذیب کی حدود کیا ہیں کیونکہ یہ مشکل جس کی طرف میں نے پہلے اشارہ کیا ہے، اس کی طرف ہم بعد میں لوٹ آئیں گے۔

جغرافیائی اعتبار سے ہماری تہذیب کا مرکز کیا ہے اور اس کے دائرے کے حدود کیا ہیں؟ یہاں بھی اس قسم کی مشکلات پیش آتی ہیں یعنی اگر آپ شروع سے اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں یعنی اس خطے کی تاریخ پر جسے ہم پاکستان کہتے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ یہاں کئی طرح کی تہذیبیں نمودار ہوئیں، کئی طرح کی تہذیبوں نے فروغ پایا۔ سب سے پہلے جسے آپ یہاں کی خالص تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ جس کا یہیں پہ نشوونما ہوا اور ولادت بھی یہیں ہوئی تو وہ وادیٔ سندھ کی تہذیب ہے یا موہنجوداڑو کی تہذیب ہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے۔ اس تہذیب کی ولادت یہیں ہوئی، لیکن اس کے حدود پاکستان نہیں ہیں۔ اس لئے کہ یہ تہذیب جنوب میں خلیج کھمبے تک جو کہ ہندوستان کا حصّہ ہے اور مغرب میں سارے راجپوتانے تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کے حدود وہ حدود نہیں تھے جو کہ موجودہ پاکستانی سندھ کے حدود ہیں یہ وہ تہذیب تھی جسے اس خطّے کی پہلی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔

اس کے کوئی ایک ہزار سال بعد آریہ یہاں وارد ہوئے اور یہ آریائی تہذیب پیدا ہوئی۔ اس آریائی تہذیب کا مرکز یہاں نہیں تھا نہ اس کی ولادت یہاں ہوئی۔ اس کا مرکز وادیٔ گنگ وجمن میں تھا اور وہاں جب راجپوتوں کی بادشاہیاں قائم ہوئیں اور بڑے بڑے تہذیبی مرکز قائم ہوئے تو یہ اُدھر سے اِدھر آئی اور سا تنے چھوٹے مرکز اس علاقے میں قائم کئے جسے ہم پاکستان کہتے ہیں۔ اس تہذیب نے بہت سی چیزیں پیدا کیں اور یہ تہذیب اپنی پیش رو تہذیب پر غالب آگئی۔ اس کے بعد تیسری تہذیب یعنی بدھ تہذیب پیدا

ہوئی، بلکہ بدھ سے پہلے پانچسو سال قبل مسیح ایرانی تہذیب یہاں پہ آئی اور دو سو برس تک یہاں مسلّط رہی۔ یہ لوگ اپنے ساتھ بہت سی صنعتیں اور فنون لائے۔ رسم الخط لائے۔ یہاں پہ سکّہ بھی لائے اور یہ سب چیزیں یہاں کی مقامی تہذیب میں شامل ہو گئیں۔ اس کے بعد تین سو قبل مسیح یونانی یہاں آئے وہ اپنے ساتھ اپنا لباس، اپنے فنکار، اپنی آرائش کا سامان لائے اور یہ بھی یہاں کی تہذیب میں شامل ہو گئے۔ پھر کوئی دو سو سال قبل مسیح بدھ تہذیب کا عروج ہوا۔ اس زمانے میں چین اور وسطِ ایشیا کی جانب سے کُشن یہاں پہ آئے اور گندھارا تہذیب پیدا ہوئی۔ اس گندھارا تہذیب کے ساتھ ہی ساتھ اس خطۂ زمین نے رومن تہذیب کے ساتھ رشتہ جوڑا اور بہت سے رومی اثرات یہاں پہ پیدا ہوئے، پھر ایک مختصر زمانہ ایرانیوں کا آیا، پھر سفید ہن آئے جنہوں نے اس تہذیب کو ملیامیٹ کر دیا۔ اس کے بعد بدھ مذہب کا زوال ہوا اور پھر ہندو ریاستیں مثلاً راجپوتانہ کی ریاستیں پیدا ہوئیں۔ اس کے بعد اسلام کا ورود ہوا۔ پھر مختلف ممالک کے مسلمان یہاں پہ آتے رہے۔ اب ان تہذیبوں میں سے کوئی سی ایک تہذیب بھی ایسی نہیں جسے ہم کہہ سکیں کہ پاکستان کی موجودہ حدود کے اندر قید تھی یا جسے ہم کلیتاً اپنی تہذیب کہہ سکیں۔ اب آخری دَور لیجئے جس میں کہ ہماری تہذیب پیدا ہوئی۔ یعنی ہندی مسلمانوں کی، تو اس میں بھی کسی فن کو لے لیجئے۔ ہندوستان کی موسیقی جو مسلمانوں نے ایجاد کی۔ اس کے موجد سلطان حسن مشرقی اور امیر خسروؒ اور تان سین بھی پاکستان سے باہر ہیں۔ فنِ تعمیر لے لیجئے۔ ان کے بڑے مراکز مثلاً تاج محل، لال قلعہ وغیرہ بھی پاکستان سے باہر ہیں۔

کیا ہم اس فن کو پاکستانی کہیں جو پاکستان میں پیدا ہوا، اگر ہم یوں کہیں تو پھر تاج محل، لال قلعہ اور غالب، میر، امیر خسروؒ، تان سین ان سب کو اپنی تہذیب سے خارج کرنا پڑتا ہے جو ہم نہیں کر سکتے۔ اگر ہم ان سب کو اپنی تہذیب میں شامل کرتے تو پھر ہمیں یہ ماننا پڑیگا کہ ہماری تہذیب پاکستان کی حدود میں محدود نہیں ہے یا نہیں تھی یعنی اس کی حدود موجودہ سے متجاوز ہیں۔ یہ دوسری مشکل ہے۔ اس مشکل کو بھی یہاں چھوڑ دیئے۔

تیسری طرف چلئے جسے میں نے گہرائی کہا تھا۔ کسی کلچر یا تہذیب کی کسی معاشرہ یا کسی

سماج میں رسائی کہاں تک ہے اور کن طبقوں تک وہ پہنچتی ہے، اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھئے، تو پھر بھی کافی پیچیدگیاں نظر آتی ہیں۔ سب سے بڑی پیچیدگی تو یہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں موہنجوداڑو کو چھوڑ کر یہاں ہمیشہ دو تہذیبیں ہر دور میں ساتھ ساتھ چلتی رہی ہیں۔ ایک وہ تہذیب جس کو کہ آپ کلاسیکی تہذیب کہہ لیجئے یا درباری تہذیب یا اُمراء کی تہذیب یا انگریزی زبان میں جس کو METROPOLITAN یا مرکزی تہذیب کہتے ہیں۔ یعنی جو بھی بادشاہتیں یہاں پہ قائم ہوئیں۔ ان میں جو اُمراء تھے، جو درباری تھے اور جو ان درباریوں کا طبقہ تھا، ان سب کی ایک تہذیب ہوتی تھی۔ ان کی ایک زبان ہوتی تھی۔ ان کا خاص قسم کا لباس ہوتا تھا، خاص اخلاق ہوتے تھے۔ آداب ہوتے تھے، ان کی ایک خاص تہذیب تھی جو کہ اُوپر کے طبقے کی تہذیب تھی۔ اب اس تہذیب کے ساتھ ہی ساتھ دوسری تہذیبیں تھیں جو کہ عوامی یا FOLK تہذیبیں تھیں وہ مقامی تھیں۔ بلوچ الگ، سندھی الگ، پنجابی الگ، پٹھان الگ اور بنگالی الگ۔ چنانچہ ایک اختلاف درباری اور عوامی تہذیب میں تھا۔ دوسرے اختلاف ہی تھے، مختلف مقامی عوامی تہذیبوں میں یعنی جو پنجابیوں کی تہذیب تھی اس کی اپنی تاریخ تھی، اپنے خصائص تھے جو کہ سندھیوں، پٹھانوں اور بنگالیوں سے مختلف تھے۔ چنانچہ ہماری تہذیبی روایت میں دو طرح کی تفریقات تھیں۔ ایک درباری اور عوامی تہذیب کی تفریق اور دوسرے عوامی، مقامی یا علاقائی تفریق۔ چنانچہ اس میں سے کسی ایک تہذیب کو ہم پاکستانی تہذیب نہیں کہہ سکتے۔ نہ پنجابی، بلوچی، نہ پشتو، نہ بنگالی کو کیونکہ یہ مقامی ہیں اور دوسری جو درباری تہذیبیں تھیں۔ ان میں سے بھی کسی ایک کو ہم اپنی پاکستانی تہذیب نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ یہ تہذیب ہر دور میں مختلف ہوتی رہی ہے اور اب ان سب پہ مستزاد ایک نئی تہذیب پیدا ہوئی جو کہ انگریز یہاں لائے۔ جب یہاں پہنچے، تو انہوں نے اپنے انتظامی امور کے لئے اپنی حکومت چلانے کے لئے یہاں کے نظام میں ترمیم کی اور اپنا ایک افسر شاہی یا نوکر شاہی نظام پیدا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں ایک نیا طبقہ پیدا ہوا۔ ان طبقوں کے علاوہ جو یہاں پہلے موجود تھے۔ ایک اُمراء کا طبقہ تھا۔ جس کی تہذیب موجود تھی۔ دیہاتی عوام کی مختلف تہذیبیں موجود تھیں۔

اب اس پر ایک نئے طبقے کا اضافہ ہوا جو ہم لوگ ہیں یعنی شہر کا سفید پوش طبقہ جو کہ پہلے موجود نہیں تھا۔ اب اس طبقے کے ساتھ کیا ہوا۔ کیونکہ یہ اُمراء میں شامل نہیں تھے اس لئے اس تہذیب کا حصّہ نہیں تھے نہ یہ دیہات کے عوام میں شامل تھے کیونکہ اس کی تہذیب سے بھی کٹ گئے تھے۔ چنانچہ یہ جو ہمارا طبقہ پیدا ہوا۔ اس کو نہ اس تہذیب سے تعلق تھا نہ اس تہذیب سے اور ان بیچاروں کو لا محالہ مغربی تہذیب کا سہارا لینا پڑا اور انہوں نے کوشش کی کہ جہاں تک ممکن ہو اس تہذیب کی نقّالی کریں۔ اسی طرح کا لباس پہنیں۔ اسی طرح کے گھر بنائیں اور اسی طرح کے رسم و رواج اور آداب و اخلاق پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ یہ ایک تیسری چیز پیدا ہوئی۔ اس وقت جو ہمارے معاشرے کا تہذیبی ڈھانچہ ہے اس میں یہ سب چیزیں شامل ہیں، اس میں آپ کی پُرانی درباری تہذیب بھی شامل ہے۔ اس میں مختلف عوامی تہذیبیں بھی شامل ہیں اور اس میں ایک سفید پوش طبقہ کی نیم مغربی نیم مشرقی تہذیب بھی شامل ہے۔ اب یہ صورتِ حال ہے اور یہ مسائل ہیں اب سوال یہ ہے کہ ان سے نپٹنا کیسے جائے؟

پہلا سوال تو یہ ہے کہ آپ پاکستانی تہذیب کو ایک طرف ہندوستان سے اور دوسری طرف باقی اسلامی ممالک سے ممیز کیسے کریں؟ یعنی اس تہذیب کو جس کو آپ پاکستانی تہذیب کہتے ہیں۔ اس کی شخصیت IDENTITY اور اس کی انفرادیت کا کیسے تعیّن کریں؟ اس پر ذاتی رائے تو دی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ چونکہ ہماری تہذیب میں یہ دونوں عناصر شامل ہیں یعنی ایک طرف ہماری وطنیت اور دوسری طرف ہمارا دین۔ اس لئے ہماری تاریخ ۵ ہزار سال پرانی ٹھہرے گی۔ ہر چند کہ اس میں تین یا چار ہزار سال کی تہذیب ہندوستان کے ساتھ مشترک ہے اور اس کی تہذیبی روایات ہندوستان کے ساتھ منسلک ہیں۔ لیکن اس میں ایک حصّہ ایسا ہے جو کہ ہندوستان کے ساتھ مشترک نہیں ہے یا ہندوستان کے غیر مسلموں کے ساتھ مشترک نہیں ہے۔ وہ ایک ہزار سال کا حصّہ ہے جو کہ اسلامی دَور کا حصّہ ہے اور اس دَور کی جو تہذیبی روایات ہیں اس کا فن، اس کے

عقائد اس کے رہنے سہنے کے طریقے، اس کے رسم و رواج وہ غیر مسلموں کے اور ہندوستانی کی تہذیبی روایتوں سے قطعی مختلف ہیں۔ چنانچہ یہ چیز ہم کو ہندوستان سے ممیز کرتی ہے۔ دوسری طرف ہماری پہلی چار ہزار سال کی تاریخ ہے۔ یہ ہم میں اور باقی اسلامی ممالک میں مشترک نہیں ہے۔ ایک ہزار سال کی اسلامی روایات دوسرے اسلامی ممالک سے مشترک ہیں۔ لیکن چار ہزار سال کی ہماری مقامی روایات ہیں اور پاکستانی روایات ہیں یعنی وطنی روایات جو کسی دوسرے اسلامی ملک کے ساتھ مشترک نہیں ہیں۔ چنانچہ ہمارا وطن ہم کو باقی اسلامی ممالک سے الگ کرتا ہے اور ہمارے دین کی روایات ہم کو غیر مسلم ہمسائیوں سے الگ کرتی ہیں اور یہ دونوں چیزیں مل کر ایک خصوصی چیز پیدا ہوتی ہے۔ ایک انفرادی چیز پیدا ہوتی ہے۔ جس کو ہم پاکستان کی تہذیبی شخصیت کہتے ہیں۔ یہ تو رہی پہلی بات۔

دوسری بات حدود کی ہے۔ اس کا بھی میرا مختصر جواب یہ ہے کہ ہر وہ چیز اور اچھی چیز جو کہ ہمارے اس چار ہزار سال کی پیداوار ہے، وہ بھی ہماری ہے اور ہر وہ چیز جو پچھلے ایک ہزار سال کی روایتوں کا نتیجہ ہے، خواہ اس کا جغرافیائی مرکز کہیں ہے وہ بھی ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔ چنانچہ حافظ اور خیام بھی ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔ اس لئے کہ وہ اسلامی روایات سے تعلق رکھتے ہیں، اس وجہ سے غرناطہ ہماری تہذیب کا حصہ ہے، کیونکہ وہ اسلامی تہذیب سے متعلق ہیں۔ اس وجہ سے کاشی کاری اور وسط ایشیا کے دوسرے فنون بھی ہماری تہذیب سے متعلق ہیں۔ اس لئے کہ ان کا تعلق بھی براہ راست اسلام کی تہذیبی روایت سے ہے۔ اسی وجہ سے تاج محل، لال قلعہ، غالب، میر، تان سین، خسرو اور شرقی و سدا رنگ یہ سب ہماری تہذیبی روایات کا حصہ ہیں۔ اگرچہ جغرافیائی طور پر ان کو پاکستانی حدود میں مقید نہیں کر سکتے اور یہی ایک صورت ہے جس میں کہ آپ اپنی تہذیب کو ایک طرف بہت محدود ہونے سے بچا سکتے ہیں اور دوسری طرف بہت ہی CONFUSED اور پراگندہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔

تیسرا سوال رہا آپ کے معاشرتی مسائل کا کہ ہمارے ہاں جو مختلف علاقائی تہذیبیں

رائج ہیں۔ پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو اور بنگالی۔ ان کو یکجا کر کے ہم قومی تہذیب کیسے بنا سکتے ہیں۔ ایک مسئلہ ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ دو سو برس ہم نے جو غلامی میں گزارے ہیں جس کی وجہ سے ہماری تہذیبی سطح دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی نسبت بہت نیچے رہ گئی ہے اس کمی کو کیسے پورا کرنا ہے اور اپنی تہذیب کو اس سطح تک کیسے پہنچانا ہے کہ ہم دنیا کے سب سے مہذب ملکوں کے دوش بدوش کھڑے ہو سکیں۔ یہ رہا دوسرا مسئلہ۔ تیسرا مسئلہ یہ کہ ہم اپنے معاشرتی نظام کو کس طریقے سے تشکیل دیں یا کس طریقہ سے تشکیل دینا چاہیئے تاکہ پرانا فرق جو اُمراء اور عوام کی تہذیبوں میں تھا، وہ دور کیا جا سکے اور یہاں پر جو بھی تہذیب ہم تشکیل کریں، اس میں سب عوام کو یکساں حصّہ ملے۔ چنانچہ یہ تین طرح کی ذمہ داریاں تین طرح کے کام اور تین طرح کے مسائل ہیں جن سے ہمیں نپٹنا ہے۔

پہلا مسئلہ ارتباط کا ہے یعنی ہمارے ہاں جو مختلف علاقے ہیں یا مختلف تہذیبیں ہیں، ان کا ارتباط کیسے کرنا ہے اور ان میں اتحاد کیسے پیدا کریں۔ یہ رہا پہلا مسئلہ جو کہ مستقبل میں ہمیں حل کرنا ہے۔

دوسرا مسئلہ ارتفاع کا ہے کہ ہم اپنی تہذیب کی سطح کو بلند کیسے کریں؟ اور اس کی پسماندگی کو دور کیسے کریں؟

تیسرا مسئلہ انضباط کا ہے کہ ہمیں اپنے معاشرے کی تشکیل کس طرح کرنی ہے تاکہ ہمارے معاشرتی انضباط کے ساتھ ہماری تہذیبی زندگی میں ایک وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کے بارے میں کل بات کریں گے۔

سوال :۔ غالباً سوال کیا گیا تھا کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنی تہذیب کو اسلامی تہذیب کہیں؟

جواب :۔ جس ملک میں اسلام پہنچا اسلام کی وجہ سے وہاں چند ایک باتیں، چند ایک خوبیاں یا اوصاف پیدا ہوتے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہاں مقامی تہذیب تباہ نہیں ہوئی، بلکہ اس کی ترمیم ہوئی نتیجہ اس کا یہ ہے کہ جتنے اسلامی ممالک ہیں، ان کی اپنی اپنی تہذیب الگ ہے۔ اگرچہ ان میں اسلامی خصائص مشترک ہیں۔ چنانچہ ہم اپنی تہذیب کو ایرانی تہذیب اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ ہماری زبان ایرانیوں کی سی نہیں ہے۔ ہماری مصوّری

ہمارے ادب کا ایرانیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ صرف چند ایک چیزیں مشترک ہیں۔ چنانچہ ہم کلی طور پر کسی ایک قوم کی تہذیب کو کسی دوسری قوم کی تہذیب کے ساتھ منطبق نہیں کر سکتے خواہ ان کا دین اور بہت سی خصائص مشترک ہوں۔ اس وجہ سے یا تو ہم پاکستانی کو پاکستانی نہ کہیں اور اگر پاکستانی کو پاکستانی کہتے ہیں اور اگر ہم پاکستانی قومیت کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ اس قومیت کے لئے آپ کو ایک الگ تہذیب بھی وضع کرنی پڑے گی وہ اگر موجود نہیں ہے۔ اور اگر موجود ہے تو اس کو اپنانا پڑے گا۔ پاکستان تو اسلام نہیں ہے۔ پاکستان تو جغرافیہ ہے۔ ملک کا نام ہے، دین کا نام نہیں ہے۔ اگر آپ اپنے کو پاکستانی نہ کہیں اور اپنی قومیت سے انکار کر دیں تو پھر یہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ قومیت پر مُصر ہیں تو پھر آپ کو قومی تہذیب پر بھی مُصر ہونا پڑے گا پھر آپ اس قومی تہذیب کو کسی دوسری قومی تہذیب کا حصّہ نہیں سمجھ سکتے۔

سوال:۔ غالباً یہ سوال کیا گیا تھا کہ اگر ہم اپنی تہذیب کو پاکستانی تہذیب کہیں، تو کیا یہ اسلام سے بعد کا باعث نہ ہوگا؟

جواب:۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسلام کے ساتھ کوئی قومی تہذیب مطابقت نہ رکھے جیسے میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ دین یا مذہب آپ کے عقائد اور اخلاق اور ایک حد تک آپ کے آداب کی تشکیل کرتا ہے۔ دین آپ کی زبان، لباس، خوراک اور رہن سہن کے طریقے متعین نہیں کرتا اور خاص طور پر دینِ اسلام سوائے حلال و حرام کے کسی خوراک کی وضاحت نہیں کرتا کہ چاول کھائیں یا روٹی کھائیں یا کس قسم کے ظروف استعمال کریں یا آپ کے ادب کی کیا صورت ہوگی، یا یہ کہ آپ کی تعمیر کی کیا صورت ہوگی تو میں نے جو تہذیب کی تعریف کی تھی اس میں عرض کیا تھا کہ باطنی قدروں کے علاوہ اور علاوہ ان اخلاق کے جو براہِ راست دین سے متعلق ہیں، زندگی کا جملہ روزمرّہ شامل ہوتا ہے اور وہ روزمرّہ ہمیشہ حالات سے متعین ہوتا ہے جو مقامی تاریخی اور جغرافیائی حالات کے علاوہ کسی اور طریقے سے متعین نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے یہ عام مغالطہ ہے کہ اسلامی تہذیب کو قومی تہذیب بنایا جا سکتا ہے۔ یا اس میں بند کیا جا سکتا۔

سوالات: (۱) تہذیبی جھنجھٹ کی گوناگونی سے بچنے کے لئے اسلامی تہذیب کو اپنانے کی کوشش کی تھی اور اسی پر پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔ کیا اس بات میں حقیقت نہیں ہے؟ یا پاکستانی تہذیب ناقابلِ عمل ہے؟

(۲) کے تمیزِ رنگ و بُو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک شاخسار ایم

تہذیب کو اس رنگ میں پیش کریں جس میں علامہ اقبال نے پیش کیا ہے؟

جواب:- میں یہ بات واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اسلام، اسلامی تہذیب اور قومی تہذیب میں کوئی فرق یا تضاد نہیں ہے۔ ہر قومی تہذیب اسلامی تہذیب ہے۔ بشرطیکہ اس کے اخلاق وعقائد وہی ہوں جن کی کہ مذہب اسلام تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ جب سے اسلام پیدا ہوا ہے بیسیوں اسلامی ملک، ایران، توران، سوڈان اور مصر وغیرہ سارے ملکوں کی تہذیب اسلامی ہے لیکن اسلامی تہذیب کے علاوہ ہر ملک کی اپنی تہذیب بھی ہے ان کی قومی اور اسلامی تہذیب سے مل کے جو تہذیب پیدا ہوتی ہے، اس کو ہم مجموعی طور پر ان کی تہذیبی خصوصیت گردانتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح پاکستانی تہذیب اپنے مقامی فنون، رسوم، رہن سہن، اپنے ادب زبان اور مقامی اجزاء کو اپناتی ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ اپنے عقائد اور اپنے اخلاق اسلامی رکھیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ ان باقی اجزاء کو آپ قومی کیوں نہ سمجھیں یا ان کو قومی کیوں نہ قرار دیں اور اس طریقے سے جو پاکستانی تہذیب بنے گی یا موجود ہے وہ پاکستانی بھی ہے اور اسلامی بھی ہے اگر ہم اپنی قومیت کو مانتے ہیں (اور اگر اس سے انکار ہے تو دوسری بات ہے) تو لازماً ہماری تہذیب کے دو عناصر ہوں گے۔ ایک اسلام اور ایک پاکستانیت میں جس چیز کی وضاحت کر رہا تھا وہ پاکستانیت کا عنصر تھا، اس لئے کہ اسلام کے بارے میں نہ کسی بحث کی ضرورت ہی ہے اور نہ ہی وضاحت کی۔ وضاحت جس چیز کے کرنے کی تھی وہ قومی اور مقامی خصوصیات ہیں کہ پاکستانیت سے کیا مراد ہے۔ جب علامہ اقبال نے یہ کہا تھا کہ۔

ما پروردۂ یک شاخسار ایم

اور اس لئے رنگ و بُو کی ہمیں تمیز نہیں کرنی چاہیئے۔ ان کی مراد یہ نہیں تھی کہ دنیا کے اسلامی ممالک اپنی تہذیب سے روکش ہو جائیں یا اپنی تہذیب کو بھول جائیں یا سب کے سب ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ ان کی مراد بھی یہی تھی کہ جو ہمارے عقائد، اخلاق اور روایتیں یکساں ہیں، ان میں ایک دوسرے میں تمیز نہ کریں اور ان کی بنیاد پہ عالم اسلام میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کریں، لیکن اقبال کی مراد یہ نہیں تھی کہ ایرانی عرب ہو جائیں یا ترک ہو جائیں۔ یہ اتحاد تو دینی و ملّی اتحاد تھا۔ یہ میرے نزدیک قومی تہذیبوں کی نفی نہیں کرتا۔ کیونکہ اگر آپ اس کی نفی کریں گے تو لازماً اس قسم کے جھگڑے پیدا ہوں گے جیسے کہ پرانے زمانے میں عربوں اور ترکوں میں پیدا ہوئے۔ جب تک عربوں میں اسلامی جذبہ قائم رہا اس وقت تک عالم اسلام نے انہیں مانا لیکن اس کے بعد جیسے کہ آپ جانتے ہیں ترکوں نے بغاوت کی، کبھی ایرانیوں نے بغاوت کی، کیونکہ کوئی قوم بھی اپنے قومی خصائص کو فراموش نہیں کر سکتی۔ اگر آپ کسی قوم کو دوسری قوم پر غالب کریں گے یا مسلّط کریں گے تو بجائے اس کے کہ اس سے اتحاد پیدا ہو، اس سے لازماً افتراق پیدا ہوگا۔ اتحاد اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کو داخلی طور پر اپنی زندگی، اپنے مزاج اور روایتوں کے مطابق بسر کرنے کی آزادی ہو، لیکن ساتھ ہی ساتھ جو چیزیں اور رشتے دینِ اسلام کی وجہ سے دوسرے ممالک کے ساتھ ہیں، ان رشتوں کو استوار کر کے آپس میں اتحاد کریں۔

سوال :- اگر زبان کا تعلق تہذیب سے ہے تو اردو زبان کا تعلق پاکستان سے کب سے جب یہ دکن سے چلی اور دلّی آئی ؟

جواب :- یہ سوال اس لئے ضروری ہے کہ زبان کا مسئلہ ہمارے ہاں بہت اہم ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں چند باتیں ذہن میں رکھئے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اُردو زبان کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ یہ پیدا کہاں ہوئی۔ لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ زبان پہلے وہیں پیدا ہوئی ہو گی جہاں مسلمان پہلے وارد ہوئے ہوں گے اور جہاں پہلے ترکی، فارسی اور عربی زبانوں کا مقامی زبانوں سے

اختلاط ہوا ہوگا اور وہ علاقہ تو یہی ہے جو پاکستان کا ہے۔ چنانچہ آپ نے حافظ محمود شیروانی کی تحقیق کے بارے میں سُنا ہوگا جنہوں نے اپنی کتاب "پنجاب میں اُردو" میں یہ کہا کہ "اردو پنجاب میں پیدا ہوئی اور دکن میں بعد میں پہنچی"۔ اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اردو زبان ہماری تہذیب کا حصّہ نہیں ہے۔ اگر یہ نظریہ قابلِ قبول نہ ہو، تو یہ ظاہر ہے کہ اگر درباری زبان فارسی تھی خاص طور پر مغلیہ زمانے میں تو اُمراء اور عام بول چال کی زبان اردو تھی یا اردو کی ایک صورت تھی اور اس مغلیہ تہذیب اور سلطنت میں اس علاقہ کو جسے ہم پاکستان کہتے ہیں، بہت اہمیت حاصل تھی۔ یہاں دو سو برس پہلے اُردو کے بہت سے ادیب پیدا ہوئے جن کی تحریریں کچھ دستیاب ہوتی ہیں اور کچھ دستیاب نہیں ہوتیں۔ یہ درست ہے کہ چونکہ دربار دلّی میں تھا اس لئے زیادہ نامور ادیب اور شعراء دلّی میں پیدا ہوئے، لیکن درباری شعراء اور ادیبوں کے علاوہ صوفیا، علماء، مورخوں، فقیہوں اور مبلّغوں نے جو دینی اور دنیوی کتابیں گمنامی میں رہ کر لکھیں وہ اردو میں تھیں اور یہ سب لوگ اسی خطّے میں پیدا ہوئے اور اسی خطّے میں انہوں نے زبان کو فروغ دیا۔ اس کے بعد جب انگریز آئے، تو اردو کو اس کے اپنے وطن میں زوال ہوا۔ اُردو زبان کا صحیح فروغ اور ترقی اسی علاقہ میں ہوئی جس کو ہم آج پاکستان کہتے ہیں۔ اس لئے اُردو زبان ہماری تہذیبی روایت سے الگ چیز نہیں ہے بلکہ اس کا اہم جزو ہے۔

اگرچہ اس زبان کے ساتھ ساتھ ہماری مقامی زبانیں بھی ہیں اور ان زبانوں کی اپنی تاریخ ہے، ان کا اپنا ادب ہے اور ان کی اپنی تہذیبی اہمیت ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ اردو اور مقامی زبانوں میں اس قسم کا ارتباط پیدا کریں اور ایسا رشتہ پیدا کریں کہ یہ زبانیں بھی اور اردو بھی ہمارے ہاں فروغ پا سکیں۔

سوال :۔ غالباً یہ سوال پوچھا گیا تھا کہ کیا مختلف ثقافتی نمائشیں جو آجکل وقتاً فوقتاً کی جا رہی ہیں، ہماری اسلامی تہذیب کا حصّہ ہیں؟

جواب :۔ میں سمجھتا ہوں کہ فن اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔ اور اگر کوئی فن پاکیزہ ہے تو اسلام سے متصادم نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اچھے فن کار بھی ہیں جو کہ اسلامی تہذیب

یا ہماری تہذیب کے مطابق ہیں۔ کچھ بُرے، لوچ پوچ اور لچر فنکار بھی ہیں جن کا مکمل اسلام سے صریحاً متصادم ہے۔ مثلاً موسیقی کو لے لیجیے، اسلامی تاریخ کے ہر دَور میں چاہے وہ اُمیہ یا عباسی ہوں ہمیں موسیقی کے سرپرست ملتے ہیں۔ اسحاق موصلی اور خلیفہ مقتفی باللہ اور ایسے کئی بڑے بڑے نام ہیں جو اسلامی روایت کا حصہ ہیں، لیکن اس زمانے میں گھٹیا اور فحش موسیقار بھی ہوں گے جن کا نام آج ہم نہیں جانتے۔ چنانچہ وہ ہماری تہذیب کا حصّہ نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں جو فن پاکیزہ، شائستہ اور بلند اخلاق کی طرف ترغیب دینے والا ہے، وہ اسلامی ہے جو فن فحش ہے اور جس سے لوگوں کا اخلاق بگڑتا ہے، وہ اسلامی تہذیب کے خلاف ہے۔

قاضی جاوید

جنس اور تنہائی کا بوہیمین ڈرامہ نگار

عجیب بات ہے کہ لاہور میں ٹینیسی ولیمز کا چرچا اسی روز سب سے زیادہ ہوا جس روز وہ نیویارک کے ایک ہوٹل کے کمرے میں تنہا موت سے ہم آغوش ہو رہا تھا۔ ہوا یوں کہ ۲۵ فروری ۱۹۸۳ء کو سہ پہر کو جشنِ فیض میں مسعود اشعر نے اپنے مضمون میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے بارے میں ولیمز کے ڈرامائی خاکے کے حوالے سے فیض صاحب کا ذکر کیا اور شام کو ٹی ہاؤس میں جب دوستوں کی محفل جمی تو ولیمز پھر موضوعِ سخن بن گیا۔ اس کے ڈرامے کو اردو میں ترجمہ کرنے کی تجویز بھی زیرِ بحث آئی۔ زاہد ڈار نے اِس سلسلے میں میری خدمات پیش کر دیں۔ لیکن اس تجویز کے مجھ تک پہنچنے سے قبل ہی ولیمز کی وفات کی خبر پہنچ گئی۔ یوں نیویارک کے ایک ہوٹل کے کمرے میں ہونیوالے واقعہ نے لاہور کے ٹی ہاؤس کے ادبی فیصلے کو بدل دیا۔ اب ڈرامے کا ترجمہ مسعود اشعر نے کیا ہے اور مجھے ولیمز کے بارے میں چند بنیادی باتیں فراہم کرنے کا فرض سرانجام دینا ہے۔

یہ بات تو وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ٹینیسی ولیمز رواں صدی کے درمیانی برسوں کا ممتاز ڈرامہ نگار ہے اور اسے معاصر امریکی ادبی منظر نامے کا ایک مشہور ترین ادیب بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس امر واقعہ کی وضاحت سے اختلافات کے کئی باب کھل جاتے ہیں۔ تنقیدی جائزے میں اخلاقی عینک

استعمال کرنے والے ولیمز کی جنس پرستی اور تشدد پرستی کی بناء پر اُسے گھٹیا ادیب قرار دیتے ہیں ۔ سُرخ نقاد اُسے زوال پذیر امریکی معاشرے کا نمائندہ سمجھتے ہیں ۔ جب کہ جمالیات کے حوالے سے بات کرنے والے کہتے ہیں کہ انسانی خواہشوں اور مجبوریوں کے اندھیرے گوشوں کی چھان بین کرکے انہیں فنی انداز میں پیش کرنے کے معاملے میں ولیمز معاصر ڈرامہ نگاروں سے بہت آگے ہے ۔ امریکی تھیٹر کا ایک نقاد اسے حالیہ دھائیوں میں براڈوے کا سب سے زیادہ تخلیقی ذہن قرار دیتا ہے جو داخلی تجربے کو فن پارے کی صورت دینے میں لاجواب ہے ۔ دوسرا اُسے عوام الناس کا مقبول اور سستی جذباتیت ابھارنے والا ڈرامہ نگار ٹھہراتا ہے جس نے عوامی مقبولیت کی خاطر اپنے ٹیلنٹ کو داؤ پر لگا دیا ہے ۔ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے نزدیک ولیمز محض کمرشل مصنف تھا ۔ چنانچہ مشہور ہے کہ بعض بے تکلف دوست اسے ٹینیسی ملینیر (MILLIONARE) کے نام سے پکارتے تھے ۔ سنہ ۱۹۶۰ء میں ایک انٹرویو میں اس نے خود بھی دولت کا رسیا ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ مال و زر سمیٹنے سے اس کی خودی کو تقویت پہنچتی ہے اور یہ کہ عمر کے ساتھ ساتھ ہوسِ زر بھی بڑھتی جا رہی ہے ۔

یہ متضاد آرا ولیمز کی اہمیت کم کرنے سے قاصر ہیں ۔ وہ دو چار دھائیوں تک تھیٹر، فلم اور ادب کی امریکی دُنیا میں ممتاز حیثیت کا حامل رہا ہے ۔ عورتوں کی لذت پرستی سے خود لذتی تک ولیمز نے بعد از جنگ کی بے راہ رو نسل کے سبھی مقبول موضوعات پر لکھا ہے ۔ اس کے ڈراموں اور فلموں کو عوامی مقبولیت حاصل رہی ہے ۔ اِس کے باوجود وہ محض پاپولر رائٹر نہیں ۔ سنجیدہ ادب کے چاہنے والے بھی اس کے گرویدہ ہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ شہرت اور دولت کی خواہش کے باوجود ولیمز اپنے کام کے معاملے میں سنجیدہ تھا اور اس کی مقبولِ عام تخلیقات کے پیچھے اس کا کائناتی وژن موجود ہے، چنانچہ

جذبات سے لدے پھندے اس کے ڈراموں کو بھی گہری سچائیوں کے مجازی روپ کا عنوان دینا دشوار نہیں۔

گزشتہ برس ایبسرڈ تھیٹر کا بھوت میرے سر پر سوار تھا۔ اس سلسلے میں ولیمز کے چند ڈرامے بھی نظر سے گزرے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ کامیو، بیکٹ، آدموف یا آئینسکو کے ڈراموں کی طرح انہیں فلسفیانہ قرار دینا انصاف کے خلاف ہے۔ وہ بلاشبہ اپنے ڈراموں میں فلسفیانہ سوالات اٹھاتا تو ہے لیکن ان کی اٹھان اور ٹریٹمنٹ جذباتی ہے۔ تاہم جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، یہ ڈھانچے فکری یا تی مسئلہ سے مملو ہیں۔ چند لفظوں میں اُسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ولیمز زندگی میں اچھائی اور حسن کے فقدان کا قائل ہے۔ اس لیے دنیا کو قبول کرنے سے گریزاں ہے۔ ادب اس کے نزدیک ناپسندیدہ دنیا سے فرار کا وسیلہ ہے۔ ایک جگہ وہ شیخی بگھارنے کے انداز میں کہتا ہے کہ اس نے اس حقیقت کو چودہ برس کی عمر میں ہی دریافت کر لیا تھا۔ بہت سے فن پاروں میں ولیمز نے جدید زندگی کو دوزخ کے منظر نامہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وہ انسان کی اچھائی اور عظمت سے منکر ہے اور اس کے مستقبل کے بارے میں مایوس ہے۔ اس کا ایک کردار خدا کو دریافت کر لیتا ہے ـــ محبت، نیکی، سچائی، انصاف اور حُسن کے خالق کے طور پر نہیں بلکہ ظلم، شر اور قتل و غارت کے جواز کی حیثیت سے۔ ممکن ہے کہ یہ سب کچھ ولیمز کی ذہنی ناپختگی کا ماحصل سمجھا جائے لیکن اس کے ہاں الحاد آمیز رومان پرستی کا ایسا رویہ ملتا ہے جس کا اظہار عموماً معاصر امریکی زندگی کے منفی، جامد اور غیر تخلیقی پہلوؤں کے خلاف بغاوت کے انداز میں ہوتا ہے۔ یہ گویا اُس کے تخلیقی عمل کا مثبت پہلو ہے۔ تاہم وہ ادب میں نظریاتی وابستگی کا قائل نہیں بلکہ ادیب کی زندگی کو اُس کے ادب کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔ عنفوانِ شباب سے ہی غیر وابستہ آوارہ گردی کی آزادی کے رومانی تصورات ولیمز کے تخیل کو گرفت میں لیے رکھتا ہے۔ امریکی شہری زندگی کی

گہما گہمی اور بے معنی بھاگ دوڑ سے اُسے نفرت رہی ہے۔ اس اعتبار سے وہ ریاست ہائے متحدہ کے جنوبی حصے کے عمومی رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔

جنس اور اس کی نفسیاتی وجذباتی الجھنیں ٹینیسی ولیمز کی نگارشات کا مرکزی موضوع ہیں۔ اس کے ڈراموں میں بسا اوقات جنس کو خود اذیتی اور ذات کی شکست وریخت کے عمل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ گذشتہ بارہ تیرہ سال کے دوران میں ولیمز نے اپنی ہم جنس پرستی کا خوب چرچا کیا ہے۔ 'پلے بوائے' کے لیے ایک انٹرویو میں اس نے ۱۹۷۳ء میں کہا تھا کہ میں اٹھائیس برس کی عمر تک صرف صنفِ نازک میں دلچسپی لیتا رہتا تھا۔ پھر میں ایک ہم جنس کی محبت میں مبتلا ہو گیا۔ ادیب کی حیثیت سے یہ بات میرے حق میں بہتر ثابت ہوئی کیونکہ اس کا مطلب آزادی ہے۔ دو سال بعد اس کا آخری اہم ناول MOISE AND THE WORLD OF REASON اور یادداشتوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا۔ ان کتابوں میں جنسی تنہائی کے روگ سے پناہ اور مسرت کے سرچشمے کی صورت میں پیش ہوئی ہے اور مصنف نے ہم جنسیت کے بارے میں بھی کھل کر لکھا ہے۔ اس چرچے کی محرک شہرت کی خواہش بھی ہو سکتی ہے کیونکہ انہی ایام میں لبریشن (GAY LIBRATION) کی تحریک امریکہ میں زور پکڑ رہی تھی۔ تاہم یہ حقیقت ہمیں بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ بچپن ہی سے ولیمز میں اس قسم کے میلانات موجود تھے۔ چنانچہ وہ بتاتا ہے کہ لڑکپن میں محلے کے لونڈے اسے معشوق کہا کرتے تھے۔ اور تو اور اس کا والد بھی اسے زنانہ خیال کرتا تھا اور مس ٹینیسی کے نام سے پکارتا تھا۔

تخلیقی زندگی کا آغاز ٹینیسی ولیمز نے شاعری سے کیا تھا۔ تادم آخر اُس کے ڈراموں میں شاعرانہ عناصر موجود رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ آخری دور میں اسے تخلیقی کاوشوں کے لیے مواد کے حصول میں دشواری پیش آتی رہی ہے۔ اس لیے کبھی تو وہ اپنے آپ کو دہرانے اور کبھی اپنے انتہائی نجی تجربات کو ہی مواد کے طور پر استعمال کرنے پر مجبور ہوا۔ اُس کا پہلا باقاعدہ ڈرامہ قاہرہ۔ شنگھائی اور بمبئی تھا جو

اس نے ڈورتھی شاپرو کے ساتھ مل کر لکھا تھا۔ یہ ڈرامہ ۱۹۳۵ء میں سٹیج ہوا اور اس کی ادبی شہرت کا آغاز مارچ ۱۹۴۵ء میں ڈرامہ THE GLASS MENAGERIE سے ہوا جو نیویارک میں مسلسل ۵۶۱ رات چلا۔ ولیمز کی نگارشات پر سٹرنڈ برگ، لورکا چیخوف، ابسن، ژاں ژینے اور خصوصاً ڈی ایچ لارنس کے اثرات محسوس کئے جا سکتے ہیں۔

ایک بار اس نے کہا تھا کہ میں لارنس کی مانند شہوانی زندگی کے تقدس میں ایمان رکھتا ہوں۔ یہاں ٹینیسی ولیمز کے ایک انٹرویو کے منتخب حصے آپ کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ والٹر ویگر نے یہ انٹرویو جنوری ۱۹۶۶ء میں لیا تھا۔ اس کا کچھ حصہ پلے بوائے کے مارچ ۱۹۶۶ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ مکمل انٹرویو ۱۹۶۹ء میں شائع ہونے والی ویگر کی مرتب کردہ کتاب — YE PLAYWRIGHTS SPEAK میں شامل ہے۔ یہ کتاب لونگ مینز، گرین اینڈ کمپنی نے لندن سے شائع کی ہے۔

سوال: آپ ڈرامے کا آغاز کیسے کرتے ہیں؟ کیا کوئی خیال کافی عرصے تک آپ کے ذہن میں ہلچل مچائے رکھتا ہے؟ یہ بھی بتائیے کہ آیا آپ کے تخیل میں کردار پہلے آتے ہیں اور کہانی بعد میں؟

جواب: کم از کم میرے لیے تو ڈرامے کے آغاز کی نشاندہی کرنا محال ہے۔ میرے نزدیک تمام ڈرامے خود ڈرامہ نگار کی کسی داخلی تشویش سے جنم لیتے ہیں اُسے کسی شے کی فکر دامن گیر ہوتی ہے اور یہی فکر تخلیقی فعالیت کی صورت میں ڈھلنے لگتی ہے۔ کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ میں صبح اٹھتا ہوں اور اپنے آپ کو معمول سے زیادہ مستعد پاتا ہوں۔ تب میں لکھنا شروع کر دیتا ہوں

سوال: قلم سے یا ٹائپ رائٹر سے — آپ لکھتے کیسے ہیں

جواب: ٹائپ رائٹر سے — میں بہت تیزی سے ٹائپ کرتا ہوں۔

سوال : شاید آپ کا مطلب یہ تھا کہ بسا اوقات آپ صبح اٹھتے ہیں اور ڈائیلاگ لکھنا شروع کر دیتے ہیں ۔

جواب : جی ہاں ۔ کبھی کبھی ڈائیلاگ کے ایک یا دو صفحات کرداروں یا سچویشن کی وضاحت کر دیتے ہیں اور یہاں سے میں اپنا راستہ بنا لیتا ہوں ۔ دراصل میں بہت کچھ ضائع کرنے والا مصنف ہوں ۔ کئی ڈرافٹ تیار کرتا ہوں چار پانچ سے پہلے تو میں اپنا کام مکمل نہیں کرتا ۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر ڈرامہ نگار کا یہی حال ہے ۔

سوال : ایلبی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس وقت ڈرامہ تحریر کرتا ہے جب اس کا نہ لکھنا لکھنے سے زیادہ کرب ناک ہو جاتا ہے ۔

جواب : بات کہنے کا یہ انداز خوب ہے ۔

سوال : گویا موضوع خود ہی تخلیقی فعالیت پر مجبور کر دیتا ہے ۔

جواب : جی ہاں ۔ بعض لوگ تحریروں میں ذاتی عنصر کے حادی ہونے کا الزام عائد کرتے ہیں ۔ اصل بات یہ ہے کہ ـــــ میں نہیں سمجھتا کہ لکھتے ہوئے کوئی شخص پرسنل ہونے سے گریز کر سکتا ہے ۔

سوال : ناممکن

جواب : خیر، اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ڈرامہ نگار اپنے ڈرامے کا کردار بن جائے بات صرف یہ ہے کہ کرداروں کی حرکت اور تشویش لکھنے والے کے کسی شخصی تجربے سے متشابہ ہوتی ہے ۔

سوال : میں نے دیکھا ہے کہ آپ کے اکثر ڈراموں میں شاعری ہوتی ہے یا کوئی کردار شاعر ہوتا ہے ۔ مزید براں میں نے آپ کے کسی واقف کار ـــــ سنیٹ [illegible] پوسٹ ڈسپیچ کے سابقہ ڈرامہ نقاد ـــــ سے سنا ہے کہ آپ نے [illegible] نظمیں بھی لکھی ہیں ۔ اس کے باوجود آپ آج کل شاعری کی طرف زیادہ [illegible] ہیں ۔ آخر کیوں ؟ میں نے آپ کی شاعری پڑھی ہے اور

وہ واقعی بہت خوب ہے ۔

جواب: میرا خیال ہے کہ میں کافی شاعری کر چکا ہوں — میرا مطلب ہے کہ نظموں کی صورت میں ۔ اصل میں ڈرامہ بھی نظم جتنا غنائی ہو سکتا ہے ۔ نظم جتنی ذاتی غنائیت کو ڈرامے میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ پھر میرا مشاہدہ یہ بھی ہے کہ ادیب — میرا مطلب ہے کہ شاعر — جب بڑھاپے کی طرف بڑھتے ہیں تو کم شاعری کرتے ہیں ۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ حقیقی شاعری درمیانی عمر کے لوگوں کے مقابلے میں نوجوانوں کے لیے زیادہ مناسب وسیلہ اظہار ہے ۔

سوال: کیا آپ اب بھی کسی مخصوص مذہب سے سرگرم طور پر منسلک ہیں ؟

جواب: ہاں میں اب بھی روسی ساخت کی ایک مقدس شبیہہ اپنے بستر کے قریب رکھتا ہوں ۔ یہ شبیہہ لندن میں ایک دوست نے مجھے سالگرہ کے موقعہ پر دی تھی ۔ یہ ایک بہت خوبصورت روسی شبیہہ ہے ۔ ظاہر ہے کہ کسی مذہبی احساس کے بغیر میں اسے اپنے پاس کیسے رکھ سکتا ہوں ۔ تو یوں سمجھیے کہ میں کسی نہ کسی مذہبی احساس کا حامل ہوں ۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگ اسے غیر ضروری سمجھیں لیکن مجھے تو یہ لازمی محسوس ہوتا ہے ۔

سوال: کیا آپ اس مذہبی احساس کی وضاحت کرنا پسند کرینگے ؟

جواب: بھئی، اس کا تعلق کسی مخصوص چرچ سے نہیں ۔ یہ تو محض کسی برتر وجود پر انحصار کا صوفیانہ نوعیت کا احساس ہے ۔

سوال: مجھے کسی نے بتایا ہے کہ بچپن میں آپ ایک دفعہ صحن میں مٹی کھودنے لگے تھے ۔

جواب: ارے ہاں ۔ میری ماں اکثر یہ کہانی سنایا کرتی تھی

سوال: مٹی کھود کر آپ کیا تلاش کر رہے تھے ۔ شیطان ؟

جواب: ماں نے یہی بتایا تھا — مجھے یقین ہے کہ وہ سچ کہہ رہی تھی

—۔ بہرحال یہ خاصی مضحکہ خیز بات ہے ۔ ماں نے مجھے صحن میں مٹی کھودتے دیکھا تو پوچھنے لگی کہ کیا تلاش کر رہے ہو۔ میں نے جواب دیا کہ شیطان کو ڈھونڈ رہا ہوں ۔

سوال: کیا یہ درست نہیں کہ آپ اب بھی اپنے ڈراموں میں شیطان کی تلاش کر رہے ہیں ؟

جواب: ایک لحاظ سے تو یہ بات ٹھیک ہی ہے ۔ تاہم میں شیطان کی ضد کا بھی متلاشی ہوں ۔

سوال: یعنے فرشتوں کا ،

جواب: خدا کا ۔

سوال: ایک دفعہ آپ نے کہا تھا کہ یہ ڈرامے خیر و شر کی کشمکش کو پیش کرتے ہیں ۔ یعنی نیکی اور بدی کے درمیان انسان کی کشمکش ۔ ہمارے موجودہ سماج کے حوالے سے آپ خیر اور شر کی تعریف کیسے کریں گے ۔

جواب: تعریف کی ضرورت ہی نہیں ۔ یہ تو بالکل واضح بات ہے ۔ ہم سب جانتے ہی ہیں ۔ جب میں صبح اخبار پڑھتا ہوں تو جو کچھ ہو رہا ہے اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا ۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ حالات کس قدر نفرت انگیز ہیں ۔

سوال: چند روز پہلے میں نے آپ کے ڈراموں کا ایک تنقیدی جائزہ پڑھا تھا جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ آپ کے کام پر فرائیڈ کا گہرا اثر ہے ۔ کیا یہ تجزیہ درست ہے ؟ کیا آپ نے فرائیڈ کا کافی مطالعہ کیا ہے ؟

جواب: میں نے فرائیڈ کی ایک دو کتابیں دیکھی ضرور ہیں، لیکن انہیں پڑھا نہیں ۔

سوال: کیا آپ نے یہ باتیں زندگی سے سیکھی ہیں ؟

جواب: جہاں تک فرائیڈ سے میرے تعلق کا معاملہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ فرائیڈ نے انسانی لاشعور کے کئی تاریک گوشوں کو منور کیا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں

کہ میں بھی زیادہ تر اپنے لاشعور سے ہی لکھتا ہوں۔

سوال: اچھا یہ بتایئے کہ آپ دن کے وقت لکھتے ہیں یا رات کے وقت — یعنی آپ نے لکھنے کے لیے کوئی مخصوص وقت طے کر رکھا ہے؟

جواب: میں تو صرف صبح کے وقت ہی لکھ سکتا ہوں۔ اس وقت میں زیادہ توانائی محسوس کرتا ہوں۔

سوال: صبح سویرے یا ناشتے کے بعد؟

جواب: ناشتے کے فوراً بعد۔

سوال: اچھا، اب ایک آدھ سوال دوسرے ڈرامہ نگاروں کے متعلق بھی ہو جائے پہلے یہ بتایئے کہ ماضی میں کن ڈرامہ نگاروں میں آپ نے دلچسپی محسوس کی یا انہوں نے آپ کو متاثر کیا؟

جواب: سٹرنڈبرگ اور چیخوف — یعنی اگر آپ ماضی کے برگزیدہ ڈرامہ نگاروں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

سوال: اب آپ کو کن ڈرامہ نگاروں سے دلچسپی ہے، امریکیوں سے یا غیر ملکیوں سے؟

جواب: ارے بابا نہ امریکی نہ غیر ملکی — میں تو اپنا راستہ بنا چکا ہوں۔ میرے خیال میں جدید امریکی ڈرامہ نگاروں میں ایڈورڈ ایلبی سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔

سوال: کونسی چیزیں آپ کو زیادہ خوف زدہ کرتی ہیں؟

جواب: وہ تمام چیزیں جنہیں آپ اخبار کے پہلے صفحے پر دیکھتے ہیں۔

سوال: تشدد، ظلم اور توہین؟

جواب: یہ تمام باتیں — دیکھئے نا، بے معنی جنگیں جاری ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ کئی باتیں — مثلاً شہری حقوق کی جدوجہد — بنیادی طور پر مجھے سماجی حالات کی اصلاح سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اصل میں یہ کام میں کر ہی نہیں سکتا۔ میرا تعلق تو صرف لفظوں سے ہے اور مجھے شبہ ہے کہ لوگ لفظوں کو اس قدر توجہ سے پڑھتے ہیں کہ وہ انہیں متاثر کر سکیں۔

انٹرویو: مسٹر ولیمز آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے اسقدر وقت دیا۔

ولیمز: مجھے امید ہے کہ یہ گفتگو مفید رہی ہے۔

باقر مہدی

نثری نظم

اب جب کہ جدیدیت کے خلاف ردِّ عمل شروع ہو چکا ہے، دقیانوسیت اور ترقی پسندی مل جل کر "یلغار" کرنے والی ہیں۔ یہ وقفہ جدیدیت کی ایک اہم شاخ نثری نظموں کے مطالعے کے لئے وقف کیا جا سکتا ہے۔ یوں نثر اور نظم ایک دوسرے کے حریف نہیں تھے۔ جب تک نثر نے مناسب ترقی نہیں کی تھی۔ ہم قافیہ نثر کا عام رواج تھا اور پھر نثر اور نظم الگ ارتقائی مراحل طے کرتی رہیں۔ لیکن آزاد نظم کے مقبول ہونے بحور اور اوزان کی پامالی کے بعد تجربہ کا دوسرا قدم نثری نظموں کی طرف بڑھنا لازمی تھا۔ اصل میں ساری بحث زبان کے استعمال کی ہے۔ لفظ اب بھی گنجینۂ معنی کا طلسم ہے اور جب تک ذہن کی پرواز اور دل کی دھڑکن نئی نئی حیرتوں، لذتوں اور تلاش کے لفظی پیکر تراشتی رہیں گی۔ یہ طلسم ختم ہونے والا نہیں ہے۔

عرصہ ہوا ولیم کارلوس ولیم نے کہا تھا "ہم جو کچھ جانتے اور کرتے ہیں سب الفاظ سے جڑا ہوا ہے۔ ہمیں اپنی نثر کی کھڑکی تیز ہوا کے جھونکوں کے لئے کھولنی چاہیئے، اگر ہمیں سنجیدگی سے سوچنا ہے تو یہ بے حد ضروری ہے ہمیں لفظوں تک پہنچنے کے لئے صاف شفاف دُھلے ہوئے الفاظ چاہئیں، اس کی بنیاد میں اخلاقی سوال ہے لیکن سب سے پہلے یہ ایک ٹکنیکی مسئلہ ہے"؛ اس نے اپنی نثری نظم میں اس بات کو یوں بیان کیا ہے۔ اس نظم میں ایک پہاڑی پھول سائکیسی فراج (SAXI FRAGE) کے حوالے سے پتھر میں پھول اگنے کی علامت بڑی خوبی سے پیش کی ہے۔

سانپ کو گھانس کے نیچے
آرام کرنے دو
اور الفاظ کی تحریر آہستہ اور تیز
حملہ کرنے میں تیز، انتظار میں خاموش
بے خواب
استعارے کے ذریعے
عام لوگوں اور پتھروں کو
ملنے دو
اور تخلیق کرو (خیالات نہیں لیکن اشیا ہی) ایجاد
سائیکیسی فراج ـــــــ میرا پھول
یہ چٹانوں میں تشگاف کرتا ہے۔

ولیم کارلوس ولیم کا نثری نظموں کے فروغ میں بڑا اہم رول رہا ہے۔ اس نے اپنی نظموں میں آہنگ کو موسیقی کی بیٹ پر استوار کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ کان کو وہ وسائل فراہم کرتی ہے جس سے زبان بنتی ہے اور جو ہمیں روزانہ سننے کو ملتی ہے۔" یعنی ہم نثری جملے سنتے ہیں اور زبان کی تخلیق نو کے لئے اس کو بول چال کی زبان سے قریب کر کے ایک طرف تو تازگی ملتی ہے دوسری طرف "شعری زیورات" سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔

اردو کی نثری نظمیں راشد کی فارسی زدہ لب ولہجہ کے خلاف بھی ایک خاموش ردعمل ہیں اور ترسیل کی ایک کوشش ہیں۔ ان نظموں میں مروجہ آزاد نظم کے آہنگ سے بھی احتراز کیا گیا ہے اور اس طرح اس یکسانیت کو توڑا گیا ہے جو آزاد نظم کا مقسوم بنتی جا رہی تھی، یہ اس بغاوت کی تکمیل ہے۔ جس کی طرف آزاد نظم نے پہلا قدم جھجکتے ہوئے اٹھایا تھا۔ میں نے سات سال ہوئے اپنے ایک مضمون "جدیدیت اور ترقی پسندی کی کشمکش" میں کہا تھا کہ اردو کی جدید شاعری راشد، میراجی اور اختر الایمان کے اثرات

سے خود کو بچانے میں کامیاب ہو رہی ہے۔

نثری نظموں کا آہنگ موسیقی کی بیٹ (BEAT) ہے تنفس کا زیر و بم، دھڑکن کی خاموش سی آواز اور نقارے کی رک رک کر تیز تھاپ۔ سارا جادو تو الفاظ کو نئے انداز سے ترتیب دینے میں ہے تاکہ کوئی پیکر تراشا جا سکے یا کوئی منظر ایک جھلک دکھا سکے یا کوئی مجرد خیال منجمد ہو سکے، پگھل سکے کاغذ پر لفظ کی شکل و صورت میں۔ غرضیکہ جتنی پابندیاں ٹوٹتی جاتی ہیں نئی نئی بحریں ڈھلتی جاتی ہیں۔ نہ بحر کا آہنگ نہ قوافی کا سہارا۔ اب سب کچھ لفظوں کے استعمال پر منحصر ہے۔ اگر موسیقی کی لے جگانی ہے تو صرف لفظوں کی قطرہ قطرہ بارش سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی امیج کو نغمہ سے ٹکرا کر یوں پیدا کرنا ہے جیسے خواب کے ٹوٹنے کی صدا —— تو الفاظ کی ترتیب بہت مختلف ہوگی۔ نغمگی اور امیج کا امتزاج اور اس آویزش سے پھیلتی ہوئی موسیقی کی لہریں، بہر حال میں نثری نظموں کی اس خوبی کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جن کو "فن پارہ" بننا ہی نہیں ہے کیونکہ یہ انٹی آرٹ (ANTI ART) ہے۔

جب بحث اس منزل پر پہنچ جائے کہ نثری نظمیں ایک نئی شعری زبان کی تخلیق کی کوشش سمجھی جانے لگیں، تب ہی اس کے تجربے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ محمود ایاز نے اعجاز احمد کی نظموں کا تعارف کرتے ہوئے لکھا تھا: "اردو شاعری کا جو نیا دور میراجی اور ان کے ساتھیوں سے شروع ہوا تھا اس کے کوئی تیس سال بعد اعجاز احمد کی شاعری میں اپنے منطقی تسلسل کی دریافت کی ہے۔ ردیف، قافیے سے آزادی اور ان کی مقررہ ترتیب سے انحراف، ایک نظم میں مختلف بحروں کا استعمال ان سب کے بعد اوزان اور بحور سے آزادی، کامل فطری اور متوقع اقدام تھا۔" مجھے اس رائے سے ذرا سا اختلاف ہے اس لئے کہ افتخار جالب اور ان کے ساتھیوں نے یہ تجربہ اعجاز احمد سے شروع کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ میراجی کی نظم "جاتری بنی" میں نثری نظم کی طرف چلنے کا اشارہ ملتا ہے اور ایک معنی میں یہ نظم آنے والے تجربے کا اعلانیہ بھی معلوم ہوتی ہے اس میں اردو زبان اور ہندوستانی سماج ناقابل برداشت حد تک روایتی

تھا اور ہے یہاں معمولی بے ضرر زبان و بیان کے تجربے یوں دیکھے جاتے ہیں جیسے کہ کسی نے مجوہری بم کا تجربہ کیا جا رہا ہو۔

نثری نظموں میں کئی اہم شاعر پیش پیش ہیں۔ یہ نئی نسل کے شاعر پابند اور آزاد نظم دونوں طرح کی نظمیں لکھنے پر قادر ہیں۔ جیسے قاضی سلیم اور بلراج کومل، البتہ نثری نظموں میں اعجاز احمد کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ کامیابی سے مراد وہ شعری لمحات ہے جو ان نظموں کے الفاظ کو ترتیب سے پڑھنے یا سننے والے کو حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح مصوری اور سنگتراشی کے نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں جو کلاسیکی عظمت کے پیمانے اور معیار رد کر چکے ہیں۔ اسی طرح نثری نظمیں قدیم شعری عظمت کی روایات کو یکسر رد کرتی ہیں۔ ان کا مقابلہ کبھی ایوان بنانے والے شاعر جیسے اقبال وغیرہ سے نہیں کرنا چاہیے اور نہ ان شاعروں کو اس کی فکر ہے کہ وہ کوئی "کارنامہ" انجام دے رہے ہیں۔ اعجاز احمد کی ایک نظم ملاحظہ ہو۔

مجھے وہ ہتھیلی یاد رہے گی جس میں سورج ابھرا ہے
نہیں وہ ذہن جو ایک یار کی تلاش میں تھا
میں نے وہ آواز سنی جو چپ چاپ تمہارے پاس بیٹھی رہی
تم ـــــ وہ لفظ کہ خود اپنی تلاش میں تھے
تمہارا چہرہ زمانے کے نام
کہ میں نے پڑھا تو آس پاس کے سب صفحے
تاریک ہو گئے تھے۔
میں فقط
اپنے قدم کا نقش تھا۔

اس میں جو ڈرامائی کیفیت ہے وہی شعر فضا کو بناتی ہے اور امیجری کی ندرت۔ نثری نظمیں بنیادی مسائل پر بھی کسی طمطراق کے ساتھ نہیں اُبھرتی ہیں۔ وہ سرگوشی کے ذریعہ ہم کلام ہوتی ہیں۔ ایک گوشہ نشیں شاعرہ صفیہ ادیب نے بھی تقریباً

دو سونثری نظمیں لکھی ہیں۔ شاید ان کی ایک نظم بھی اب تک شائع نہیں ہوئی ہے اس لئے میں دو نظمیں پیش کر رہا ہوں۔

۱۔ خاموشی کی عادت ڈالو
سکون مل جائے گا
بے آواز خاموشی
ایک بار الفاظ توڑ دو
معنوں کے کرب سے نجات مل جائیگی
ساری جنگیں
آپ ہی آپ رک جائیں گی
میرا المیہ یہ ہے
میں نے الفاظ کو
آخری سچائی جانا ہے۔
میری آنکھوں سے اب
صدف کی بوندیں ٹپکتی رہتی ہیں۔

۲۔ جاگتے رہنے کے بہانے بہت ہیں
تمہارے لئے — جاگتے رہنا
مگر میرا مقدر ہے
کتابوں کے گِلے بھی
مجھ سے دور دور رہتے ہیں
سگریٹ کا جلتا کنارہ
میری دسترس سے باہر ہے
شراب کی مستی

برستی بیلوں سے ٹپکتی ہے
میری یاد کے کرب سے
تو ـــــ تمہیں موٹے ناول ہی اچھے لگتے ہوں گے
میں سادے ورق پر ہی زندہ رہتی ہوں۔

صفیہ ادیب کی نثری نظموں میں لاوے کو موم بنا کر آہستہ آہستہ شمع صفت پگھلانے کی وہ دل خراش کیفیت ہے کہ اس کو پوری طرح محسوس کرنے کے لئے اردو شاعری کو روائتی ماحول سے چھلانگ لگانا ضروری ہے۔ ورنہ یہ سرگوشی اپنی شعریت کو اثر انداز نہ ہونے دے گی۔

اور ابھی کئی اہم نام ہیں جیسے عادل منصوری، شہریار، صادق، ساجدہ زیدی، عین رشید، خلیل مامون، صلاح الدین پرویز، علی ظہیر، یعقوب راہی وغیرہ اس مختصر تحریر میں ان سب کی مثالیں دینا دشوار ہے۔ یہ کام تو ایک تفصیلی مضمون ہی کر سکتا ہے۔ پھر بھی ان میں سے چند نثری نظموں کی جھلک پیش کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ مشتعل حرف اندھیرا اندھا
حرف اندھیرا اندھا
حرف لاحرف تلفظ تنہا ـــــــ (عادل منصوری)

۲۔ تمہارا شعلہ بجھ چکا ہے
اس لئے نہیں کہ ہوا تیز تھی اور مخالف
بلکہ اس لئے کہ تم نے
اُسے ہوا سے دور رکھا ـــــــ (شہریار)

۳۔ میں نے مروّت گھول کے اپنے
جسم کو پھیکا کرنا سیکھا
اتنی بھی امید نہیں اب
تم سے چہرہ مانگ سکوں۔

لاؤ وہ آنکھوں کا بجھتا شعلہ دے دو
راکھ بہت ہے جسم کے اندر ـــــ (علی ظہیر)

۴۔ آؤ اس ایک لمحے کی لذّت میں
ہر آرزو کو سمو دیں
ہر آسودگی سے ملائیں نگاہیں
جس میں دو جسم و جاں
ایک ہی شاخ کے پکتے پھل کی طرح ایسے ٹوٹیں
کہ جیسے شکستِ بدن ہی تکمیل ہے زندگی کی ـــــ (ساجدہ زیدی)

نئی نسل کے جدید شاعروں کے بعد جو جدید تر شاعروں کی صف سامنے آئی ہے۔ وہ نثری نظموں کو اپنا رہی ہے۔ اس لئے بھی کہ اس نے کلاسیکی شاعری کو استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بہرحال بحث کی کلید زبان و بیان پر قدرت میں ہے اور یہیں اس کا کھرا کھوٹا کھلتا ہے اس کے علاوہ جب ایک بار عظیم شاعری کے ستونوں سے نظریں پھیر لی گئیں تو محل اور ایوان بنانے کا خیال بھی خام معلوم ہونے لگا۔ بس ایک لمحاتی کیفیت، ایک ادھورا منظر، خواب کی بیداری، جاگتی آنکھوں کے ٹوٹے سپنے۔ غرضیکہ الفاظ موم بننے اور پگھلنے لگے، یہ پتھر کے ٹکڑے، ہر شے تراشے ہیرے نہیں بنیں گے، اور نہ بننا چاہتے ہیں اس کی دکان نہیں سجے گی، یہ ریت کے ذروں کی طرح چمک کر رہ جائیں گے، ہماری آپ کی زندگی کی طرح۔!

ابھی نثری نظموں کا آغاز ہے، یہ پہلا دور ہی بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ شعری پیکروں کو ڈھالا جائے اور آوازوں کے شور میں صرف ایک ہی سرگوشی ہی گونج کر رہ جاتی ہے۔ نثری نظمیں اور رزمیہ کلاسیکی اور آزاد نظم کے آہنگ اور عبود کے خلاف احتجاج نہیں اور زبان کو نئی تشکیل دینے کی ایک کوشش نہیں خواہ کتنی ہی خام کیوں نہ ہو مگر یہ احتجاج ضروری ہے، میری ایک نثری نظم کی چند سطریں۔

میری نظمیں ـــــ خود فریبی سے آگے نکلتی نہیں
اور میں ـــــ ایک کرم کتابی
تیز آندھی کی ٹوٹی تمنا لئے
کمزور نظموں کی شاخوں سے لپٹا ہوا
زرد پتّوں کو اُڑتے ہوئے دیکھتا ہوں۔!

ڈاکٹر سعید اختر درانی

اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط
مس ویگیناسٹ کے نام

۱۹۰۷ء تا ۱۹۳۳ء

(خطوط کا ماخذ جناب امان اللہ ہوبوہم - سفارتخانہ البانیہ - لندن)

حرفِ آغاز

جنوری ۱۹۸۲ء میں ان خطوط کے بارے میں میرے نزدیک سب سے پہلے ایک اطلاع جناب صہبا لکھنوی مدیر افکار کو دی تھی جسے انہوں نے "افکار" بابت مارچ ۱۹۸۲ء (ص ۹۵-۹۶) میں ایک خط کے طور سے شائع کر دی تھی۔ اس کے بعد اسی سلسلے میں جناب امان اللہ ہوبوہم HERE HERBERT AMANULLAH — (HOBOHUM) کی تقریر پر مشتمل میرا ترجمہ شدہ مضمون "محمد اقبال اور جرمنی — نامہ و پیامِ دل کا" کے عنوان سے "افکار" بابت نومبر ۱۹۸۲ء (ص ۱۷-۲۴) میں چھپ چکا ہے۔ ان دونوں مضامین میں سے ان اہم خطوط کے پس منظر پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے۔

جناب ہوبوہم کی محولہ بالا تقریر جو انہوں نے SCHOOL OF ORIENTAL — AFRICAN STUDIES, LONDON) کے یومِ اقبال منعقدہ ۵ مئی ۱۹۸۲ء کے موقع

پر کی تھی، مس ویگیناسٹ کے نام اقبال کے خطوط کے عکس کے ساتھ SOAS کی طرف سے اس کے شائع ہونے کا اہتمام ہو رہا ہے۔ لیکن شائقینِ اقبال کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کے پیشِ نظر ماہنامہ "افکار" کے توسط سے میں ان خطوط کا اردو ترجمہ پہلی بار پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہوں۔

جناب امان اللہ ہولوہم سے پچھلے جون (۱۹۸۲ء) میں یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ اور میں مل کر ایک سیر حاصل مقالہ علامہ اقبال کے جرمنی کے قیام اور بالخصوص مس ویگیناسٹ کے ساتھ ان کی طویل خط و کتابت کے پس منظر پر لکھ کر ان تمام خطوط کے اصل مسودوں کے عکس کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کر دیں گے جس میں مکمل حوالوں اور تعلیقات و تصریحات کا اہتمام ہوگا لیکن جناب ہولوہم کو (اور خود مجھے) اس دوران میں گوناگوں مصروفیات لاحق رہیں کہ تاحال اس منصوبے پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ چنانچہ پہلے قدم کے طور پر ان خطوط کا ترجمہ اُن کی اجازت کے ساتھ شائع کر رہا ہوں۔

ان غیر مطبوعہ خطوط کے پس منظر کی طرف یہاں صرف ایک دو مختصر اشارے کافی ہوں گے جیسا کہ جناب ہولوہم نے اپنے مضمون "نامہ و پیام دل" کا (مطبوعہ "افکار" نومبر ۱۹۸۲ء) میں بیان کیا ہے۔ اس مجموعۂ خطوط کا کھوج جناب ممتاز حسن مرحوم (جو پاکستان جرمن فورم کے صدر بھی تھے) اور جناب ہولوہم نے، جو اس ادارے کے معتمدِ عمومی تھے) موسمِ گرما ۱۹۵۹ء کے دورۂ جرمنی کے دوران نکالا تھا۔ ان خطوط کی مکتوب الیہا، ہائیڈل برگ میں مختصر قیام (اواخر جولائی ۱۹۰۷ء تا اوائل اکتوبر ۱۹۰۷ء) کے دوران ان کی جرمن زبان کی اتالیق مس ایما ویگیناسٹ (FRAULEIN (=MISS) EMMA WEGENAST) تھیں جن کی طرف ان اصحاب کی توجہ بیگم عطیہ فیضی کی کتاب (IQBAL'S - LETTERS TO ATTIYA BEGUM) کے ذریعے مبذول ہوئی تھی۔ اگرچہ ۱۹۵۹ کے اس دورۂ جرمنی کے دوران جناب ممتاز حسن اور جناب ہولوہم

مس ویگیناسٹ سے ذاتی طور پر نہ مل سکے۔ تاہم اس دورے کے بعد جناب ممتاز حسن نے مس ویگیناسٹ کے ساتھ خط و کتابت کی جس کے نتیجے میں خاتون موصوفہ نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل یعنی ۱۹۶۰ء کی دھائی کے اوائل میں اپنے نام اقبال کے سارے خطوط پاکستان جرمن فورم کے حوالے کر دیئے اور ساتھ ہی یہ درخواست کی کہ انھیں کسی ایسے تاریخی محافظ خانے (ARCHIVES) تک پہنچا دیا جائے جہاں علامہ کی زندگی اور اُن کے کام پر تحقیقات کرنے والے افراد اُن سے بہرہ یاب ہو سکیں، لیکن کسی وجہ سے (جہاں تک اس مترجم کو معلوم ہے) یہ مجموعہ تاحال اقبال میوزیم لاہور یا کسی اور تاریخی محافظ خانے میں برسرِ عام نہیں آسکا۔ چنانچہ موجودہ ترجمے کی اشاعت مکتوب الیہا کی آخری خواہشات کی تکمیل کے مترادف سمجھی جا سکتی ہے۔

جناب ہو یوہم نے اپنی تقریر میں (دیکھیے میرا ترجمہ نامہ و پیام دل کا) بیان کیا ہے کہ جناب ممتاز حسن نے بہ کمال تلطف اس مجموعہ خطوط کی ایک مکمل نقل (یعنی فوٹو کاپی) ان کے لیے تیار کروائی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اُن میں سے دو خطوط کا اصل مسودہ بھی انھیں (یعنی ہو یوہم صاحب کو) عطا کر دیا تھا۔ جناب ہو یوہم کے پاس اس وقت جو خطوط موجود ہیں وہ دو پوسٹ کارڈوں کو ملا کر تعداد میں کل ستائیس (۲۷) ہیں۔ بقول ان کے اس بات کا کافی امکان ہے کہ پچھلے بیس سال کے دوران جو کئی ایک سفر انھوں نے ایک براعظم سے دوسرے اور پھر تیسرے کے درمیان کیے ہیں، ان کے درمیان اس مجموعے کی چند فوٹو کاپیاں گم ہو گئی ہوں۔ انہیں کچھ ہلکی سی یاد یوں آتی ہے کہ کل ملا کر چالیس کے قریب خطوط تھے اور اس کے علاوہ کچھ تصویریں بھی تھیں۔

اِن خطوط کی موجودگی کی اطلاع مجھے پہلے پہل ۱۹۶۸ء میں ہوئی جب میرے ایک کزن کیپٹن (اب کرنل) اسد دُرانی نے جو جرمنی میں اُن دنوں ایک اسٹاف کورس کر رہے تھے برمنگھم میں ایک ملاقات کے دوران مجھے بتایا کہ جرمنی میں وہ ایک

نومسلم جناب ہربرٹ امان اللہ ہو بوہم سے کئی دفعہ مل چکے ہیں جو اس سے پہلے پاکستان جرمن فورم کے ساتھ وابستہ تھے اور اب جرمنی میں آنے والے پاکستان فوج کے افسروں کے ساتھ کسی سرکاری ادارے (غالباً جرمن زبان کی تعلیم کے لیے) سے وابستہ تھے۔ جناب موصوف کی بیگم ایک پاکستانی خاتون تھیں (علامہ اقبال کے دوست مولوی انشاء اللہ ایڈیٹر وطن، کی پوتی اور جناب شیخ عظیم اللہ کی صاحبزادی جنکا انتقال ۱۹۷۵ء میں ہوگیا، کرنل اے۔ درانی نے ۱۹۶۸ء میں مجھے بتایا کہ جناب ہو بوہم کے پاس علامہ اقبال کے چند خطوط موجود ہیں جو انھوں نے اپنی جرمن اُستانی کے نام لکھے تھے۔

پھر یہ بات آئی گئی ہوگئی۔ جب میں نے ۱۹۷۷ء میں عطیہ بیگم کی کتاب (اقبال مترجم عبدالعزیز خالد) پڑھی اور وہاں مس ویگیناسٹ کا مفصّل ذکر پایا اور پھر انہی دنوں فقیر سید وحید الدین کی کتاب IQBAL IN PICTURES دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں مس ویگیناسٹ کے نام اقبال کے ایک پوسٹ کارڈ دتخط مورخہ لندن ۱۶ر نومبر ۱۹۰۷ء کا عکس بھی شامل ہے تو میرے ذہن میں پھر ان خطوط کی یاد تازہ ہوگئی۔

اس سلسلے کی آخری کڑی کرسمس ۱۹۸۱ء کے موقع پر کرنل اسد درّانی کی جرمنی سے ہمارے یہاں آمد ثابت ہوئی جہاں وہ آج کل بون (BONN) میں پاکستانی سفارت خانے میں ملٹری اتاشی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہو بوہم صاحب جرمن سفارت خانہ لندن میں نائب اتاشی برائے تجارت ہیں اور وہ چند دن میں اُن سے لندن میں ملنے والے ہیں۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ مجھے بھی ہو بوہم صاحب سے ملائیں۔ چنانچہ یہ ملاقات ۲ر جنوری ۱۹۸۲ء کو جناب ہو بوہم کے دولت کدے پر ہوئی جہاں انہوں نے کرنل اور بیگم اسد درّانی (یعنی میری ہمشیرہ رخشندہ درانی) کو اور مجھے چائے پر مدعو کیا تھا۔ ملاقات کے دوران جناب ہو بوہم نے علامہ کے وہ خطوط مجھے دکھائے جن کا

اصل مسوّدہ ان کے پاس محفوظ تھا۔ میں نے اس بات کی اہمیت ان پر جتائی کہ ان خطوط کی اشاعت بیحد ضروری ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مرورِ زمانہ سے تلف ہو جائیں۔ میں نے کہا عطیہ فیضی بھی تیس پینتیس سال تک اپنے نام اقبال کے خطوط کو پردۂ خفا میں رکھے رہیں۔ اور پھر بالآخر جب انہوں نے یہ خطوط اور ان کے ساتھ اپنی ڈائری میں سے پس منظر کے اقتباسات شائع کیئے تو اس سے حیاتِ اقبال کے بہت سے بیحد اہم گوشے منظرِ عام پر آ گئے جو اس سے بیشتر پوشیدہ تھے۔ اسی طرح یہ بھی بہت اہم ہے کہ مس ویگیناسٹ کے نام ان کے خطوط بھی شائع کئے جائیں تاکہ ان سے اقبال کی زندگی اور شخصیت کے اہم واقعات وحالات سامنے آسکیں۔ (جناب ہوبوہم سے میری ملاقات کا مختصر حال "افکار" بابت مارچ ۱۹۸۲ء میں میرے مذکورہ بالا خط میں شائع ہو چکا ہے)

مجھے خوشی ہے کہ جناب ہوبوہم نے میری درخواست کو قابلِ اعتنا سمجھا اور اس ملاقات کے چار ماہ بعد مذکورہ بالا تقریر میں اقبال اور جرمنی کے تعلقات پر (نامہ و پیام دل کا) کے عنوان سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے علامہ کے دو خطوط بھی (زیرِ نظر مجموعے کے خطوط نمبر ۲۔ مورخہ مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۰۷ء نمبر ۵۔ مورخہ لندن ۲ دسمبر ۱۹۰۷ء) دبستانِ مشرقی وافریقائی لندن SOAS کی تقریب میں نمائش کے لیے رکھے اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے اس مجموعے کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا جس کا مداحینِ اقبال کو شدت سے انتظار ہے۔

آخر میں ان خطوط کے متن کی اشاعت سے پہلے ان کے ترجمے کے بارے میں چند باتیں عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ان ستائیس ۲۷ خطوط میں سے پہلے سترہ خط جرمن زبان میں ہیں اور آخری دس انگریزی میں۔ اقبال نے جرمن زبان صرف چار پانچ مہینے میں سیکھی تھی چنانچہ ظاہر ہے کہ یہ بہت مبتدیانہ تھی اور اس کا انھیں شدت سے احساس بھی تھا جیسا کہ وہ بار بار اپنے خطوں میں

لکھتے ہیں۔ ان خطوط کے متن کی بڑے پیمانے پر لسانی تصحیح و تہذیب میری بیوی نے کی ہے جو جرمن نژاد ہیں۔ اس کے بعد جرمن زبان میں تحریر کردہ تمام خطوں کا انگریزی میں ترجمہ میری بیٹی انجم فیروز نے کیا ہے جو مجھ سے زیادہ جرمن زبان پر دسترس رکھتی ہیں۔ آخر میں ان خطوں کو اردو کا جامہ میں نے پہنایا ہے۔ اگرچہ میں نے اس امر کا لحاظ رکھا ہے کہ اردو ترجمہ سہل رکھا جائے اور ویسی ہی سطح ہو جس پر اقبال نے جرمن میں انہیں لکھا تھا۔ تاہم میں نے بالعموم ان کی زبان و بیان کی غلطیوں سے درگزر کیا ہے کہ اقبال کی جرمن زبان سے نسبتاً کم واقفیت کو موردِ تضحیک بنانا بالکل نامناسب ہوگا۔

اس حرفِ آغاز کا خاتمہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک میں امان اللہ ہوبوہم کی دخترِ نیک اختر محترمہ شیرین ہوبوہم کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے علامہ کے دستی مسوّدوں کی بڑی دقتِ نظر کے ساتھ قرأت کی ہے اور ان کو ٹائپ میں منتقل کیا ہے۔ موصوفہ کو جرمن زبان پر کامل عبور حاصل ہے (وہ SOAS سے ایم ایس سی کر چکی ہیں) اور اُردو بھی جانتی ہیں۔ یہ ٹائپ شدہ مسوّدہ جناب ہوبوہم نے مجھے نومبر ۱۹۸۲ء میں عطا کیا تھا۔

اس کے بعد قارئین اور اقبال کے خطوط کے درمیان مزید حائل ہونا نہیں چاہتا اور علامہ کے اس شعر پر ختمِ کلام کرتا ہوں ؎

"الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا
غوّاص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے؟"

(سعید اختر درّانی)

خطوط کا ترجمہ

۱

PENSION THURNER　　　　　　　　اقامت خانہ تھرنر

SCHELLING STR 41,　　　　　　　　۴۱۔ تیلنگ سٹراسے میونخ

MUNCHEN　　　　　　　　۱۶ ۔ اکتوبر ۱۹۰۷ء

عزیزہ من فرائیلائین ویگیناسٹ

مجھے آپ کا کارڈ مل گیا ہے ۔ یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ جرمن زبان سے میری محدود واقفیت ہمارے درمیان ایک دیوار کی طرح استادہ ہے ۔

اگر میرے خطوط مختصر ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میرے پاس لکھنے کو کچھ نہیں ہے ۔ بلکہ یہ کہ میرا ذریعہ اظہار ناقص ہے ۔ مزید براں، میں نہیں چاہتا کہ اپنی ٹوٹی پھوٹی جرمن سے آپ کی طبیعت خراب کروں، لیکن یہ رکاوٹ آپ کے لیے موجود نہیں ۔ چنانچہ مجھے آپ سے مکمل اظہار کی اُمید ہے ۔

میں نے اخبار میں ایک اشتہار دے دیا ہے کہ مجھے ایک اچھی استانی کی ضرورت ہے، یہ افسوس کی بات ہے کہ ہائیڈل برگ کے قیام کے دوران میں نے جرمن لکھنے کی مشق نہ کی ۔ یہ وہ پہلی تحریر ہے جو مَیں اس زبان میں لکھ رہا ہوں ۔

خزاں کی دھیمی اور نم آلود ہوا بڑی خوشگوار ہے ۔ موسم بڑا خوبصورت ہے لیکن افسوس کہ ہر حسین چیز کی طرح اس کو بھی دوام نہیں ۔

براہِ کرم جلد خط لکھیے ۔

خدا حافظ

آپ کا دوست

ایس، ایم اقبال (جرمن سے)

ا؎ MEIN LIEBES FRL. WEGENAST　　۲؎ منزل، پرائیویٹ ہوٹل PENSION

FRL — FRAULEIN　　　۳؎ Miss فرائیلائین

۲

اقامت خانہ تھُرمز

۴۱ ۔ تیسلنگ سٹراسے ۔ میونخ

۲۳ ؍ اکتوبر ۱۹۰۷ء

عزیزۂ من فرائیلائین ویگیناسٹ

یہ آپ کا بڑا کرم تھا کہ آپ نے (خط)[1] لکھا لیکن بہت مختصر ۔ میں اُس وقت تک آپ کو نہیں لکھوں گا جب تک آپ مجھے وہ خط نہیں بھیجتیں جو آپ نے پھاڑ ڈالا ہے ۔ یہ بڑی بے رحمی ہے ! آپ ہائیڈل برگ میں تو ایسی نہیں تھیں شاید ہائیل برون (HILEBRON) کی آب و ہوا نے آپ کو بے مہر بنا دیا ہے ۔

میں زیادہ لکھنا چاہتا تھا مگر ...... وہ خط ۔ آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میرا خط پھاڑ ڈالیں[2]

آپ کا بہت مخلص[3]

ایس ۔ ایم اقبال

نوٹ : لفافے پر یہ پتہ لکھا ہے

FRL. EMMA WEGENAST

HONISEN STRASSE 16

HIELBRONN

ٹکٹ پر میونخ کی مہر ہے ۔ (جرمن سے)

---

[1] اقبال ان خطوط میں عموماً اسی طرح تحریر کرتے ہیں ۔ میں نے ترجمے میں "خط" کا اضافہ کیا ہے ۔

[2] غالباً اس سے مراد وہ خط ہے جو اقبال کے نام لکھا گیا تھا ۔

[3] یہاں اقبال نے انگریزی میں YOURS VERY SINCERELY لکھا ہے ۔

۳

اقامت خانہ نفر مز
۴۱۔ تشیلنگ سٹراسے۔ میونخ
۲۷ر اکتوبر ۱۹۰۷ء

عزیزۂ من مس ویگیناسٹ

مَیں آپ کے خط کے لیے شکرگزار ہوں۔ مجھے میونخ بڑا پسند آیا ہے۔ جناب رائنز . . . . نے یہاں اپنی ایک جاننے والی کو لکھا تھا اور انھوں نے میرے لیے ایک استانی ڈھونڈ لی ہے۔ اگرچہ اس مکان میں جرمن زبان بولنے کا کوئی موقعہ میسر نہیں آتا۔ تاہم میں اپنی دونوں استانیوں کے ساتھ کافی گفت گو کرلیتا ہوں۔ کل ہم لوگ ایک آرٹ کی نمائش[1] دیکھنے کے لیے گئے۔ وہاں اتنی بہت سی خوبصورت تصویریں ہیں کہ انسان خود کو ایک دنیائے خواب میں محسوس کرتا ہے۔ ہم نے وہاں دو گھنٹے گزارے اور میری استانی جو آرٹ کی سمجھ رکھتی ہیں میرے لیے ایسی باتوں کی وضاحت کرتی رہیں جن سے مَیں اس سے پہلے بے خبر تھا۔

کل مجھے محترمہ پروفیسر صاحبہ کا خط موصول ہوا۔ انہیں جناب رائنز سے اطلاع ملی تھی کہ مَیں اس اقامت خانے سے خوش نہیں ہوں۔ میں نے انہیں لکھا ہے کہ جو شخص اقامت خانہ شیر رٹھ میں رہ چکا ہو اُسے کوئی اقامت گاہ پسند نہیں آسکتی۔

آج میں باہر نہیں نکل سکتا۔ موسم خوشگوار نہیں ہے۔ براہ کرم میری بھدی جرمنی زبان کا بُرا مت مانیے اور نہ اس کا جو میں نے اپنے پہلے خط میں لکھا تھا۔ امید ہے آپ بالکل بخیریت ہوں گی۔ مجھ میں سوچنے اور صحیح جرمن زبان لکھنے کا یارا نہیں ہے۔

آپ کا دوست
ایس ایم اقبال

---

[1] شاید یہ KUNST AUSSTELLUNG = ART EXHIBITION

۴

لندن
۱۶ر نومبر ۱۹۰۷ء

عزیزۂ من مس ویگیناسٹ[۱]

مجھے آپ کا خط مل گیا ہے۔ لیکن میں ابھی تک جم کر نہیں بیٹھ سکا ہوں۔ ٹھہر کر لکھوں گا۔

دلی نیک تمنائیں

اقبال

۵

معرفت طامس کک اینڈ سن
لڈگیٹ سرکس
لندن

C/O MESSRS THOMAS
COOK & SON,
LUDGATE CIRCUS LONDON

۲ر دسمبر ۱۹۰۷ء

2ND. DEC. 07

عزیزۂ من فرائیلائین ایما[۲]

مجھے آپ کا خط موصول ہو گیا ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ میں اپنی جرمن زبان بھول گیا ہوں۔ میں بہت مصروف تھا۔ میں بہت مصروف تھا اور زیادہ نہ سیکھ سکا[۳] آپ انگریزی کیوں نہیں سیکھ لیتیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ

میونخ کی مشہور آرٹ گیلری ARTE PINAKOTHEK ہے۔

[۲] PENSION SCHERER (ھائیڈل برگ)

[۳] ANGESIEDET = SETTLED

[۱] اس پوسٹ کارڈ کا عکس فقیر وحیدالدین کی کتاب "اقبال ان پکچرز" میں موجود ہے۔

[۲] MEIN LIEBES FRL. EMMA

[۳] یہ لفظ پڑھا نہیں جا سکا۔ یہ لفظ PERNEN (سیکھنا ہے) یا PESEN پڑھا جا سکتا ہے

میرے لیے آپ کو لکھنا اور اپنے دل کی بات کہنا بہت آسان ہو جائے گا
میرا خیال تھا کہ میں ہائیل براون ——— HEIL BROWN کے راستے (میونخ سے) سفر کر سکوں گا، لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔ میرے لیے یہ قطعی لازم تھا کہ میں پانچ نومبر کو لندن میں ہوں۔ پروفیسر آرنلڈ مصر گئے ہیں اور میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا ہوں۔ میرے ذمے ہفتے میں دو لکچر ہیں۔

میں زیادہ لکھ یا کہہ نہیں سکتا۔ آپ تصور کر سکتی ہیں کہ میری روح (؟) میں کیا ہے۔ میری بہت بڑی خواہش یہ ہے کہ میں دوبارہ آپ سے بات کر سکوں اور آپ کو دیکھ سکوں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا کروں۔ جو شخص آپ سے دوستی کر چکا ہو اُس کے لیے ممکن نہیں کہ آپ کے بغیر وہ جی سکے۔ براہِ کرم میں نے جو لکھا ہے اس کے لیے مجھے معاف فرمائیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس قسم کے اظہار جذبات کو پسند نہیں کرتیں۔

براہ کرم جلد لکھیے اور سب کچھ۔ یہ اچھا نہیں کہ کسی شخص کا کچھ بگاڑا جائے جو آپ کا کچھ نہیں بگاڑتا۔

آپ کا مخلص [1]

ایس۔ ایم اقبال (جرمن سے)

۶

معرفت مس کک اینڈ سن
لیڈگیٹ سرکس
لندن ای سی
۲۰ جنوری ۱۹۰۸ء

عزیزۂ من مس ویگیناسٹ

میں آپ کی تصاویر کے لیے ہزار گونہ شکریہ ادا کرتا ہوں جو کل شام مجھے

---

[1] یہاں انگریزی میں YOURS SINCERELY لکھا ہے۔

موصول ہوئیں ۔ یہ آپ کی بڑی کرم فرمائی ہے ۔ دونوں تصویریں بڑی خوبصورت ہیں ۔ اور وہ ہمیشہ میرے مطالعے کے کمرے میں میری میز پر رہیں گی ۔ لیکن یہ مت باور کیجئے کہ وہ صرف کاغذ ہی پر نقش ہیں بلکہ وہ میرے[1] ـــــ میں بھی محفوظ ہیں اور تاحیات وہیں رہیں گی ۔

شاید میرے لیے یہ ممکن نہ ہو گا کہ میں دوبارہ آپ کو دیکھ پاؤں .....
لیکن میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ آپ میری زندگی میں ایک حقیقی قوت بن چکی ہیں ۔ میں آپ کو کبھی فراموش نہ کروں گا اور ہمیشہ آپ کے لطف وکرم کو یاد رکھوں گا ۔

میں اپنی جرمن زبان بالکل بھول چکا ہوں ۔ آپ ہی کیوں انگریزی نہیں سیکھ لیتیں ؟ ـــ یوں ہم ایک دوسرے کی بات بہتر طور پر سمجھ سکیں گے ۔
براہِ کرم جلد خط لکھیے جونہی میری فوٹو گراف بنتی ہے میں آپ کو اپنی تصویر بھیج دوں گا ۔

خدا حافظ میری عزیزہ مس ایما اور ہمیشہ مجھے یاد رکھیے ۔

آپ کا
ایس ایم اقبال (جرمن سے)

لفافے پر پس تحریر : میں دونوں تصویریں اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں

---

[1] اقبال نے صرف ..... تحریر کیا ہے ۔ یہ جرمن لفظ H E X Z کانیڈ ہی ہو سکتا ہے ۔

۷

معرفت طامس کُک والیبر
لڈگیٹ سرکس
لندن ای۔سی
۲۱ر جنوری ۱۹۰۸ء

میری عزیزہ مِس ایمّا

کیا آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں تغافل شعار ہوں؟ یہ بالکل ناممکن ہے.....
جب آپ کا پچھلا خط پہنچا تو میں بہت بیمار تھا اور اس نے مجھے اور بھی بیمار کر ڈالا۔ کیونکہ آپ نے لکھا تھا کہ آپ نے بڑے طوفانوں میں سے گزرنے کے بعد اپنی آزادی دوبارہ حاصل کر لی ہے۔ میں یہ سمجھا کہ آپ میرے ساتھ مزید خط وکتابت نہیں کرنا چاہتیں اور اس بات سے مجھے بڑا دکھ ہوا۔ اب مجھے پھر آپ کا خط موصول ہوا ہے اور اس سے مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے۔ میں ہمیشہ آپ کے بارے میں سوچتا ہوں اور میرا دل ہمیشہ بڑے خوبصورت خیالوں سے معمور رہتا ہے؛

ایک شرارے سے ایک شعلہ اٹھتا ہے اور ایک شعلے سے بڑا الاؤ روشن ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ تغافل کیش ہیں۔ غفلت شعار ہیں آپ جو جی میں آئے کیجئے۔ میں بالکل کچھ نہ کہوں گا اور ہمیشہ صابر وشاکر رہوں گا۔

شاید جب ہندوستان کو روانہ ہوں گا تو آپ سے ملاقات کر سکوں گا۔ میں اپنی تمامتر جرمن بھول چکا ہوں۔ آپ انگریزی کیوں نہیں سیکھ لیتیں؟

آپ کا

اقبال

(جرمن سے)

۸

معرفت ٹامس کک وپسر
لڈگیٹ سرکس
لندن ای سی
۲۶ ر فروری ۱۹۰۸ء

عزیزۂ من مس ویگیناسٹ

میں ہر چیز کے لیے معذرت خواہ ہوں مجھے اس قدر مصروفیت رہی کہ میں آپ کو خط نہیں لکھ پایا ہوں۔ آپ ایسی فرشتہ خصلت ہیں کہ میں امید رکھتا ہوں کہ آپ مجھے معاف کر دیں گی۔ آج شام مجھے ایک لکچر دینا ہے "تصوف"۔ چند روز ہوئے مجھے محترمہ پروفیسر صاحبہ کا خط موصول ہوا۔ ان کا ایک فرانسیسی طالب علم لندن میں تھا اور ہم دونوں نے مل کر پروفیسر صاحبہ کو ایک خط لکھا آپ انگریزی کیوں نہیں سیکھ لیتیں؟ مجھے آپ کے کانوں کو اپنی بھونڈی جرمن سے گراں بار کرنے پر شرم آتی ہے۔ بہر حال میں اس خط و کتابت کو جرمن زبان کے سبق لینے کا ایک بہانہ سمجھتا ہوں۔ سو آپ مجھے اب تک درس دے رہی ہیں میں جولائی کے اوائل میں ہندوستان لوٹ رہا ہوں اور تمنا ہے کہ اپنے اس سفر سے پیشتر مجھے آپ سے ملنے کا موقع حاصل ہو سکے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ چند روز کے لیے ہائیڈل برگ آسکوں، لیکن اگر ممکن ہو تو کیا آپ پیرس میں مجھ سے مل سکتی ہیں؟ آپ ہائیڈل برگ کب آئیں گی۔ جناب رائنر HERR (REINER) کہاں ہیں؟ وہ مجھے بالکل خط نہیں لکھتے۔ میں دو مرتبہ انہیں لکھ چکا ہوں۔ شاید وہ بیحد مصروف ہیں۔ آپ تمام دن کیا کرتی ہیں؟ کیا آپ مطالعہ کرتی ہیں یا سہیلیوں کے ساتھ وقت گزارتی ہیں۔

آپ کی تصویر میری میز پر رکھی ہے اور ہمیشہ مجھے سہانے دنوں کی یاد دلاتی ہے جو میں نے آپ کے ساتھ گزارے تھے۔

ایک "تسبیحِ خیالات" خوش آئند کے ساتھ

آپ کا

ایس ۔ ایم اقبال (جرمن سے)

۹

معرفت طامس کک اینڈ کمپنی
لڈگیٹ سرکس
لندن ای ۔ سی
۳ر جون ۱۹۰۸ء

عزیزۂ من مس ویگیناسٹ

مجھے آپ کا خط ملا اور میں فوراً جواب لکھ رہا ہوں ۔ شاید آپ کو میرا جواب موصول نہیں ہوا ہے ۔ آپ کے پوسٹ کارڈ کے لیے بہت شکریہ ۔

براہ کرم جلد لکھیے اور مجھے بتائیے کہ آپ کیا کر رہی اور سوچ رہی ہیں ۔ آپ میرے خط کا انتظار کیوں کرتی ہیں ؟ میں ہر روز آپ سے اطلاع پانے کی آرزو رکھتا ہوں ۔ مس فیضی[۱] اپنی بہن اور برادرِ نسبتی کے ساتھ یہاں ہیں جو ایک ہندوستانی نواب[۲] ہیں ۔ میں چند روز ہوئے ان سے ملنے گیا تھا ۔ وہ بخریت اور خوش و خرم ہیں ۔ شاید وہ جرمنی جائیں گی ۔

میں بہت مصروف ہوں ۔ جلد انگلستان سے رخصت ہو رہا ہوں ۔ آغاز جولائی میں ، مجھے معلوم نہیں کہ آیا میرا جرمنی کے رستے سفر کرنا ممکن ہوگا ۔ یہ میری

---

[۱] مس عطیہ فیضی

[۲] اقبال نے ہندوستانی شہزادہ لکھا ہے ۔ مِس فیضی اپنے بھائی ڈاکٹر فیضی کے ہمراہ اگست ۱۹۰۷ء کے اواخر میں اقبال سے ملنے ہائیڈل برگ گئی تھیں جہاں وہ مِس ویگیناسٹ سے متعارف ہوئیں ۔ ملاحظہ ہو "اقبال از عطیہ بیگم" مترجمہ عبدالعزیز خالد (مترجم)

بہت بڑی تمنا ہے کہ میں ہندوستان لوٹنے سے پہلے آپ سے ملاقات کرسکوں ۔ بے رحم نہ بنیے ۔ پلیز جلد خط لکھیے اور تمام احوال بتائیے ۔ میرا جسم یہاں ہے میرے خیالات جرمنی میں ہیں ۔ آج کل بہار کا موسم ہے ۔ سورج مسکرا رہا ہے ۔ لیکن میرا دل غمگین ہے ۔ مجھے چند سطریں لکھیے ، آپ کا خط میری بہار ہوگا ۔ میرے دلِ غمگیں میں آپ کے لیے بڑی خوبصورت سوچیں ہیں ۔ اور یہ خاموشی سے ایک کے بعد ایک آپ کی طرف روانہ ہوتی ہیں ۔ یہ ہیں آپ کیلئے میری تمنائیں ۔

آپ کا

اقبال (جرمن سے)

۱۰

معرفت طامس کک وپسر

لڈگیٹ سرکس

لندن ای ۔ سی

۱۰ ر (دہم) جون سنہ ۱۹۰۸ء

عزیزہ من مس ویگیناسٹ

مَیں آپ کو پہلے لکھ چکا ہوں اور آپ کے خط کا منتظر ہوں ۔ خط کے ساتھ میں اپنی ایک تصویر ملفوف کر رہا ہوں ۔ شاید میں ایک اور تصویر آپ کو بھیجوں ۔

آپ کا

ایس ایم اقبال (جرمن سے)

پس تحریر : میں ۲ ر جولائی[1] کو ہندوستان روانہ ہو رہا ہوں اور وہاں سے خط لکھوں گا ۔

---

[1] اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں ۔

۱۱

49 - ELSHAM RD.
KENSINGTION W
LONDON

۴۹ - ایلشم روڈ
کینسنگٹن غرب
لندن
۲۰ر جون ۱۹۰۸ء

عزیزۂ من میس ایما

میں نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ جرمنی کے رستے سفر کرسکوں ...... لیکن یہ ممکن نہیں ہے ۔ میں تین جولائی لے کو انگلستان سے روانہ ہوں گا اور چند روز پیرس میں رکوں گا جہاں مجھے کچھ کام ہے ۔

براہ کرم فوراً لکھیے ۔ میں ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے آپ کا خط پانے کا متمنی ہوں ۔ میں اگلے سال یورپ واپس آنے اور آپ سے ملنے کی امید رکھتا ہوں ۔ مت بھولیے کہ اگرچہ کئی ملک اور سمندر ہمیں ایک دوسرے سے جدا کریں گے پھر بھی ہمارے درمیان ایک غیر مرئی رشتہ قائم رہے گا ۔ میرے خیالات ایک مقناطیسی قوت کے ساتھ آپ کی طرف دوڑیں گے اور اس بندھن کو مضبوط بنائیں گے ۔ ہمیشہ مجھے لکھتی رہیے گا اور یاد رکھیے گا کہ آپ کا ایک سچا دوست ہے، اگرچہ وہ فاصلہ دراز پر ہے ۔ جب دل ایک دوسرے کے قریب ہوں تو

لے حاشیہ صفحۂ گذشتہ و ہٰذا ۔

میرے اندازے کے مطابق اقبال جولائی کی ۸ ر یا ۱۰ ر تاریخ کو انگلستان سے روانہ ہوئے ہوں گے ۔ یکم جولائی کو انہیں بارایٹ لا کی ڈگری ملی ۔ ۳ ر جولائی کو انھوں نے جناب ایف ڈبلیو تھامس کے نام اپنے مطبوعہ نفیس دایران میں علم مابعد الطبیعات کا ارتقاء کا ایک نسخہ (لندن) میں معنون کیا ۔ یہ نسخہ اب میرے پاس ہے ۔ ۲۷ ر جولائی کو وہ لاہور پہنچے ۔ اٹلی یا فرانس سے بمبئی تک جہاز کے سفر میں ان دنوں گیارہ سے تیرہ دن لگتے تھے ۔

تو فاصلہ کچھ معنی نہیں رکھتا ۔ براہِ کرم فی الفور لکھیے ۔

آپ کا

ایس ۔ ایم اقبال

پس تحریر : مجھے جناب خنقرلے کی بیماری کا سُن کر بڑا افسوس ہوا ہے میں نے ان سے کہا تھا کہ صحت کا خیال رکھیں ۔

(جرمن سے)

۱۲

سیالکوٹ شہر

ہندوستان

۳ر ستمبر ۱۹۰۸ء

عزیزۂ من مس ویگیناسٹ

میں یہاں پہنچ گیا ہوں ۔ یہ بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ میں انگلستان سے رخصت ہونے سے پہلے آپ سے مل نہ سکا ۔ براہِ کرم جلد لکھیے کہ آپ ان دنوں کیا کر رہی ہیں ؟ میں نے لاہور میں اپنے پیشے کے آغاز کرنے کا فیصلہ کیا ہے وہ ایک وکیل کے لیے اچھی جگہ ہے ۔ میرا خیال ہے کہ آپ ہائیڈل برگ میں ہوں گی ۔ براہ کرم جناب اور محترمہ پروفیسر صاحبان کو میرا سلام دیجیے اور جب آپ لوگ ایک ساتھ ہوں تو مجھے یاد کیجیے گا ۔

یہاں بڑی بارشں[1] ہوئی ہے ۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہے اور مزید کی توقع ہے ۔ میں اپنی ساری جرمن زبان بھول گیا ہوں ۔ لیکن مجھے صرف ایک لفظ یاد ہے ...

...... ایمّا

آپ کا

ایس ۔ ایم اقبال (جرمن سے)

HERE CHANFER ؎1

؎2 اگلے صفحہ پر

۱۳

لاہور ہندوستان
۱۱ر جنوری ۱۹۰۹ء

عزیزۂ من مس ایما

آپ کے پُر تلطّف خط کے لیے بیحد شکریہ
یہ آپ کا بڑا کرم ہے کہ آپ نے مجھے لکھا اور مجھے یاد رکھا جب کہ میں جرمنی سے اس قدر دور ہوں۔ مجھے ہائیڈل برگ سے آپ کا کوئی خط موصول نہیں ہوا۔ شاید آپ کا خط گُم ہو گیا ہے اور مجھے یہ جان کر بڑا افسوس ہوا ہے کہ میرا خط (بھی) رستے میں گُم ہو گیا ہے۔

جب مَیں ہندوستان پہنچا تو میرے ہم وطنوں نے مجھے بہت بڑا اعزاز بخشا۔ میرے لیے اس کا لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ ملک کے ہر گوشے سے مجھے چالیس کے قریب نظمیں بھیجی گئیں ...... دوستوں اور دوسرے لوگوں کی طرف سے خوش آمدید کے طور پر۔ جب میں لاہور پہنچا تو لوگوں نے مجھے سونے کا ہار پہنایا۔ بمبئی سے لے کر لاہور اور سیالکوٹ تک ہر اسٹیشن پر ہزارہا لوگ جمع تھے جہاں میں نے دیکھا کہ بہت سے نوجوان اور بزرگ راستے کے اسٹیشنوں پر میری نظمیں گا رہے تھے۔

حاشیہ صفحہ گزشتہ

ے اقبال نے اصل جرمن لفظ GEREGNET بمعنی HAS RAINED لکھا ہے جو مفہوم کے لحاظ سے بے معنی ہے۔ دیگر خطوط GEREGELT میں بھی اسی نوع کی غلطیاں ہیں جو اس لیے قابل درگزر ہیں کہ اقبال نے بیشتر خطوط میں جرمن زبان پر کامل عبور نہ ہونے کا تذکرہ کیا ہے اور مس ویگیناسٹ کو اکثر لکھا کہ وہ انگریزی کیوں نہیں سیکھ لیتیں۔
(مترجم)

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ جب میں گھر پہنچا تو میرے والدین بالکل صحت مند تھے میری بہنیں اور والدہ بڑی مسرور ہیں کہ اب میں اُن کے پاس ہوں۔

مَیں اب لاہور میں ہوں اور یہاں ایڈوکیٹ کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ یہ میرے لیے ممکن نہیں کہ میں کبھی آپ کے خوبصورت وطن کو بھول سکوں جہاں میں نے بہت کچھ سیکھا اور ــــــ براہِ کرم مجھے ہمیشہ لکھتی رہیئے گا شاید ہم دوبارہ جرمنی یا ہندوستان میں ایک دوسرے سے مل سکیں۔ کچھ عرصے بعد جب میرے پاس کچھ پیسے جمع ہو جائیں گے تو میں یورپ میں اپنا گھر بناؤں گا۔ یہ میرا تصور ہے اور میری تمنّا ہے کہ یہ سب پورا ہو۔

جناب خاؤبال [1] کے انتقال کی خبر سنکر بڑا افسوس ہوا۔ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے اُن کی صحت کے بارے میں اُن سے کتنی بار تذکرہ کیا تھا ــــ براہِ کرم اپنے اُس دوست کو مت بھولیے جو آپ کو ہمیشہ دل میں رکھتا ہے، اور جو آپ کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ ھائیڈل برگ میں میرا قیام مجھے ایک خوبصورت خواب سا لگتا ہے، اور میں اس خواب کو دُہرانا چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ آپ خوب جانتی ہیں۔

نیک خواہشات کے ساتھ

آپ کا

ایس۔ ایم۔ اقبال بارایٹ لا

لاہور (ہندوستان)

---

[1] شاید یہ خط نمبر ۱۱ مورخہ ۲۷ جون ۱۹۰۸ء HERR CHAUBAL کے CHAMFAR ہی ہیں اگرچہ دونوں جگہ ہجے مختلف ہیں۔

۱۴

لاہور (ہندوستان)
۲۰ رجولائی سنہ ۱۹۰۹ء

عزیزہ من فرائیذ لین[۱] ایما

یہ آپ کی بڑی نوازش ہے کہ آپ نے مجھے یاد کیا ہے۔ مجھے آپ کا خط پاکر (ہمیشہ) بہت ہی مسرت ہوتی ہے اور میں بیتابی سے اُس وقت کا منتظر ہوں جب میں دوبارہ آپ کے وطن میں آپ سے مل سکوں گا۔ براہِ کرم مجھے ہمیشہ ہمیشہ لکھتی رہیئے۔ مجھے جرمنی پسند ہے۔ اس نے میرے آدرشوں پر بہت اثر کیا ہے اور میں جرمنی میں اپنا قیام کبھی فراموش نہ کروں گا۔ میں یہاں بالکل اکیلا رہتا ہوں اور خود کو بڑا غمگین پاتا ہوں۔ ہماری تقدیر ہمارے اپنے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ ایک ایسی عظیم قوت ہے جو ہماری زندگیوں کو منظم کرتی ہے۔ محترمہ پروفیسر صاحبہ، پروفیسر صاحب اور تمام خواتین و حضرات کو میں ہمیشہ اپنے دل میں رکھتا ہوں۔ آہ! وہ دن جب میں جرمنی میں تھا۔

مس فیضی بمبئی میں ہیں۔ ان کی والدہ انتقال کر گئی ہیں اور وہ بہت غم زدہ ہیں۔ اب وہ کچھ بہتر ہیں۔ بعض اوقات میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرتا ہوں اور میرے دل میں یورپ اور بالخصوص جرمنی کو دوبارہ دیکھنے کی بڑی آرزو پیدا ہو جاتی ہے۔ براہِ کرم مجھے اپنے دل اور یادوں میں ایک چھوٹی سی جگہ دیجئے۔

آپ کا دوست
ایس۔ ایم اقبال بار ایٹ لاء
(جرمن سے)

۱۔ یہاں پورا لفظ FRAULEIN لکھا ہے۔

۱۵

لاہور۔ ہندوستان

۲۲ ستمبر ۱۹۱۰ء

عزیزۂ من مس ویگیناسٹ

مجھے آپ کا نوازش نامہ موصول ہو گیا ہے جس کے لیے مَیں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آج ڈاک کا دن ہے لیکن بد قسمتی سے میں بہت مصروف ہوں۔

اگلے ہفتے میں آپ کو طویل (تر) خط لکھوں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ممکن ہو گا یہ پوستین ایک قیمتی بھیڑ کی ہے[1] یہ دراصل ایک اور کوٹ کے کالر اور بازوؤں کے لیے ہے۔

دلی تمناؤں کے ساتھ

محمد اقبال

بار ایٹ لا (جرمن سے)

۱۶

لاہور

۱۱ مئی ۱۹۱۱ء

عزیزۂ من فرائیلائین ویگیناسٹ

آپ کا خوبصورت پوسٹ کارڈ مجھے مل گیا ہے۔ اور اس کے لیے میں آپ کو اپنے دلی شکریے بھیجتا ہوں۔ میری بڑی تمنا ہے کہ جرمنی کا دوبارہ سفر کروں تاکہ آپ سے مل سکوں اور (= مگر) مَیں نہیں جانتا کہ یہ کس دن ممکن ہو سکے گا۔ لیکن میرے خطوط آپ کو اُس "ظالم" جرمن زبان کی وجہ سے کافی دل لگی کا سامان بہم پہنچاتے ہوں گے۔

---

[1] یہ پوستین انھوں نے بطور تحفہ بھیجی تھی۔

وہ خوبصورت ٹائیاں [1] مجھے مل گئی تھیں۔ میں بیحد شرمندہ ہوں کہ میں اس قدر مصروف تھا کہ آپ کو لکھ نہ سکا اور اپنا شکریہ نہ بھیج سکا۔ جب آدمی کوئی زبان نہیں لکھ سکتا تو اس کا قلم بہت دل شکستہ ہوتا ہے اور ایسے انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ اپنے شکریے کا پورا اظہار کر سکے۔ میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے کہ اپنی جرمن صحیح کر سکوں۔ براہِ کرم میری غلطیوں کو معاف فرمایئے لیکن مہربانی کر کے ایک طویل خط لکھیے۔ مجھے امید ہے کہ محترمہ پروفیسر صاحبہ بخریت ہوں گی۔

آپ کا دوست

محمد اقبال (جرمن سے)

۱۷

آپ کے خط کے لیے بہت شکریہ۔ براہِ کرم مجھے لکھیے کہ آپ کیسی ہیں؟ ان دنوں لاہور میں بے حد گرمی ہے۔ ہم ایک دوزخ میں رہ رہے ہیں۔ مَیں جرمنی کو کبھی نہ بھول سکوں گا۔

اقبال

۴ جولائی ۱۹۱۲ء

محترمہ پروفیسر صاحبہ کا کیا حال ہے؟ میرے خیال میں گھر [2] بھرا ہوا ہوگا

بر دلّی کی جامع مسجد ہے [3] (جرمن سے)

---

[1] یہ ٹائیاں مس ویگیناسٹ نے اقبال کو بطور تحفہ بھیجی تھیں

[2] گھر سے مراد غالباً ہائیڈل برگ کے ہوسٹل PENSION SCHERER سے ہے جس کا ذکر خط نمبر ۳ میں بھی ہے۔

[3] اس خط پر اقبال کا پتہ درج نہیں۔ یہ تحریر ایک پوسٹ کارڈ پر ہے جس کی پشت پر جامع مسجد دہلی کی تصویر چھپی ہے۔ ایک ایسا ہی غیر مطبوعہ پوسٹ کارڈ میرے پاس موجود ہے جو انھوں نے ۱۹۰۹ء میں اپنے استاد پروفیسر طامس آرنلڈ کو لندن بھیجا تھا۔

۱۸

لاہور

۳۰ جولائی ۱۹۱۳ء

ڈیر مس[1] ویگیناسٹ

مجھے آپ کے والد صاحب کی وفات کی خبر سُنکر بے انتہا صدمہ ہوا ہے ۔ اور میرا خط اس افسوسناک سانحے کے بہت دنوں بعد آپ تک پہنچے گا ۔ تاہم اس اندوہناک نقصان پر آپ کے ساتھ مجھے جو ہمدردی ہے اس کی شدت کو نہ وقت کم کرسکتا ہے نہ فاصلہ ، اس خبر سے مجھے حقیقتاً بیحد دُکھ ہوا ہے اور میں خدائے تعالےٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس بزرگ اور قابلِ احترام ہستی پر اپنے انعام و اکرام کی بارش کرے ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون[2] یہ وہ آیتِ مقدسہ ہے جو ہم کسی کی وفات کی خبر سنکر پڑھتے ہیں اور آپ کا غمناک خط پڑھ کر میں نے یہ آیت دُہرائی ایسے سانحات ہر شخص کی زندگی میں ضرور رو پذیر ہوتے ہیں اور یہ لازم ہے کہ ہم اپنے مصائب کا مقابلہ اُسی پامردی سے کریں جیسا کہ اُن لوگوں نے کیا جن کی زندگیاں ہمارے لیے شمعِ ہدایت ہیں ۔

آپ کو یاد ہوگا کہ گوئٹے نے اپنے لمحۂ موت پر کہا تھا " مزید روشنی " موت مزید روشنی

---

[1] غالباً اپنے جذبات کے اظہار کے لئے اقبال نے یہ خط انگریزی میں لکھا ہے اور پھر اس کے بعد جتنے خط مس ویگیناسٹ کو لکھے ہیں وہ سب انگریزی میں لکھے ہیں کیونکہ وہ جرمن زبان میں اپنے جذبات کے صحیح طور پر اظہار کرنے سے قاصر تھے ۔ اس خط میں پہلی مرتبہ انہوں نے MISS یعنی DEAR MISS WEGENIAST لکھا ہے ۔ (مترجم)

[2] اس آیت کا اقبال نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے ۔ VERILY WE ARE FOR GOD AND TO GOD WE RETURN

کی طرف ایک نئی راہ وا کرتی ہے اور ہمیں اُن مقامات تک لے جاتی ہے جہاں ہم ابدی حُسن و صداقت کے روبرو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مجھے وہ وقت بخوبی یاد ہے جب میں نے گوئٹے کی شاعری آپ کے ساتھ پڑھی اور مجھے اُمید ہے کہ آپ کو بھی وہ اچھے دن یاد ہوں گے جب ہم روحانی طور سے ایک دوسرے کے اس قدر قریب تھے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ یہاں تک کہ میں روحانی لحاظ سے آپ کا شریکِ غم ہوں۔

جب آپ کی طبیعت خط لکھنے کو چاہے تو براہ کرم مجھے ضرور لکھئے۔ کاش میں جرمنی میں ہوتا تاکہ اپنی ہمدردی مَیں ذاتی طور سے آپ تک پہنچا سکتا۔ فی امان اللہ

ہمیشہ آپ کا محمد اقبال

ایڈووکیٹ لاہور (انگریزی سے)

۱۹

لاہور

۷ جون ۱۹۱۴ء

عزیزہ من فرائیلائین ویگیناسٹ

مجھے کچھ عرصہ ہوا آپ کا خط ملا تھا جسے پاکر مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ بد قسمتی سے علالت کی وجہ سے میں اس سے پہلے اس کے جواب سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ مَیں آپ کو آپ کی خوبصورت زبان جرمن میں نہیں لکھ سکتا ہوں۔ اگلے روز مَیں ھائنے[1] کا مطالعہ کر رہا تھا اور مجھے وہ پُرمسرت دن یاد آ گئے جب ہائیڈل برگ میں محترمہ پروفیسر صاحبہ کے یہاں ہم دونوں اُس کو ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ وہ کیا اچھی بزرگ خاتون تھیں! امید ہے کہ وہ بخیریت ہوں گی۔ اگر آپ کی اُن سے کہیں ملاقات ہو تو میرا اسلام انہیں دیجیے گا۔

---

[1] انیسویں صدی کا مشہور جرمن شاعر

میں یہ جاننے کے لیے مضطرب ہوں کہ آپ ان دنوں کیا کر رہی ہیں اور آپ کے کیا ارادے ہیں (اگر ہیں تو) ہو سکتا ہے میں اگلے سال یورپ آؤں لیکن اس کا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ سب حالات پر منحصر ہے[1] اگر میں واقعی یورپ آیا تو اس دیارِ قدیم جرمنی کا بھی پھر سفر کروں گا اور آپ سے دوبارہ ہائیڈل برگ یا ہائل براؤن (HEIL BROWN) میں ملاقات کو آؤں گا جہاں سے ہم دونوں ایک ساتھ اس عظیم دانشور گوئٹے کے مزار مقدس کی زیارت کو جائیں گے۔

اگرچہ مجھے آپ کے بھائی اور بہنوں کے ساتھ ملاقات کا شرف کبھی حاصل نہ ہوا تھا۔ پھر بھی بالضرور اُن کو میرا سلام پہنچائیے۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال (انگریزی سے)

۲۰

لاہور (ہندوستان)

دس ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء

عزیزہ مس فرائیلائین ویگیناسٹ

آخر کار وہ ہولناک جنگ اب ختم ہو گئی ہے اور چار سال کی طویل خاموشی کے بعد مجھے دوبارہ آپ کو خط لکھنے کا موقع حاصل ہوا ہے۔ آپ کا ملک ایک عظیم آزمائش سے گذرا ہے اور میں اُمید کرتا ہوں کہ جلد ہی وہ اپنے اُن نقصانات کو پورا کر سکے گا جو اس جنگ سے اُسے پہنچے ہیں۔ اس تمام عرصہ میں آپ کی اور آپ کے عزیزوں اور بالخصوص آپ کے بھائیوں[2] کی سلامتی کے

---

[1] اس خط کے چند ہفتوں بعد اگست ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی اور مس ویگیناسٹ کے درمیان پانچ سال تک خطوط کے تبادلے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

[2] اس خط میں اقبال نے BROTHERS لکھا ہے جبکہ پہلے خط میں صرف بھائی تحریر کیا ہے۔

متعلق بہت تشویش میں رہا ہوں۔ براہِ کرم جلد از جلد مجھے اپنے اور اپنے بھائیوں کے حالات کے بارے میں تفصیل سے لکھیئے۔ جرمن قوم کو واقعی بہت بڑی قربانیاںلہ دینی پڑی ہیں

میں یہ خط انگریزی میں لکھنے پر بڑا معذرت خواہ ہوں لیکن میں اس بات کو ترجیح دیتا ہوں کہ آپ کو اس خط کا ترجمہ کرانے کی زحمت اٹھانی پڑے، بہ نسبت اس کے کہ میں اپنی غلط سلط اور بھونڈی جرمن سے آپ کے سامعہ کو گراں بار کروں۔

براہِ کرم ہائیڈل برگ والی محترمہ پروفیسر صاحبہ کے بارے میں بھی اطلاع دیجئے۔ کیا آپ کو جناب رائنر (HERR REINER) صاحب کی طرف سے بھی کوئی خبر وغیرہ ملتی ہے؟ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟

آپ کا مخلص

محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا (انگریزی سے)

۲۱

۱۱۳۔اے۔ سینٹ جیمز کورٹ
بکنگھم گیٹ۔ ایس ڈبلیو
۱۵ر اکتوبر ۱۹۳۱ء ع ۲ ص

عزیزہ من فرائیلائین ویگیناسٹ

یہ جناب مٹزوتھ (HERR METZOTH) سے کی بڑی کرم فرمائی تھی کہ

لہ پہلی جنگ عظیم نومبر ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی مگر انگلستان اور جرمنی میں صلح نامے پر دستخط ۲۸ر جون ۱۹۱۹ء کو ہوئے۔

عہ اقبال دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن گئے تھے چنانچہ اس خط پر لندن کا پتہ درج ہے۔

سہ اگلے صفحہ پر

انھوں نے مجھے آپ کا موجودہ پتہ بہم پہنچایا جو مجھے آج صبح موصول ہوا اور یُوں میں آپ کو خط لکھنے کے قابل ہوا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ خط آپ کو اُن پُرمسرت دنوں کی یاد دلائے گا جو ہم نے ہائیڈل برگ سکول یعنی "شیرر منزل" میں ایک ساتھ بسر کیے تھے۔ براہِ کرم مجھے خط لکھیے اور ان سارے برسوں کے دوران اپنی مصروفیات اور حالات سے مطلع کیجئے۔ مجھے آپ کا جواب پاکر مسرت ہو گی۔ فی الحال ہمیں لندن میں کافی عرصہ رُکنا پڑے گا اور جب لندن کی گول میز کانفرنس ختم ہو جائے گی تو اس کے بعد میرا ارادہ برلن کے راستے روم جانے کا ہے جہاں مجھے کچھ روز ٹھہرنے اور چند پرانے دوستوں سے ملاقات کرنے کا موقعہ ملے گا۔
سالہاسال کے بعد آپ سے مل کر مجھے بے اندازہ خوشی ہو گی۔ مجھے اطلاع دیجئے کہ کیا ابھی کچھ عرصہ آپ ہائیڈل برگ ہی میں قیام رکھیں گی۔

آپ کے خط کا منتظر

محمد اقبال (انگریزی سے)

۲۲

۱۱۳ اے۔ سینٹ جیمز کورٹ
بکنگھم گیٹ۔ ایس ڈبلیو ۱
۲۰ر اکتوبر ۱۹۳۱ء

عزیزہ من فرائیلائین ویگیناسٹ

یہ آپ کا غایت درجہ تلطف تھا کہ آپ نے مجھے خط لکھا۔ مجھے آپ کا خط آج صبح سویرے اُس وقت ملا جب میں ابھی بستر ہی میں تھا۔ میں نے اسے ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ میں اُسے پاکر بہت خوش ہوا تھا اور کچھ اس لیے کہ میں اسے پوری طرح سمجھ سکوں۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوتی

حاشیہ صفحہ گزشتہ

۳ے۔ ان صاحب کا نام عطیہ بیگم کی کتاب اقبال میں ملتا ہے لیکن اس خط اور کتاب کے ہجے مختلف ہیں۔

کہ باوجود اُن تمام آلام ومصائب کے جن سے آپ کو دوچار ہونا پڑا ہے، آپ زندگی سے خندہ پیشانی سے عہدہ برآ ہو رہی ہیں۔ مَیں ہائیڈل برگ کے وہ ایام کبھی فراموش نہ کرسکوں گا جب آپ نے مجھے "فاؤسٹ" پڑھایا اور دیگر کئی طرح سے میری مدد کی تھی۔ وہ کیا ہی بہجت افزا دن تھے! مجھے آپ کے خط سے معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنے وقت کی مختار نہیں ہیں۔ چنانچہ میں پوری کوشش کروں گا کہ میں ہائیڈل برگ آؤں اور آپ سے اس پرانے مقام پر ملاقات کروں۔ مجھے اب تک دریائے نیکر یاد ہے جس کے کنارے پر ہم دونوں ایک ساتھ گھوما کرتے تھے۔ لیکن فی الحال کوئی بات پختہ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ جلد ہی میں آپ کو یہ اطلاع دے سکوں گا کہ آیا روم مَیں جاتے ہوئے رستے میں جرمنی سے گزر سکتا ہوں۔ مجھے روم سے ایک دعوت موصول ہوئی ہے اور میں بالآخر ہندوستان کی واپسی سے پہلے وہاں جانا چاہتا ہوں۔

مجھے یہ کہنے کی بالکل ضرورت نہیں کہ میری بڑی ہی آرزو ہے کہ مَیں پھر آپ سے ملوں اور اُن پُرمسرت دنوں کی یادیں تازہ کروں جو افسوس کہ اب ہمیشہ کے لیے گزر چکے ہیں۔ دریں اثنا مجھے تاکید سے خط لکھیے گا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال (انگریزی سے)

پس تحریر: میں اب پروفیسر نہیں ہوں۔

۲۳

۱۱۳۔اے سینٹ جیمز کورٹ

بکنگھم گیٹ۔ ایس (کذا) ڈبلیو[۱]

۱۹ر نومبر ۱۹۳۱ء

---

[۱] سے مراد N.W.1 یعنی شمالی مغربی لندن

مائی ڈیئر مس ویگیناسٹ

یہ آپ کی بڑی کرم فرمائی تھی کہ آپ نے خط لکھا اور میں آپ سے ہائیڈل برگ میں ملنے کے لیے محوِ انتظار تھا۔ لیکن مجھے بڑے افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دینی پڑتی ہے کہ میرے پروگرام میں بعض ایسے ضروری تغیرات یکایک رونما ہو گئے ہیں کہ جن کے پیشِ نظر اب میرے لیے جرمنی کیلئے سفر کرنا ممکن نہیں رہا۔[1] میں سید ھا روم جا رہا ہوں جہاں جناب مارکونی نے (SIGNOR MARCONI) مجھے مدعو کیا ہے اور وہاں سے میں ۷ دسمبر کو منعقد ہونے والی موتمرِ عالمِ اسلامی میں شرکت کرنے کے لیے یروشلم[2] روانہ ہو رہا ہوں۔ اس امر سے مجھے بے اندازہ خوشی حاصل ہوتی کہ میں زندگی میں ایک مرتبہ پھر آپ سے مل سکتا اور پرانی صحبتوں کو پھر زندہ کر سکتا، لیکن یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ یہ بات ناممکن ہو گئی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ میں شاید اگلے سال پھر یورپ آؤں۔ اگر ایسا ہوا تو میں امید کرتا ہوں کہ آپ سے ملنے کے لیے ہائیڈل برگ آنے کی پوری کوشش کروں گا۔ براہِ کرم میرا صمیم قلب سے بھیجا ہوا اسلام قبول کیجیے اور یہ اپنی سہیلیوں کو بھی پہنچائیے جن سے آپ نے ہائیڈل برگ میں میرا تعارف کرایا تھا۔ گاہے بگاہے تاکید سے مجھے میرے لاہور۔ ہندوستان کے پتے پر خط لکھا کیجیے۔ جیسا کہ فارسی کی ایک ضرب المثل ہے، خط نصف ملاقات ہے۔ اُمید ہے کہ آپ ہر طرح سے بخوبت ہیں۔

آپ کا مخلص محمد اقبال

(انگریزی سے)

---

[1] اقبال دوسری گول میز کانفرنس کے اختتام سے چند روز پیشتر ہی ۲۱ نومبر ۱۹۳۱ء کو لندن سے ٹرین کے ذریعے (پیرس کے راستے) کیسنے روانہ ہو گئے اور مس ویگیناسٹ سے ملاقات اور جرمنی جانے کی شدید خواہش کے باوجود وہ جرمنی نہ جا سکے جس کا اظہار اس خط میں ملتا ہے۔ (مترجم)

[2] روم میں ایک ہفتہ قیام کے بعد اقبال نے قاہرہ میں چند روز قیام کیا اور پھر یروشلم

۲۴

لاہور[۱] - ۱۷ جنوری ۱۹۳۲ء

عزیزہ من فرائیلائین ویگیناسٹ

مجھے آپ کا خط کل موصول ہوا۔ اور میں نے اس کے مندرجات بڑی مسرت کے ساتھ پڑھے۔ مجھے بیحد افسوس ہے کہ میں جرمنی نہ آ سکا اور اُن سہانے دنوں کی یادیں تازہ نہ کر سکا جو میں نے آپ کی اور کچھ دیگر احباب کی معیت میں ہائیڈل برگ میں بسر کیے تھے۔ میرے یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں ہے کہ ان تمام برسوں میں مَیں نے آپ کو کبھی فراموش نہیں کیا اور میرے دل میں ہمیشہ یہ تمنا رہی ہے کہ میں دوبارہ آپ سے ملوں گا لیکن جیسا کہ بخت تیرہ کو منظور تھا ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اُن دنوں کی یاد جب ہم گوئٹے کا فاوسٹ ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے، ہمیشہ ایک غم انگیز مسرت کے ساتھ میرے دل میں آتی رہتی ہے۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو بتاؤں کہ ان تمام سالوں کے دوران میں کیا کرتا رہا۔ سو چند الفاظ سنیئے۔ میں نے بہت کچھ لکھا ہے اور وہ تمام چیزیں جو میں نے بطور شاعری اور فلسفے کے لکھی ہیں وہ میں نے شائع کر دی ہیں۔ تاہم میرے ذہن نے ہمیشہ ایک کمی سی محسوس کی ہے اور خود کو اپنے ان ہندی گرد و نواح میں تنہا سا پایا ہے۔ جوں جوں میری عمر بڑھ رہی ہے اس تنہائی کا احساس بھی فزوں تر ہوتا جاتا ہے، لیکن سوائے تسلیم و رضا کے ہمارے لئے اور کوئی چارۂ کار نہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ

پہنچے جہاں انہوں نے موتمر عالم اسلامی میں شرکت فرمائی

[۱] ۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء کو اقبال بمبئی پہنچے جہاں بیگم عطیہ فیضی نے اُن کے اعزاز میں (ایوان رفعت میں) ایک خصوصی دعوت کا اہتمام کیا۔ مختصر قیام کے بعد وہ اسی شام ٹرین سے لاہور کیلئے روانہ ہوئے اور ۳۰ دسمبر کو صبح پہنچ گئے

اور میں نے پوری تسکینِ دل کے ساتھ اپنی قسمت کو قبول کیا ہے۔

یہ بات باعث تاسف ہے کہ میں جرمن زبان کے ساتھ اپنا رابطہ قائم نہیں رکھ سکا ہوں۔ لیکن میں ہمیشہ آپ کے خطوط کو جرمن لغت کی مدد سے پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہو جاتا ہوں۔ بجائے اس کے کہ کسی اور سے ان کا ترجمہ کرواؤں اپنے خطوط کسی اور کو دکھانا اچھا نہیں ہوتا۔ مجھے چاہے آپ کا خط ختم کرنے میں تین دن لگیں، پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں کہ اسے بطورِ خود ایک لغت کی مدد سے سمجھ پاؤں، لیکن میں نہیں چاہتا کہ یہ کسی اور کو دکھاؤں۔ اور میں نے ہمیشہ یہی طریقِ کار اختیار کیا ہے۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ آپ اپنی بہن کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ایک مرتبہ اُن کی تصویر دیکھی تھی۔ جو آپ نے مجھے دکھائی تھی۔ براہ کرم انہیں اور اپنے اُن دوسرے دوستوں کو میرا سلام کہیئے جن سے میں جرمنی میں ضرور ملا ہوں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ میں دوبارہ یورپ آؤں گا اور اگر میں آیا تو میں بالالتزام آپ سے اور آپ کی ہمشیرہ سے ہائیڈل برگ ملنے آؤں گا۔ جرمنی میرے لیے ایک طرح سے دوسرا روحانی وطن تھا۔ میں نے اُس ملک میں بہت کچھ سیکھا اور بہت کچھ سوچا تھا۔ گوئٹے کے وطن نے میری روح کے اندر ایک دائمی گھر حاصل کر لیا ہے۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گی۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال (انگریزی سے)

۲۵

۱۲ر دسمبر ۱۹۳۲ء۔ کوئین اینز مینشنز
سینٹ جیمز پارک۔ لندن ایس ڈبلیو ۱

عزیزہ من فرائیلائن ویگیناسٹ

میں ایک مختصر عرصے کے لیے دوبارہ انگلستان میں ہوں[1]۔ اور یہ خط دریافت کرنے کے لیئے لکھ رہا ہوں کہ آیا آپ تاحال ہائیڈل برگ اسٹاوبن سٹراسے نمبر ۱۴[2] ہی میں مقیم ہیں۔ امید ہے آپ ہر طرح بخیریت ہوں گی۔ ازراہ کرم جلد خط کا جواب دیجیئے گا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال (انگریزی سے)

۲۶

۲۹ دسمبر ۱۹۳۲ء کوئین اینز مینشنز

سینٹ جیمز پارک۔ لندن۔ ایس ڈبلیو

عزیزہ من فراایبلائین ویگیناسٹ

آپ کے خط کے لیے شکریہ۔ میں لندن سے ۳۰ دسمبر کو روانہ ہوں گا۔ میرے موجودہ پروگرام کے مطابق میں ہائیڈل برگ ۱۸ جنوری ۱۹۳۳ء کو رات کے دس بجکر تیئیس منٹ (۲۳-۱۰ شب) پہنچوں گا اور بائرشر ہوف[3] ہوٹل میں ٹھہروں گا۔ ہائیڈل برگ میں میرے قیام کا واحد مقصد آپ سے اتنے سال گزرنے کے بعد دوبارہ ملنا ہے۔

میں آپ سے ملاقات کا بڑے اشتیاق کے ساتھ منتظر ہوں

آپ کا مخلص محمد اقبال (انگریزی سے)

۱۔ اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کیلئے بمبئی سے بذریعہ جہاز روانہ ہوئے اور وینس سے ٹرین کے ذریعے پیرس پہنچے اور مختصر قیام کے بعد اوائل نومبر ۱۹۳۲ء میں لندن میں قیام فرما ہوئے۔ تیسری گول میز کانفرنس ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو شروع ہوئی۔

۲۔ 14 - STALLEN

۳۔ BAYERISCHER HOF

۲۷

میڈرڈ۔ ۱۲؍جنوری ۱۹۳۲ء

میں جنوبی ہسپانیہ کے دورے کے بعد آج میڈرڈ واپس پہنچا ہوں۔ افسوس کہ میرے لیے اس مرتبہ ہائیڈل برگ آنا ناممکن ہو گا۔ مجھے وہ سارے ٹکٹ منسوخ کرنے پڑے جو میں نے لندن میں خریدے تھے۔ کیونکہ میرے لیے لازمی ہے کہ میں وینس سے دس فروری ۱۹۳۲ء کو روانہ ہونے والے جہاز (کونتے وردی) CONTE - VERDI سے سفر کروں۔

ہو سکتا ہے کہ میں اپریل میں پھر انگلستان آؤں۔

آپ کا

محمد اقبال (انگریزی سے)

حرفِ آخر

گول میز کانفرنس کے خاتمے کے بعد علامہ اقبال دسمبر کے آخر میں ٹرین کے ذریعے لندن سے پیرس گئے جہاں وہ برگساں سے ملے۔ اس کے وہ سیدھے میڈرڈ چلے گئے۔ وہ نہ جانے ہائیڈل برگ کے رستے کیوں نہ گئے جو پیرس سے اتنا دور نہ تھا۔ شاید کانفرنس کے کچھ اور مندوبین مثلاً سید امجد علی وغیرہ ان کے ساتھ ہوں اور انھیں اپنے ہمسفروں کے ساتھ اپنا پروگرام تبدیل کرنا پڑا ہو۔

میڈرڈ کے بعد بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید (سرگزشتِ اقبال ص ۲۲۳-۲۱۹) علامہ اقبال روم بھی گئے جہاں وہ مسولینی سے ملے، لیکن ہو سکتا ہے کہ خورشید صاحب کو مغالطہ ہوا ہو چونکہ علامہ ۲۷؍ نومبر ۱۹۳۱ء کو (یعنی دوسری گول میز کانفرنس کے خاتمے کے بعد) مسولینی سے مل چکے تھے۔ (دیکھیے 'سفرنامہ اقبال' از محمد حمزہ فاروقی ص ۱۲۶-۱۲۱)۔ بہر حال علامہ اقبال وینس سے دس فروری کو جہاز

سے روانہ ہو کر بمبئی اور پھر ۲۵ فروری ۱۹۳۳ء کو لاہور پہنچ گئے۔ اس کے بعد وہ اپریل میں دوبارہ لندن نہ گئے (جہاں شاید گول میز کانفرنس کی کچھ اور کاروائیاں ہو رہی تھیں) اور نہ وہ پھر بعد میں کبھی یورپ جا سکے۔ انھیں ۱۹۳۳ء میں اواخر میں لارڈ لوتھین کی طرف سے آکسفورڈ یونیورسٹی میں RHODES LECTURES دینے کی دعوت ملی تھی اور پھر ۱۹۳۵ء میں لیکچر دینے کا فیصلہ بھی ہو گیا تھا، لیکن علامہ اقبال اپنی طویل بیماری کی وجہ سے بالآخر یہ دعوت قبول نہ کر سکے اور یہ لیکچر منسوخ کرنے پڑے۔ اس طرح علامہ کو باوجود اپنی تمام تر خواہش کے زندگی بھر دوبارہ جرمنی جانے اور ریس ویگیناسٹ سے ملنے کا موقع نہ مل سکا۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

(برمنگھم سے)

تعارف و ترجمہ: اُنیس الرحمٰن
شعبہ انگریزی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ۲۵

نائپال کے رُو برُو

کہتے ہیں کہ کوئی مشہور ادیب جب کہیں جاتا ہے تو اس سے پہلے اس کی شہرت وہاں پہنچ جاتی ہے۔ معاملہ کسی ایسے ادیب کا ہو جس کے حصے میں شہرت اور تہمت کا تناسب برابر رہا ہو تو اس کی راہِ سفر بھی ذرا مختلف ہو جاتی ہے۔ وی۔ ایس نائپال کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس نے اپنی راہ میں ہر طرف کانٹے بچھا لیے ہیں اور اپنی کوئے ملامت چھوڑ کر انگلستان میں جا بسا ہے۔ یہ شاید اس کے مسائل کا ایک حل بھی ہے اور ان سے فرار کی ایک صورت بھی۔ اس کا جنم ویسٹ انڈیز میں ہوا، اصلاً وہ ہندوستانی نژاد ہے۔ اب سے کوئی اکتیس برس پہلے وہ ہندوستان آیا تھا اور یہ تاثر لے کر گیا تھا کہ یہاں نہ آیا ہوتا تو بہتر تھا۔ نہ اس کے "وطن" نے اسے قبول کیا، نہ اس نے اپنے وطن کو۔ اس کے کسی ناقد نے اس سفر کا ذکر تمثیلی پیرائے میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ رام جب بن باس سے لوٹے تو سیتا بھی ان کے مقدر میں نہ تھی۔ بعض ناخوش گوار تجربات ہر پھر کر آدمی کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ نائپال بھی کسی نہ کسی بہانے بار بار ہندوستان آیا۔ جو تھا سفر اب سے کوئی آٹھ برس پہلے اس وقت ہوا جب ایک لمبی کالی رات ہم پر مسلط تھی INDIAL — اور AN AREA OF DARKNESS (1964) A WOUNDED CIVILI AATION (1977) — نائپال کے پہلے اور چوتھے سفر کی ناخوش گوار یادوں، تاثرات اور تجربات سے بھری پڑی ہیں اور انہیں پڑھ کر

بہت سے قارئین کے منہ کا مزاہ خراب ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ نائپال کی باتیں بھی بہت اشتعال انگیز رہی ہیں مثلاً یہ کہ: لوگ بے ایمان، غیر مہذب ہیں، فسانہ طرازی کی عادت نے ترقی کی راہیں مسدود کر رکھی ہیں۔ کرم KARMA کا تصور غلط بنیادوں پر قائم ہے۔

نائپال اس بات پر مصر ہے کہ مکانی حوالوں کے واسطے سے اس کے فن پاروں کو نہ پرکھا جائے۔ لیکن فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر نگاہ کئے بغیر کوئی کلّی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ اس کے مختلف ناولوں مثلاً A HOUSE FOR The Biswas (1961), The Mystic Masseur (1957) اور In a Free State (1971) وغیرہ میں اس کے ہیروز یہی ایک دائمی کشمکش اور تلاش و جستجو میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی تحریریں احتجاج اور آزادی کا اعلان نامہ ہیں اور وہ اسی حوالے سے نو آبادیاتی نظام کی کشمکش سے فرار اور ذاتی آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اب اس کی شناخت پہلے سے مختلف ہے گو اب بھی اس کی وحشت اسے دیس دیس لیے پھرتی ہے جیسے اس کے ناول The Mimic Men (1967) کا ہیرو انت دشاؤں کا مسافر ہے۔ اپنی ایک حالیہ کتاب میں اس نے پاکستان کے سفر کے تاثرات لکھے ہیں اور ہر بار کی طرح اخباروں کی شاہ سرخیوں میں اس کا ذکر آیا ہے۔

کچھ دشمن نائپال کی تحریروں نے پیدا کئے۔ کچھ اس کی گفتگو نے۔ ذیل کا انٹرویو جسے BERNARD LEVIN نے لیا تھا، اس کے دوسرے انٹرویو کی طرح متنازعہ بھی ہے اور جارحانہ بھی۔ سب سے پہلے اُسے B.B.C نے نشر کیا تھا پھر LISTNER نے شائع کیا اور وہاں سے یہ دوسرے اخبارات اور رسائل تک پہنچا۔ اس میں کئی باتیں نائپال کے آبائی وطن ہندوستان سے متعلق ہیں۔ اور ایک بار پھر اعتراضات اور سخت تر تنقیدوں کا بازار گرم ہے۔ تیسری دنیا کا

یہ ادیب اپنی دنیا سے غیر متعلق کیوں ہے؟ ہماری روایات کا بے لوچ اور بے جا ناقد کیوں ہے؟ جدید سائنسی ترقیات کے آگے ہمارے ماضی اور ہماری روحانیت کا منکر کیوں ہے؟ اس انٹرویو سے یہ تمام سوالات اُبھرتے ہیں۔

نائپال کی کئی باتوں سے اتفاق نہ تو ممکن ہے نہ ضروری۔ لیکن یہ اعتراف بہرحال کرنا پڑے گا کہ زبان و بیان اور تکنیک کے اعتبار سے وہ انگریزی زبان کا ایک اہم ادیب ہے۔ آپ اس ادیب کو کس خانے میں رکھیں گے؟ (ا ر ر)

سوال: کیا آپ ٹرینیڈاڈ (TRINI DAD) میں پیدا ہوئے؟

جواب:۔ جی ہاں، میں وہیں پیدا ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بڑی غلطی تھی۔

س: آپ نے ایسا سوچنا کب سے شروع کیا؟

ج: بہت پہلے سے۔ میں کسی خوبصورت جگہ پر جانا چاہتا تھا۔ مجھے وہاں کی آب وہوا پسند نہ تھی مجھے وہاں کی روشنیاں پسند نہ تھیں۔ وہاں کی گرمی پسند نہ تھی دمہ کا وہ عارضہ پسند نہ تھا جو اس موسم نے مجھے بخشا تھا۔ مجھے اپنے آس پاس نسلی کشاکش اور تناؤ کا وہ ماحول پسند نہ تھا۔ یہ معاملہ جتنا افریقیوں کے ساتھ تھا اتنا ہی یورپیوں کے ساتھ بھی تھا۔ میں ان سب سے آزادی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مجھے نہ تو وہاں کی موسیقی پسند تھی اور نہ وہاں کی شوخ آوازیں۔ مجھے بس یہ احساس تھا کہ میں کسی غلط جگہ پر ہوں۔

س: شاید آپ کے آس پاس آپ ہی کے خاندان کے افراد تھے جو سب کے سب ہندوستانی تھے؟

ج: جی ہاں، لیکن میں خارجی دنیا کی باتیں بھی کر رہا ہوں۔ مجھے اپنا خاندان بھی کچھ خاص پسند نہ تھا۔ ایک بڑے اور وسیع خاندان میں پرورش پا کر مجھ میں خاندانی زندگی سے دوری کا دائمی احساس بڑھا۔ مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ خود میرے اپنے بچے کبھی نہ ہوں۔ پھر خاندان کے ایک دوسرے ذریعے سے مجھ میں حُسن و جمال کا احساس پیدا ہوا۔ اچھے عادات و اطوار اور اچھی تحریر سے نسبت اس دشتی

خطّے سے دور کہیں اور بستی ہے۔ یہ وحشت دو رُخی تھی۔ ایک تو میرے
خاندان کے اندر تھی دوسری خارجی دنیا میں۔

س : معاف کیجئے اگر میں آپ کے پرانے زخم ادھیڑ رہا ہوں لیکن آپ جو اپنے خاندان
کے وحشی پن کی باتیں کر رہے ہیں، تو وہ دراصل کیا تھا؟

ج : میں شاید زیادہ وضع داری پسند کرتا۔ ذہن کے اعلا تر اوصاف اور مزاج
کی فیاضی پسند کرتا۔ میں نے ایسے لوگوں میں پرورش پائی جو انسانی عادات
واطوار پر بے تکان اخلاقی فیصلے صادر کرتے تھے اور ہمیشہ بغض وعناد سے
بھرے رہتے تھے۔ کیونکہ انہیں اس کے علاوہ کوئی اور کام بھی نہیں تھا۔ میرا
خیال ہے کہ ہندو دیومشرقی مذاہب کے رویوں کی طرح خاصا مادہ پرست
ہے، خاص اشیا کی جانب بے غرضی کا رویہ یا عمل جو بذاتِ خود ایک صحت مند
رویہ ہے، مثلاً بے رحمی کے مقابلے رحم دلی سے پیش آنا، اِن سماجوں میں پایا جاتا
ہے جو خود آگہی رکھتے ہیں اور خاصے مہذب ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ رسم ورواج
کی اسیر تہذیبوں میں بھی یہ باتیں پائی جاتی ہیں۔

س : آپ نے کہا تھا کہ آپ کے خاندان کے اندر ہی ایک ایسا واسطہ تھا جس نے
دوسری باتوں سے قطع نظر آپ کو حُسن وجمال سے متعارف کرایا۔

ج : جی ہاں، وہ میرے والد تھے وہ ایک صحافی تھے اور میرا خیال ہے کہ میں ان
کے اور ان کی GENES کے بغیر بہت مختلف ہوتا۔ میں تب شاید یوں ہی زندہ
رہتا اور ہر حال میں راضی رہتا۔

س : کیا آپ میں ادیب بننے کی تمنا بہت پہلے پیدا ہوئی؟

ج : بہت ہی پہلے۔ میں اس وقت شاید کوئی دس گیارہ برس کا تھا۔

س : کیا لکھنے کا عمل آپ کے لئے آسان تھا؟

ج : نہیں، ہر بات سیکھنی پڑی۔ بیانیہ نثر کا ایک پیراگراف لکھنا اسکول یا یونیورسٹی
میں لکھی جانے والی تحریر سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں

کوئی دس برس کا تھا تو میرے والد نے مشہور رومانی ناول نگار WARWICK-
DEEPING- کے ایک ناول کا ایک جملہ پڑھ کر سنایا تھا۔ اس ناول کا
نام SMITH تھا اور اس کا پہلا جملہ میرا خیال ہے کچھ اس طرح تھا۔
"بڑھئی کی دکان پر تین آدمی کام کر رہے تھے" میرے والد نے مجھ سے کہا دیکھو، یہ ایک اچھا جملہ ہے اور اسی طرح کسی تحریر کی ابتدا کرنی چاہیئے۔ یہ خیال کہ الفاظ کیسے استعمال کئے جائیں اور انہیں محسوس کس طرح کیا جائے یہی وہ باتیں تھیں جنہیں اسکول یا یونیورسٹی میں مروج علمی اسلوب کو ترک کر کے مجھے سیکھنا تھا۔ مجھے یہ بھی سیکھنا تھا کہ مواد کیسے ترتیب دیں۔ جو لکھنے کے عمل میں سب سے دشوار طلب مرحلہ ہے۔ پہلے مواد ایک بڑی مجموعی ترتیب میں داخل ہوتا ہے پھر اُسے ایک چھوٹے پیمانے پر سمیٹنا ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ پیراگراف کی ترتیب اور تسلسل کا خیال کرنا ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس کالحاظ کہ کس کے بعد کیا آنا ہے۔ یہ سب انتہائی دقت طلب مسائل ہیں۔ پھر ان کے بعد اس کا خیال بھی کرنا ہوتا ہے کہ مجموعی اعتبار سے نثر میں تنوع ہو جو بیانیہ نثر میں یقیناً ہونی چاہیئے، اور کبھی کبھی لفظیات کا خیال بھی کرنا ہوتا ہے۔ میرے لئے یہ ایک سخت محنت طلب اور تھکا دینے والا کام ہے لیکن میں یہ کام کرتا ہوں۔

س: اگر کبھی آپ نے یہ سوچا تو کس منزل پر کہ آپ نے کوئی قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی کرتے رہیں گے؟

ج: جب میں اٹھائیس انتیس برس کا تھا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں نے کچھ حاصل کر لیا ہے۔ میں نے ایک بڑی کتاب کا منصوبہ بنایا اور مکمل اعتماد کے ساتھ اسے لکھنے بھی لگا اور یہ محسوس ہوا کہ میں نے واقعی کچھ حاصل کر لیا ہے۔ تخلیقی مسرت کا یہ ایک خوبصورت تجربہ تھا۔ پھر یہ محسوس ہوا کہ میری یہ صلاحیت جو کوئی قدرتی عطیہ نہیں تھی۔ کسی نہ کسی طور ماند پڑ رہی ہے اور اس کی خاطر فن پر گرفت ضروری ہے۔ جہاں تک مکمل کامیابی کا

کا سوال ہے، مجھے اس کا احساس نہیں ہوا۔

س: آپ کی باتوں سے ایسا لگتا ہے کہ لکھنے سے آپ کو بہت کم خوشی میسر آئی ہے؟

ج: یہ فورسٹر کا قول تھا جو لوگ عموماً تحریروں کے بارے میں نقل کرتے ہیں لیکن اُسے لکھنے میں بہت لطف آتا ہے۔ اگر آپ روانی میں ہوں اور کوئی کتاب لکھ رہے ہوں اور سب کچھ آسانی سے چل رہا ہو تو شاید یہ احساس کبھی ہو بھی سکتا ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر آپ کا سارا دن تباہ ہو جائے گا۔ پھر واقعی آپ کو یہ احساس ہو گا کہ آپ کسی بھی شے سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔

س: آپ جو باتیں کر رہے ہیں ان میں بہت سی آپ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کی ایک کتاب سے ایک جملہ نقل کروں جو مجھے بار بار یاد آتا ہے۔ A BEND IN THE RIVER کا ابتدائیہ جملہ ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے "یہ دنیا ویسی ہی ہے جیسی ہے، وہ لوگ جو کچھ نہیں ہیں جو اپنے آپ کو کچھ بھی نہیں بناتے ان کے لئے یہاں کوئی مقام نہیں ہے۔" یہ بہت سخت رویہ ہے، دنیا پر JEHOVAH کی طرح کا ایک سخت فیصلہ ہے نا؟ میں ایسا سوچنے پر مجبور ہوں کہ وہ لاکھوں لوگ جن کے پاس کچھ نہیں ہے، جو خود بھی کچھ نہیں ہیں اور کچھ بننے کی کوشش بھی نہیں کرتے، کمزور، ناتواں، ہارے ہوئے لوگ ہیں ان پر یہ ایک بہت ہی روکھا فیصلہ ہے۔

ج: میں یہ سمجھتا ہوں کہ محض جبلی زندگی گزارنا تعریف کی بات نہیں ہے جیسا کہ کچھ تہذیبوں میں چند لوگ کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ اداس، کاہل بنے رہنا اور اپنی ذات کے مکمل اظہار سے احتراز کوئی قابل تعریف بات ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایسے لوگ عزت حاصل کرنے کی امید بھی کیسے کر سکتے ہیں۔

س: لیکن لوگوں نے ایک افسوس ناک حد تک بڑی تعداد کوئی عزت بھی حاصل

کرنے کی اُمید بھی نہیں کرتی۔

ج: ایسا شخص میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ شاعر میری فطرت ہے۔ میں ان لوگوں کو پسند کرتا ہوں جو کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان لوگوں کو پسند کرتا ہوں جو اپنے کام میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

س: جی ہاں، یقیناً، آپ کے ناولوں کے ہیرو نہ بھی ہر بار وہی لوگ ہیں جو تلاش وجستجو کرتے ہیں۔ میں اس احساس سے خود کو نہیں بچا پاتا کہ آپ کی آنکھوں کے کسی گوشے میں ایک بڑا خلا ہے جس میں آپ داخل ہونے سے گھبراتے ہیں۔

ج: میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ جستجو نہ کریں تو ذہن خالی رہتا ہے اور اگر ذہن خالی ہو تو زندگی بے کار ہو جائے گی۔

س: لیکن کیا ہم انسانی نسل کی نوے فیصد آبادی کو اس رواروی میں قابلِ مذمت قرار نہیں دے رہے ہیں۔

ج: یہ رواداری کا انداز نہیں ہے۔ ہر انسان کے لئے کام کرنے کے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ میری رائے میں جو لوگ عمل نہیں کرتے اور کسی کام میں نہیں لگتے لیکن موجود اور زندہ ہیں اس لئے ان پر مہربانی کرنی چاہیئے غلط ہے۔ میرا خیال ہے کہ انہیں ہر قیمت پر اپنی ذات میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور انہیں خود کو ہماری عزت اور ہمدردی کا مستحق بنانا چاہیئے۔

س: کیا آپ نے یہ سب اس وقت زیادہ شدت سے محسوس کیا جب آپ نے ہندوستان میں اس مقام کی زیارت کی جہاں سے آپ کے آباو اجداد آئے تھے؟

ج: میرا خیال ہے کہ ہندوستانی بہت فعال اور بہت چست لوگ ہیں۔ وہاں عظیم سائنسی انقلاب آچکا ہے۔ صنعتی سطح پر انہوں نے بہت عمدہ کام کیے ہیں اور وہاں کی دانشورانہ زندگی پھل پھول رہی ہے۔ ان کے اخباروں کی قدر وقیمت میں اضافے ہوتے ہیں، دانشورانہ زندگی کی سطح

بلند ہوگئی گفتگو کا معیار بلند ہو گیا ہے ٹکنالوجیکل سوسائٹی سے ربط کے
بعد وہ انسانیت کے اوصاف سے زیادہ متصف ہو گئے ہیں۔ ہندوستانی
سماج اب خود کو انسانیت کے آداب سکھا رہا ہے۔

س: ہندوستان پر۔ یہ ایک حیرت انگیز فیصلہ ہے۔ اس ہندوستان پر فورسٹر
کے لفظوں میں "جس کا ثانی بس ایک سلطنتِ روما تھی"۔ کیا ہندوستان
بحیثیت اب اس زمانے میں ٹکنالوجیکل انقلاب کے ذریعے حاصل کرے گا؟
آپ یہاں بیٹھے مجھ سے باتیں کر رہے ہیں؟

ج: جی ہاں، یقیناً مشین ان سماجوں کو انسانیت کے عظیم سبق سکھا رہی ہے۔
یہ ان انسانوں کو جن کی کاوشیں بہت معمولی ہیں، خود اپنی ذات کا اور اپنی
صلاحیتوں کا ایک نیا تصور بخشتی ہے اور میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں
جو لوگ مشینوں پر کام کرتے ہیں دراصل مشینوں کو پسند بھی کرتے
ہیں۔ یہی شاید پورے ایشیا کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ غالباً یہ یہی وجہ
ہے کہ ایشیا نے مشینوں سے اچھا ربط قائم کر لیا ہے۔ لوگوں نے اپنے بارے
میں نئے تصورات دریافت کیے ہیں اور یہ سب کچھ فلسفہ اور فلسفیوں کے
کئی نسلوں پر پھیلے ہوئے ذکر و فکر کی وساطت سے نہیں بلکہ ایک حیرت
انگیز مشین کے ذریعے سامنے آئے ہیں جو خوبصورت چیزیں پیدا کرتی ہے
جو خود انہیں اپنی نگاہ میں تعریف اور عزت کے قابل بناتی ہے۔

س: کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایثار و بہبودی جس کے متعلق ہم گفتگو کر رہے
ہیں صرف ایک یورپی تصور ہے ایک انسانی تصور نہیں ہے۔

ج: میرا خیال ہے کہ یہ تصور یورپ کی نشاۃ الثانیہ کا ہے۔ مجھے یہ ہندوستان
میں نہیں ملا اور نہ ہندوستانیوں میں۔ مثلاً اگر آپ گاندھی جی کا مطالعہ کریں
تو معلوم ہوگا کہ ان کی شخصیت کے بارے میں بحیثیت ایک ہندوستانی
وہاں کے لوگ جو ان کا تصور رکھتے ہیں۔ دراصل اس کا ہر عنصر وکٹوریائی

ہے جو وکٹورین انگلستان سے وابستگی کے بعد حاصل ہوا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گاندھی اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں کہ جب وہ جنوبی افریقہ میں تھے تو عیسائیت نے ہی ان کے اندر کے مذہب کو زندہ رکھا۔ دوسری دلچسپ بات وہ یہ بتاتے ہیں کہ ۱۹۱۰ء میں جب وہ دنیا سے کنارہ کش ہونے کی سوچ رہے تھے تو بحیثیت ایک وکیل ان کی تربیت نے ہی ان کے رویوں میں تبدیلی پیدا کی۔ انہوں نے SNELL کے تصورِ انصاف پر غور کیا اور ان کے ذہن میں متولیت کا تصور پیدا ہوا کہ انسان محض ایک متولی ہے۔ گاندھی جی کی خود نوشت سوانح کے ابتدائی حصوں میں آپ دیکھیں گے کہ وکٹوریائی علمیت اور تصور کے گہرے تاثرات موجود ہیں اور یہ دوسرے مغربی تصورات سے بھری پڑی ہے جو ظاہر ہے ان کے اپنے تصورات نہیں ہیں غیروں کے ہیں۔

س: آپ مجھے ایک دائمی مسافر نظر آتے ہیں جس نے اپنی جڑیں کہیں پیوست نہ ہونے دیں۔ ایسا صرف اس لئے نہیں ہے کہ آپ نے لمبی مسافتیں طے کی ہیں۔

ج: میں نہیں سمجھتا کہ ہم میں سے کوئی بھی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ کسی واحد محصور اور مخصوص جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ ہم بیماری کی زد میں آئے ہوئے چھوٹے چھوٹے ذرے ہیں۔ کیوں، کیا ایسا نہیں ہے؟ ہمیں اپنے حال تک پہنچانے کے لیے کئی واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور ہم یقیناً اس صورتِ حال میں زندہ رہتے ہیں۔

س: ہم زندہ رہ تو سکتے ہیں لیکن ایک اہم سوال جس کے متعلق ہمیں سوچنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ ہم کس طرح خود کو مطمئن اور خوش پا سکتے ہیں۔

ج: میرا خیال ہے کہ یہ سوال میرے سامنے موجود ہوتا ہے۔ میں اپنی مسافتوں میں اپنے مسائل حل کرتا ہوں اور جب میں تھک جاتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں اور آگے بڑھ سکتا ہوں۔ اب میں اسے کوئی مسئلہ

ہی نہیں سمجھتا۔ میں بس آگے بڑھتا رہتا ہوں۔

س: ایسا لگتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح آگے کی جانب چلتے رہنا ہی آپ نے عمر بھر اپنا شعار بنائے رکھا ہے۔

ج: آگے چلنا اور پیچھے چلنا۔ آگے چلنا اور پیچھے چلنا۔ میرا خیال ہے کہ بہت سارے لوگ خود کو اسی حالت میں پاتے ہیں۔

(کتاب نما دہلی)

☆

احمد شمیم کے خطوط

اپنی بیوی منیرہ کے نام
(۱۹۶۴ء کا ایک خط)

منوجی!

اداس بھی ہوں اور پریشان بھی۔ صبح تم آؤ گی اور میں تم سے لپٹ لپٹ کے پیار کروں گا کیونکہ ...... نہیں منو خدا ایسا نہ کرے آج میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں مرجاؤں تو تم کیا کرو گی۔ میں سارا وقت یہی سوچتا رہا۔ آج کل میں اپنے اندر، اپنے باہر، تمہارا پیار محسوس کرتا ہوں۔ منو! خدا نہ کرے کہ خواب سچے ہوں۔ لیکن اگر ایسا ہوتا ہو تو مَیں موت سے پہلے ہر ریشے اور ہر رگ میں تمہارا پیار بھرنا چاہتا ہوں تاکہ میں پیاسا نہ مرجاؤں میں نے تمہیں چاہا ہے نا۔ میں نے تمہیں بہت چاہا ہے نا۔ میں نے تمہیں بہت چاہا ہے میں تمہیں بہت چاہتا ہوں تمہیں معلوم ہے نا ــــــ کہ میں تمہیں کس قدر چاہتا ہوں۔ اس لئے منو میں آج کل اپنے دل اور اپنی روح کی پیاسی دھرتی کے ذرّے ذرّے کو تمہارے پیار سے سیراب کرنا چاہتا ہوں۔ منو! میں تم سے پیاری پیاری باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن میں اندر سے اس قدر بے چین اور پریشان ہوں کہ مجھے پتہ نہیں چل رہا۔ ایسا لگتا ہے جیسے

میری مرضی اور میری خوشی کے خلاف ایک سفر ختم ہونے والا ہے۔ گارڈن کالج میں شام کی عبادت کی گھنٹی بج رہی ہے۔ مجھے انجیل مقدس کی وہ عبارت یاد آرہی ہے ——— "یہ گجر جو بج رہا ہے کس کے لیے بج رہا ہے اسے غور سے سُن لے، کیا معلوم یہ تمہارے ہی لیے بج رہا ہو!"

عیسائی کسی کے مرنے پر گرجے کا گھڑیال یا گجر بجاتے ہیں۔ خدا جانے اسی وقت یہ گجر کیوں بجا اور مجھے وہ عبارت کیوں یاد آئی۔ منو! مجھے لگ رہا ہے۔ جیسے سارے ماحول میں موت کی بُو رچ گئی ہے۔ تو وہ خوشی جو میں آج محسوس کر رہا تھا۔ مجھے بجھنے سے پہلے چراغ کی بھڑک ہے۔

منو! ——— گذرا ہوا ہر لمحہ یاد آرہا ہے۔ میں اکتوبر کی شام وہ اولین ملاقات دیکھ رہا ہوں۔ اور پھر طویل سلسلہ کیسے منو مجھے شروع ہی سے محسوس ہوتا تھا کہ میں ایک دن ——— جلد ہی مر جاؤں گا۔ تمہیں یاد ہے۔ ایک دن ہم ان دو درختوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ کھلا کھلا روشن دن تھا۔ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے۔ پھر پہروں گم ہو جاتے اپنی اپنی ذات میں ——— نہیں، ایک دوسرے کی ذات میں گم ہو جاتے ہیں۔ گہرے نیلے آسمان کی طرف دیکھ کے کہتا ——— منو! دیکھو اردگرد کتنا حسن اور کتنی خوبصورتی ہے۔ لیکن آہ جلد ہی آنکھوں کی یہ کھڑکیاں بند ہو جائیں گی۔ اور میرے دل تک اس خوبصورتی کا کوئی پیغام نہیں پہنچے گا تم گھبرا جاتیں اور مجھ سے کہتیں "بھئی یہ موت کا فلسفہ ہمیں نہیں اچھا لگتا۔"

منو! آج کل ویسے ہی دن ہیں۔ ایک سال سے اوپر گزر گیا ہے۔ کیا آنکھوں کی یہ کھڑکیاں بند ہو جائیں گی؟ آج جب میں تمہارے ہاں سے نکلا تو میں دروازے پر ہی اباجی سے علیحدہ ہوا۔ میں نے انھیں کہا کہ مَیں کھیتوں میں سے جاؤں گا حالانکہ مجھے معلوم تھا میں کھیتوں سے نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ تم نے کہا تھا "شمی آپ کھیتوں میں سے نہیں جائیں

گے "۔ میں چاہتا تھا کہ میں تنہا اور خاموش چلتا رہوں۔ ابا جی گگو کے ساتھ چلے گئے اور میں سر جھکائے دوسری طرف چل پڑا۔ ٹینکی کے قریب سے میں واپس آیا اور تھوڑی دیر اس درخت کے پاس کھڑا رہا جس کے نیچے میں نے پہلے دن تانگہ روکا تھا۔ پھر میں اداس اور کھوئی کھوئی نظروں سے ہسپتال کو دیکھتا رہا۔ اور پھر سر جھکائے ٹیکسلا کی طرف چل پڑا۔ تانگہ ملا اور میں بالآخر تانگے میں بیٹھ گیا۔ راستے میں سوچتا رہا کہ واقعی ایسے ہوگا کہ میں واہ تمہیں دیکھنے نہ آسکوں گا۔ کیا واقعی سب خوبصورتی بجھ جائیگی ——— مجھے وہ شام یاد آئی جب میں شدید بارش میں تمہارے گھر آیا۔ میں نے تمہیں دیکھا تمہارے چہرے کا سارا خون مجھے دیکھتے ہی نچڑ گیا۔ کیونکہ تمہیں دکھ تھا کہ مجھے اس بارش میں واپس جانا پڑے گا میں خوش تھا کہ ہر چند مجھے بارش میں بھیگنا پڑے گا۔ لیکن تھوڑی دیر کے لئے تمہیں دیکھ تو لوں گا۔ اس دن خوش قسمتی سے مجھے فوراً تانگہ مل گیا۔ اور تم بارش میں اس لئے بھیگتی رہیں کہ میں بھیگ رہا تھا اس دن ایک آدھ گھنٹے میں ٹیکسلا میں بارش میں بھیگتا رہا۔ جانے آج یہ باتیں مجھے عجیب طرح سے کیوں یاد آ رہی ہیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ اب یہ باتیں دوبارہ نہیں ہوں گی۔ جیسے مجھے اب بس ان باتوں کو یاد کرنے کی فرصت مل گئی ہے۔ اور یہ فرصت تھوڑی دیر کی ہے۔ آج تمہارے گھر میں، میں تمہیں عجیب حسرت سے دیکھتا رہا۔ زاہدہ نے کوئی بات کی میں نے نہ معلوم کیا کہا۔ تم نے پوچھا یا میں نے پوچھا تم کون ہو۔ تم نے جواب دیا۔ اپنے آپ سے پوچھیں میں نے کہا" ماں "——— اور میرا دل ایک دم پیار سے بھر گیا۔ آج بھی یہی ہوا۔ جب میں پرانے گانوں کی بات کر رہا تھا تو مجھے وہ گانا یاد آیا ——— چار کہار تیری ڈولیا اٹھا دیں . . . . . .

جس میں شادی اور موت یکجا ہے ۔ مجھے اپنا خواب یاد آیا ۔ مجھے یوں لگا جیسے میری شادی، شادی سے پہلے موت میں بدلنے والی ہے میں اداس ہو گیا ۔ چپ ہو گیا ۔ تم نے پوچھا، میں نے کچھ اور کہہ دیا ۔ لیکن منو! زندگی میں انسان کس کو کیا بتائے اور کتنا بتائے اس وقت سوچ رہا ہوں کہ آخر کیا مجھے تم سے بس اتنی ہی دیر ملنے کے لئے زندہ رہنا تھا؟

منو! میں بڑا اداس ہوں
بڑا پریشان اور دکھی!

تمہارا شمی

جانِ من!

ابھی ابھی ٹیکسی سے اترا ہوں ۔ یہ چھوٹی سی کاپی خریدی ہے اب بیٹھا تمہیں خط لکھ رہا ہوں ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے اپنی داستان کا آغاز کروں لیکن یہ بات تو بہر طور طے ہے کہ داستان کہیں سے بھی آغاز ہو اس کا عنوان تُو ہی ہے ۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری زندگی کی کتاب کا سرورق تمہارا نام ہے اور اندر اپنے ہی دکھ کی داستان رقم ہے ۔ اس دکھ کو میں نے کیسے کیسے لبادے اڑھا دیئے ہیں، کیسے کیسے نام دیئے ہیں ۔ لیکن اس کی اساس اور بنیاد تُو ہی ہے ۔ اے جانِ تمنا!

آؤ وقت کے پیروں میں زنجیریں ڈال کے اُسے روک دیں اور پھر کھلے گہرے نیلے آسمان کے شامیانے کے نیچے بیٹھ کے ایک دوسرے میں یوں کھو جائیں کہ زمانے کو ہمیں جدا کرنے کا حوصلہ نہ ہو ۔ عمر خیام نے بھی اسی طرح کی آرزو کی تھی ۔ اُس نے زمانے کو اس سارے ماحول اور ساری فطرت کو شکست و ریخت کے نئے عمل سے گزار کر

اپنے پیار اور اپنی محبت کے مطابق ایک نئی دنیا کی تعمیر کی آرزو کی تھی جو اس کے بلے انتہا شدید جذبے کا آئینہ ہو۔ لیکن میری جان! ایسی آرزوئیں کبھی تکمیل پاتی ہیں؟ ہاں البتہ میں نے جو اپنے دل کو تمہارے پیار کا شبستان بنایا ہے، اس میں تو ہے میرے خلوص کی مہکار ہے اور کبھی نہ تھمنے والا وہ نغمہ ہے جو میری روح کی گہرائیوں سے بلند ہوتا ہے اس شبستان میں کبھی جھانک کر دیکھا ہے؟ —— آؤ منو! میں تمہیں اس میں لے جاؤں —— بیباکانہ چلی آؤ، اے بادِ صبا کی طرح نازک اور سبک گام محبوبہ! دیکھو منو! یوں دزدیدہ نگاہوں سے مجھے نہ دیکھا کرو میرا دل ڈانواڈول ہوتا ہے اور میں اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتا۔" اچھا جانِ جہاں! یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے بتاؤں کہ تو میرے لئے کیا ہے؟ میں نے اپنے ذہن کو کھنگال کے یہی محسوس کیا ہے کہ تو میری زندگی کا وہ مرکزی نقطہ ہے کہ جس پر جمے رہنے کے بغیر دائرہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ دیکھو تم مرکز ہو اور میری حرکت تمہارے ہی وجود سے وابستہ ہے۔

مجھے تمہاری وجہ سے شاعری ملی، آوارگی ملی، ایک بے نیازی ملی —— یہ ساری چیزیں میری شخصیت کی تکمیل کے لئے ضروری تھیں یہ مجھے تم سے ملیں! منو! مجھے اس بات کی بھی پروا نہیں کہ تمہیں میری محبت کا یقین ہے یا نہیں۔ میں سچا ہوں اور سچا ہوں اور سچائی ان کے لئے بہانے تلاش نہیں کرتی۔ میں نے کبھی یہ ضرورت محسوس نہیں کی ہے کہ تم سے سنوں، "شمی میں تم سے محبت کرتی ہوں کیونکہ میرے اندر تمہاری محبت کے بارے میں ایک نہ ٹوٹنے والا یقین ہے —— تمہاری محبت کے بارے میں میں نے ہمیشہ یہی سوچا ہے کہ وہ سورج کی طرح ہے اور اسے اپنے ہونے کے لئے اعلان کی

نقارے اور ڈھول پیٹنے کی ضرورت نہیں! میں نے تمہیں دل کا کبھی نہ بھرنے والا زخم بنایا ہے۔ اور اس زخم کی ابدی کسک اور لازوال درد ہی میری زندگی کا حاصل ہے۔ تم ہی بتاؤ اگر میں تمہیں ایک خوش کن مسکرانے والی اور محض مسرت بخشنے والی لڑکی سمجھوں تو میرے پیار میں وہ دیوانہ پن، گہرائی اور وہ تیسری سمت کہاں سے آئے گی؟ میں تجھے زندہ کرنے والی منو اور مارنے والی منو! ــــــ دونوں صورتوں میں چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ہے نا کہ تو میری صلیب ہے۔ صلیب انسان کا مقدر ہے۔ تم میرا مقدر ہو اور میں تمہارے ہی ذریعے اپنی تکمیل پاتا ہوں۔ دیکھو میری شاعری کا ایک ایک لفظ تمہاری محبت، نفرت، جسم، روح سے عبارت ہے آج میں تمہیں اپنی شاعری کی ایک بات بتاؤں جب میں کائنات، موت، زندگی، روح اور دنیا کے بارے میں سوچتا ہوں۔ تو تمہارے ہی اندر سے، تمہارے ہی ذریعے اور تمہارے ہی توسط سے سوچتا ہوں ــــــ اس لحاظ سے تم میری شاعری کا مرکزی کردار ہو۔ دیکھو منو! میں نے تمہارے ہی پیار کو کیسے تاریخ پر پھیلا دیا ہے۔ اور اسے وقت کے اندر سے باہر نکال کے دیکھ لیا ہے ــــــ ہابیل، قابیل، آدم، اولین خون، تم اور میں ــــــ اور پھر یہ ساری چیزیں اور میں اور تم ــــــ اور خدا اور قوتِ حیات اور تم اور میں!! ــــــ منو! یہ ایک زبردست آنکھ مچولی ہے جو فنکار اپنے ساتھ، کائنات کے ساتھ خدا کے ساتھ، قوتِ حیات کے ساتھ زندگی اور موت کے کھیلتا ہے جس طرح آنکھ مچولی میں تمام لوگ ایک مقررہ جگہ پر بار بار لوٹ آتے ہیں اسی طرح فنکار اپنے مرکزی مقام کی طرف لوٹ آتا ہے اور یہ مرکزی مقام میرے لئے تم ہو۔ اگر شاعر کے لئے مرکزی مقام نہ ہو تو وہ بھٹک جاتا ہے۔ اور اس کے فن میں

نظم، ضبط اور ترتیب نہیں رہتی۔ وہ الجھاوا بن جاتا ہے۔

دن آہستہ آہستہ ڈھل رہا ہے پھٹے ہوئے گریبان والے دن میں ہمارے پیار کا ایک لمحہ بھی پنہاں ہے۔ ہماری مختصر ملاقات! جانے مجھے تم سے ملتے وقت یہ کیوں محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک سائے کو متحرک دیکھ رہا ہوں۔ ابھی غم کا سورج نکلے گا۔ اور یہ سایہ تحلیل ہو جائے گا۔ اور میں خالی خالی نظروں سے افق کو گھورنے لگوں گا جہاں دکھ کے پہاڑ دھند میں لپٹے مجھے اپنی طرف بلائیں گے اور میرے دل میں تنہائی، ناآسودگی اور بے بسی کا زہر بھر جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ تو ایک زندہ حقیقت بن کے میرے سامنے ہوتی ہے لیکن ایک طویل مدت تک یہ زندہ حقیقت میرے لئے ایک چھلاوا رہا ہے اور ابھی تو میرے ذہن کے کسی گوشے میں وہ متحرک سایہ پھر رہا ہے جس کے پیچھے میں بوئے آوارہ کی صورت گھومتا رہا ہوں۔ دراصل میں نے تمہیں اپنی تنہائی اور فراق کی شدت میں اپنا آئیڈیل بنایا ہے اور پھر تم جانو کہ اگر آئیڈیل ایک دم وقت کی کوکھ سے نکل کے کسی کے سامنے آجائے تو وہ ششدر رہ جاتا ہے۔ اسے اپنی نظر پر شک ہونے لگتا ہے اور وہ آنکھیں ملنے لگتا ہے اسے ساری زندگی ایک شفق زار نظر آنے لگتی ہے ــــــ مہکتے رنگوں کی ایک بہتی ندی، لیکن یہ ندی، یہ مہک اور یہ بہار اتنا مختصر ہوتا ہے۔ شام اپنا سرمئی آنچل سنبھالے اسی ندی میں اداسی اور محرومی کی راکھ گھول دیتی ہے۔ اور رات ان مہکتے ہوئے رنگوں کو ظلمات میں بدل دیتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں تمہیں اپنے سامنے ایک اٹل حقیقت، ایک ناقابلِ تردید وجود کی صورت میں بیٹھے دیکھنے کے باوجود اپنے حواس پر یقین نہیں کرنا چاہتا۔ آئیڈیل

میری جان، انسان کو جستجو کی زنجیر میں باندھ دیتا ہے اور اُسے محرومیٔ جاوداں کے غم کا اسیر بناتا ہے۔ میری یہی کیفیت رہی ہے۔ تم سے آج سے چھ سال پہلے بچھڑ کے اور جدائی ——— یک طرفہ جدائی ——— کے یہ چھ سال طلب اور تلاش اور جستجو کی ایسی داستان ہے جس میں دکھ اور آگ اور زخم ہی زخم ہیں۔ یہ زخم بھرتے بھرتے بھی دیر لگے گی۔ اور جب تک یہی کیفیت رہے گی کہ تمہیں دیکھیں گے تو محسوس ہوگا کہ ایک سایہ دیوار پہ لپک کے غائب ہو گیا ہے۔

آج تم سے مل کر یوں محسوس ہوا جیسے تمام زخموں کے ٹانکے ادھڑ گئے ہیں۔ دھند میں لپٹی وسعتوں کو دیکھ کے محسوس ہوتا تھا کہ دکھ کا ایسا ہی وسیع اور بیکراں سمندر میرے اندر پوشیدہ ہے جسے میں کہیں بھی نہیں لے جا سکتا۔ یہ دکھ کا سمندر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مرے سینے میں رہے گا۔ تم نے شاید دیکھا نہیں کہ میری آنکھیں ان وسعتوں کو دیکھ کے جلنے لگیں اور سلگتے ہوئے آنسو امڈ آئے۔ تمہیں میں یہ کیسے بتاؤں کہ وہ لمحہ کتنا المناک اور تکلیف دہ تھا۔ ایسے ہی لمحوں میں میں یہ سوچتا ہوں کہ زندگی کی میت کاندھے پہ اٹھائے پھرنے سے یہی بہتر ہے کہ کسی سنگلاخ دیوار سے سر پھوڑ کے اپنا افسانہ اختتام تک پہنچاؤں یہ خوابناک اداسی میں لپٹی ہوئی وسعتیں، یہ سرمئی دھند اور یہ گہرا نیلا آسماں، یہ مضمحل کرنے والی دھوپ میرے دل میں زہر بن کے اترتے ہیں۔ اور تم دھند میں لپٹے ہوئے برف پوش پہاڑوں کی نقرئی چوٹیوں پر اشارے کرتی ہوئی ایک ایسی آرزو نظر آتی ہو جو چھلاوہ بھی ہو اور حقیقت بھی تم نے اس کرب ناک لمحے میں مجھے دیکھا ہے ——— خاموش اور پتھر کی طرح منجمد، تو نے میرے دل کو نہیں دیکھا جو دکھ کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا زہر کا سمندر تھا۔ میں نے تو صرف ایک آہ بھر کے کہا "منو! مجھے

مر ہی جانا چاہیئے!" اور تو ناراض ہوگئی۔ لیکن خدا کے لیے کبھی میرے اندر جھانکنے کی کوشش کرو۔ میں ان خطوط میں تمہارے سامنے اپنی روح عریاں کرکے لا رہا ہوں۔ اسے دیکھو، اسے سمجھو اور میرے پیار کی قدر متعین کرو!

تمہارا خط (جو مجھے پہلی دفعہ ملا تھا) ابھی ابھی پھر پڑھ لیا ہے۔ مجھے اس میں تمہارے اس فقرے نے مجھ پر یہ ثابت کیا ہے کہ تمہاری بصیرت کی آنکھ روشن ہے۔ اور تم سطح کے نیچے بھی دیکھ سکتی ہو۔ چند ملاقاتوں میں تم نے جس خوبی سے مجھے سمجھنے کی کوشش اور کامیاب کوشش کی ہے اس نے تمہارا مرتبہ میری نظر میں اتنا اونچا کیا ہے۔ دراصل یہ تلخی میری زندگی کا احساس ہے اور میری شخصیت کو سمجھنے کے لئے ایک کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے دکھ اور تلخی سے اپنی زندگی اور اپنے احساس اور اپنے جذبے کو اتنا معمور کیا ہے کہ اب حلاوت، مٹھاس اور شیرینی کی کوئی گنجائش نہیں۔ تمہارے خط میں یہ درد موجود ہے لیکن خدا کرے کہ یہ انتہا کی اس حد تک نہ پہنچے جہاں میں کھڑا ہوں لیکن تمہارے خط نے مجھ پر یہ واضح کر دیا ہے کہ جس لڑکی کو میں نے منتخب کیا ہے۔ اور جسے میں نے اپنی صلیب بنائے رکھا ہے، اس میں وہ گہرائی موجود ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔ منو! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اندھیرے زندان میں ایک روزن ابھر آیا ہے۔ اور یہ تو ہے اور میں باہر کی روشنی کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھنے لگتا ہوں۔ لیکن یہ میری کتنی بدنصیبی ہے۔ کہ کبھی کبھی اس روزن میں سے مسکراتا ہوا چہرہ موت ——— اپنی آغوش وا کئے مجھے اپنی طرف بلاتی ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کی زنجیر توڑ کے میں بلا ارادہ ایک دن موت سے ملنے جاؤں گا۔ تم

ہی بتاؤ میری جان! جب زندگی ہی موت نظر آنے لگے تو پھر راہ فرار کیسے مل سکتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم نے اپنے خط میں میرے بارے میں غم کی جس تلخ حقیقت کے ادراک کا اظہار کیا ہے وہ شعوری ہے یا غیر شعوری ـــــ اگر وہ شعوری ہے۔ تو تمہاری بصیرت اور نظر کا عمق ناقابل بیان حد تک قابلِ تحسین ہے اور اگر وہ غیر شعوری ہے تو پھر تم میں حقائق کو دیکھنے، پرکھنے اور سمجھنے کی وہ قوت ہے جسے ہم چھٹی حس کہتے ہیں۔ شعوری حیثیت میں تم اسے اس تیسری آنکھ سے موسوم کر سکتی ہو جس کا میں نے اپنے پچھلے خط میں ذکر کیا ہے۔ لیکن تمہارے خط میں فقروں کی ساخت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شعوری سے زیادہ غیر شعوری ہے۔ اے جانِ من! تو نے میرے دکھ کو میری شخصیت کے آئینے میں بے نقاب دیکھ کے جیسے مجھے ساری دنیا کی دولت سے مالامال کر دیا ہے۔ پرسوں جب تمہارا خط ملا تو میں چونک پڑا پڑھنے کے لیے مجھے محسوس ہوا تمہارے سامنے اپنی روح کو بے نقاب کر کے پیش کرنا سعیٔ رائیگاں نہیں!

رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ کھانا میرے سامنے پڑا پڑا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ گہری نیند سو جاؤں لیکن آنکھوں میں جلتی ریت بھر رہی ہے۔ کل رات اس وقت میں دل میں امید لئے بیٹھا تھا کہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ روشن صبح طلوع ہو گی جس کا سارا نور میں اپنے دل میں بھر لوں گا۔ تجھ سے ملنا ہوتا ہے۔ تو ہر چیز اپنی صورت بدلتی ہے ـــــ لیکن آج رات کے خاتمے پر پھر رات طلوع ہو گی ـــــ کالا، تاریک دن جس کے سینے پر سورج کا داغ ہو گا۔ اور میں تنہائی اور محرومی کی آگ میں جلتا رہوں گا۔ اس وقت رات

خاموشش ہے اور پُراسرار، بھیانک کالی آنکھوں سے مجھے گھور رہی ہے ۔ گہری اداس خاموشی کو کبھی کبھی اُبھرنے والی ریل کی کوک چیر کے میرے دل میں اتر جاتی ہے ۔ وقت جیسے دم سادھے بیٹھ گیا ہے ۔ اور زندگی ایک عذاب ہے ——— اور تو اس وقت کہاں ہے ؟ مجھے دکھ کے اس تاریک سمندر میں چھوڑ کے تو کہاں ہے ۔ منوجی! آج دل میں "زخم بے نشان" والی نظم کی سی کیفیت پیدا ہو رہی ہے ۔ پھر دل چاہتا ہے کہ ابھی باہر جا کر اداس راہوں میں تجھے ڈھونڈنے چلوں کہیں کسی راستے میں کسی موڑ پہ تو کھڑی میری منتظر ہو گی ۔ اور تمہیں اپنا خون شدہ دل دکھاؤں یہ لمحہ میرے لئے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے ۔ تمہاری تلاش میں ایوب پارک جا رہا ہوں ۔ بارشس ہو رہی ہے اور تمہیں ہوٹل کی بالائی منزل پر ایک سمٹے ہوئے سہانے خواب کی صورت میں دیکھ رہا ہوں ۔ وہ دن ابر آلود ہونے کے باوجود کتنا سہانا لگتا ہے ۔ جیسے بہار کا روح کو بیدار کرنے والا سورج چمک رہا ہو ۔

زندگی کی یہ خوشی کا مختصر لمحہ ——— اتنا مختصر کیوں تھا؟ سلور گریل کی شام کتنی سہانی تھی لیکن اب وہ شام بھی ایک دن نہ مندمل ہونے والے زخم میں بدل جائیگی اور میں وردِ لا دوا اور زخم بے مرہم کا اسیر پھر تمہیں اداس راتوں کو سونی راہوں میں ڈھونڈنے چلوں گا شام یاد آ رہی ہے ۔ اس وقت جب تم نے چڑھتے چاند کی طرح میرے دل کی تاریکی دور کی تھی ——— تمہارے ساتھ جو لمحے گذارے ہیں میرے لئے زندگی اتنی ہی ہے ، باقی حصہ تو زندگی کا الزام ہے ۔ باقی حصہ تو بس وقت ہے جس سے میری زندگی کا کوئی تار ملا ہوا نہیں ہے ۔ تم خالی وقت اور جاندار وقت ، کا فرق سمجھتی ہو نا؟ وہ لمحہ جب زندگی میں ایک نیا پن نئی تازگی ، رعنائی اور رُلانے والا حسن نظر آئے جب کوئی بات کاٹتی

ہوئی تلوار کی مانند دل میں اُتر جائے جب کوئی بات دھنک کی طرح دل کے آسمان پر رنگوں کی پھوار بکھیر دے وہ جاندار لمحہ وقت ہوتا ہے باقی تو بس ایک بے نام سلسلہ ہے ساعتوں کا! منو! تم یہ باتیں کب سمجھو گی، کیسے سمجھو گی!

منو! میں جہنم کے اس دہانے پر کھڑا ہوں اور سمجھتا ہوں، خواہشِ مرگ دکھوں سے نجات پانے کا واحد ذریعہ ہے لیکن میرے جہنم اور موت اور میرے درمیان تم ہی ایک دیوار ہو۔ دیکھو منو! وہ جو میں کہتا ہوں تاکہ تمہیں معلوم ہو، تم میرے لئے کیا ہو، سو اب اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ اسی صورت میں تم میرے اور اپنے رشتے اور پیار کی نوعیت صحیح طور پر سمجھ سکو گی۔ منو! میری آئیڈیل کی یا اندرونی جنت کی بنیاد تم پر ہے۔ اس لحاظ سے تو میرا آئیڈیل ہے۔ میں نے کئی سال تمہیں باہر کی دنیا میں ڈھونڈا۔ تمہاری طلب میں آوارہ پھرا۔ لیکن تو نہیں ملی۔ بھلا آئیڈیل بھی کسی کو ملتا ہے تمہاری طلب نے آہستہ آہستہ ایک ایسے دکھ کی صورت اختیار کی جو میرے لئے عذاب کا جہنم بن گیا اور یہ عذاب میرا مقدر بن گیا میں اس جہنم میں جلتا رہا۔ اور بالآخر مجھے اس جہنم سے بھاگنے کا ایک دروازہ نظر آیا یعنی موت! یوں تمہاری وجہ سے میرے اندر خواہشِ مرگ نے جنم لیا۔ اور نجات کی واحد صورت کی حیثیت سے ہر لمحے اور ہر قدم پر موت مجھے اپنی طرف بلاتی رہی ——— لیکن منو! میرے ساتھ زندگی نے عجیب احسان کیا ——— یعنی جب خواہشِ مرگ اپنی تکمیل کی منزل طے کرنے کے لئے آمادہ ہونے لگی تو مجھے اپنا آئیڈیل مل گیا یعنی ایک دن میرے خوابوں کی جنت میرے ذہن سے نکل کر میرے سامنے آگئی

مجھے منو مل گئی تو مجھے مل گئی میں نے تمہیں اپنے آئیڈئیل کی کسوٹی پہ پرکھنا شروع کیا۔ بالآخر تو وہی نکلی جو میرے ذہن میں تھی اور جس کی جدائی میرے لیئے عذاب کے اس جہنم کا باعث تھی جو خواہشِ مرگ کو جنم دیتی تھی۔

میں کتنی دیر کشمکش کے بعد اپنے اندر سے باہر نکلا ہوں۔ اس کا اندازہ تم میرے خطوط سے کر سکتی ہو ابتدائی خطوط میں تم اور میرے اندر پوشیدہ دو الگ الگ شخصیتیں ہیں لیکن آہستہ آہستہ یہ دو شخصیتیں ایک دوسرے میں مدغم ہو کے تمہاری صورت اختیار کر گئی ہیں۔ اب تو میرے سامنے ایک زندہ آئیڈیل ہے جو میرے اور خواہشِ مرگ کے درمیان ایک دیوارِ چین کے حائل ہے تم اس سے اندازہ لگا لو کہ میری جان! تمہاری حیثیت کیا ہے میرے لئے اور تم میرے لئے کتنی اہم اور عظیم ہو۔ بہت بہت پیار کے ساتھ تم سے اجازت چاہتا ہے۔

تمہارا شمی!

منو! تم نے میرے دو روپ دیکھے ہیں۔ محسوس کئے ہیں، اس کی مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے سمجھ لیا ہے۔ ایک دفعہ میں نے لکھا تھا "تم ایک سمندر کی طرح ہو سطح پر خاموش لیکن زیرِ سطح ہزاروں طوفان ہیں" اس فقرے سے تمہیں خوشی ہوئی نہیں اطمینان ہوا تھا۔ کہ شمی مجھے جانتا ہے۔ تمہارے آج کے خط سے مجھے یہ خوشی ہوئی ہے کہ تم بھی مجھے جانتی ہو لیکن اس کے باوجود تمہارا یہ سوال اپنی جگہ پر قائم ہے کہ سچا کون شمی ہے؟ میرا خیال ہے۔ اس کا تم نے خود ہی جواب بھی دیا ہے لیکن میں اس کی وضاحت کروں گا تم نے لکھا ہے کہ شاعر اپنے اندر دکھ جمع کرتا ہے اور لکھتا ہے یہ

ٹھیک ہے لیکن تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ شاعر آئیڈیل سے نفرت اور محبت ایک ساتھ کرتا ہے۔ یہ بات تمہیں عجیب لگتی ہے۔ آؤ تمہیں سمجھاؤں۔ شاعر آئیڈیل سے محبت اس لئے کرتا ہے کہ وہ اس کا خواب ہوتا ہے۔ لیکن اس خواب کے پیچھے اُسے چلنا پڑتا ہے۔ اُسے مرنا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ اس خواب کو اپنا دشمن بھی سمجھتا ہے جو اُسے جلاتا رہتا ہے اس جلن سے اُسے شاعری ملتی ہے جو اس کی زندگی کی پونجی ہوتی ہے اس لئے وہ اس جلنے کو ضروری سمجھتا ہے۔ وہ آئیڈیل کی محبت اور نفرت دونوں قائم رکھتا ہے۔ اس طرح سے شاعر، محبت اور نفرت میں رسہ کشی، ایک کشمکش رہتی ہے یہی کشمکش اس کا فن ہے۔

یہ بات تم ایک اور طرح بھی سمجھ سکتی ہو۔ ہم سب، موت سے نفرت کرتے ہیں۔ زندگی سے پیار کرتے ہیں۔ نفرت اور محبت کی یہ جنگ ہماری زندگی بن جاتی ہے۔ آخر زندگی کیا ہے؟ موت سے محبت اور نفرت کی جنگ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم سب زندگی سے محبت کرتے ہیں لیکن کیا ہم موت سے نفرت کرتے ہیں؟ نہیں
کیونکہ اندرونی طور پر ہم زندہ رہتے ہوئے، زندگی سے محبت کرتے ہوئے بھی موت کی طرف بڑھتے رہتے ہیں۔ اور ہمیں اُس دن پتہ چلتا ہے جب ہم مرجاتے ہیں۔ اسی طرح فنکار کی زندگی ہے۔ وہ آئیڈیل سے محبت اور نفرت ساتھ ساتھ کرتا ہے۔ لیکن وہ بہر طور آئیڈیل سے وابستہ رہتا ہے یہ محبت اور نفرت مختلف ہوتی ہے عام محبت اور نفرت سے ——— یہ بھی میں سمجھاؤں گا۔

فنکار کی آئیڈیل کے ساتھ نفرت کا یہ سلسلہ نفرت نہیں ہوتی بلکہ کشمکش ہوتی ہے اور یہ کشمکش آئیڈیل سے وابستگی کا زندہ ثبوت

ہوتا ہے ۔ تمہیں معلوم ہے کہ میری تمام نظمیں تمہارے اردگرد گھومتی ہیں ۔ لیکن جب میں نظم لکھتا ہوں ، کیا میں اس وقت تمہاری صورت اپنے سامنے لاتا ہوں مجھے اس وقت کچھ بھی نہیں پتہ ہوتا تم ہو بھی یا نہیں ۔ ـــــــ میں آئیڈیل کے ایک زبردست دکھ ، نفرت اور محبت کے شدید دھارے اور سیلاب میں گرفتار ہوتا ہوں ۔ اور اس سیلاب میں ڈوبنے اور ڈوبنے سے بچنے کی جدوجہد میں جو میرے دل پر گزرتی ہے وہ شاعری ہوتی ہے ۔ آج میں مین گیٹ پر کھڑا تھا بس کے انتظار میں ۔ ہوا تیز چل رہی تھی ۔ ایک درخت جھوم رہا تھا ۔ میں نے نظر اٹھا کے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا ، تم ہو اور تمہارے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں ۔ ایک دم میرے ذہن میں وہ تصویر ابھری جس میں تمہارے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں ایک دم مجھے محسوس ہوا کہ ہوا کی طرح تم میرا پیچھا کر رہی ہو اور اب تم درخت بن کے ایستادہ ہو ـــــــ اور کہیں سے تمہارے جسم کی خوشبو کا سیلاب آیا ہے ۔ میں گھبرا گیا ـــــــ یہ گھبراہٹ شاعری ہے ۔ اب مجھے معلوم ہے یہ میرے لاشعور میں سب باتیں جذب ہو جائیں گی اور کسی دن نظم بن کے نکلیں گی ۔ میرے ذہن میں کچھ یوں بنی ہے نظم

تم کہاں ہو؟ ــ میں تو خوشبو کے سمندر میں
اس سمے تم کون سے صحرا کی ریت پر ــ ہزاروں آئینے لے کر کھڑا ہوں
اپنے زخموں کی دکھن سے چور ہو! ــ اور یہ پھیلا سمندر
آؤ مجھ کو دیکھ لو ، ــ وقت کے ساحل کی ہر زنجیر سے آزاد ہے؟

اب بتاؤ اس میں تم کہاں ہو؟ میں کہاں ہوں؟ ـــــــ اس میں وہ شخص کہاں ہے جو بس کے لئے کھڑا تھا؟ لوگوں کے لئے میں بس کے لئے کھڑا تھا نا لیکن میں کہاں تھا؟ میں تو وقت کی زنجیریں توڑ کے

خوشبو کے سمندر میں گم تھا اور ازل سے ابد تک ——— نہیں اس سے بھی پرے تھا۔ لیکن میں نہیں، وہ شمی نہ تھا۔ وہ تو شاعر تھا جس نے محسوس کیا اور ایک دم وقت کی زنجیر توڑ کر بھاگ نکلا ——— یہی شمی سچا ہے لیکن وہ شمی کس کے سہارے وقت کی زنجیر توڑ کے بھاگ نکلتا ہے۔ وہ آئیڈیئل ہے جس کا ایک روپ پھول ہے اور ایک روپ زخم ہے وہ تم سے ملتی جلتی ہے۔ مجھے ایک دم وہ تم میں نظر آتی ہے۔ منو! یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ یہ بڑا کھیل ہے اور یہ روح کے بڑے ہی پوشیدہ کونوں میں کھیلا جاتا ہے۔ کبھی خود انسان اس سے بے خبر رہتا ہے بس اندر یہ کھیل ہوتا رہتا ہے۔

منو جی!

کچھ عرصے بعد تمہاری تنہائی ختم ہو جائے گی۔ اور خدا تمہیں ایک چاند سا بچہ دے گا اس میں تمہیں اپنا آپ نظر آئے گا اور میں بھی نظر آؤں گا اور تم ساری خوشیوں کو سمیٹ لوگی آج تم اپنی زندگی کے سفر پہ غور تو کر لو، منو! ——— یعنی کہ ایک بچی ——— یہ بچی بیس سال کا طویل سفر کاٹ کے خود اس منزل پہ آ گئی ہے۔ جہاں خود اس کی گود میں ایک بچہ ہو گا۔ منو مجھے عجیب سا لگ رہا ہے کیونکہ میں تمہیں آج بھی ماں جی کے ہاں دیکھ رہا ہوں۔ تم دروازے کے پیچھے چھپی بیٹھی ہو۔ سب لڑکیاں مجھے چھیڑ رہی ہیں۔ لیکن تم دروازے کے پیچھے بیٹھی ہو۔ سب لڑکیاں مٹھائیاں لے کر خوش ہیں۔ تم اداس ہو کہ تمہیں مٹھائی نہیں ملی۔ لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ میں نے تمہارے لئے اپنا پیار رکھ لیا ہے۔ لڑکیاں مٹھائی چاہتی ہیں۔ تمہیں مٹھائی کا غم نہیں کرنا چاہیے کیونکہ تمہارے لئے میں نے جو اپنے سینے میں جذبہ

چھپا رکھا ہے وہ کسی اور کے لئے نہیں! تم تو پگلی ہو نا، یونہی ناراض ہو رہی ہو۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں تمہارے لئے کٹھن سنکٹ کاٹنے کے لئے بھی تیار ہوں۔

منو! ——— تم اب میرے پاس ہو۔ تم اپنے اور میرے لئے کھانا پکا رہی ہو۔ آج سے ایک سال بعد بھی تم اسی طرح میرے لئے کھانا پکا رہی ہو گی۔ لیکن میرے پاس، میری گود میں تمہارے پیار کا پھل ہو گا اور میں اسے بہلا رہا ہونگا۔ پھر تم کھانا پکا کے آؤ گی اور میں تمہاری امانت تمہیں سونپ دوں گا۔ پھر ہم کھانا کھانے بیٹھ جایا کریں گے۔ منو! ایک بات بتاؤں ——— آج کل تم میرے اور اپنے مستقبل کو اپنے اندر چھپائے ہوئے پھر رہی ہو۔ ایک پوری زندگی، ایک پوری کائنات، ایک پوری دنیا تمہارے اندر چھپی ہوئی ہے۔ آج کل تم مجھے قطعاً منیرہ یا منو نظر نہیں آتی ہو۔ دو دن سے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم جانے کیسے اس زمین سے ایک دم اوپر اٹھ گئی ہو اور میں تمہاری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ ۲۲ اکتوبر سے تمہارے خیالوں کی تنہائیاں مستقل طور پر بھر گئی ہیں کیونکہ جب تمہارے پاس کوئی بھی نہیں ہو گا تو تم اپنے بچے سے باتیں کرتی رہو گی۔ اس آنے والے لمحے سے جو پھیل کر ایک زندگی بن جائے گا۔ آج کل تم نہ جانے اندر سے کیا سوچتی ہو گی۔

منو! زندگی میں میری پہلی جیت تمہارے پیار میں ہوئی۔ اس جیت کی انتہا ہو گی جب تم چاند سا بچہ میرے حوالے کرو گی تم سے وعدہ ہے میں ہسپتال میں سب کے سامنے تمہارے پیر چھو لوں گا اس لئے کہ ماں بن جانے کے بعد عورت کا مقام خدا کی طرح عظیم اور بلند بن جاتا ہے۔

تم نے کھانا پکا لیا ہے ۔ اب تم نسیم کے ہاں جاؤ گی ۔ میں یہاں بیٹھے تمہارے بارے میں سوچتا رہوں گا اور ایک دم اداس ہو جاؤں گا ۔ ابھی سے اداس ہونے لگا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ میری جان نکل رہی ہے ۔ آؤ منو! پھر سے اپنے اندر ایک الاؤ بھڑکائیں اور جلیں —— تم صحن میں پھر رہی ہو ۔ میں تمہارے قدموں کی آواز سنتا ہوں ۔ اور پھر خط چھپا لیتا ہوں حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ تم جانتی ہو کہ میں ڈرامہ نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ تمہیں خط لکھ رہا ہوں ۔ پھر بھی تم سے خط چھپا رہا ہوں ۔ پاگل ہوں نا میں اب تمہیں خط دینے والا ہوں ۔ میں ہمیشہ تم سے پیار کروں گا اور اور اس کے بدلے میں تم سے یہ بھی نہیں مانگوں گا کہ تم مجھ سے پیار کرو ۔ کیونکہ تم اب ماں اور ماں سے محبت کی طلب نہیں کرتے ، ماں ، سراپا محبت ہوتی ہے

تمہارا شمی

جمیل ملک کے نام

(مظفرآباد — ۲۹ مارچ ۱۹۵۷ء)

پیارے جمیل ملک ایم اے

دفتر میں بیٹھا ہوں اور تمہیں خط لکھ رہا ہوں —— تمہیں خط نہ لکھوں تو اور کسے لکھوں ؟ ! جب سوچتا ہوں کہ اب عید سے پہلے تمہاری دید ناممکن ہے تو خیال آتا ہے کہ تم عید کے چاند ہو لیکن میری جان ! جانے تم کس کے افق پر تمناؤں کا حسین ماہتاب بن کے چمکتے ہو ۔ کبھی کبھار ایک آدھ کرن ہمارے نہاں خانۂ تصوّر کو بھی روشن کر جاتی ہے ۔ لیکن ایک آدھ کرن سے کیا ہوتا ہے ! جانے وہ کیا لوگ ہوں گے جن کے آئینۂ دل میں تمہارا چاند سا چہرہ چمکتا ہو گا ۔ پیارے ہم

نے بھی تمہیں جاناں سمجھ کے تمہاری صورت تصویر جاناں کی طرح دل کی دیوار پر سجا دی ہے۔ لیکن تم ——— خیر رہنے دو!

موسم ابر آلود ہے اور دل ایک بے نام سی اداسی کے بوجھ تلے دبا جا رہا ہے۔ یہ ہنگم اور ننگے پہاڑوں سے گھری ہوئی اس مختصر سی آبادی میں ہمیشہ آپ یاد آتے ہیں۔ وہ ہنگامے یاد آتے ہیں جن سے ہماری زندگی مشترکہ طور پر متاثر بھی رہی ہے اور عبارت بھی یہیں حالات نے ناموزوں جگہ پر قید کیا ہے اور مجھے دور پہاڑوں کے دامن میں! کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے یہ جگہ ایک بہت بڑا بدنما پیالہ ہے جس کی تہہ میں بیٹھا میں کبھی چاند کو اور کبھی محض چاندنی کو دیکھ کے جی رہا ہوں ——— کتنا بڑا المیہ ہے یہ جمیل! ——— جمیل تم مجھے جانتے ہو اندازہ لگاؤ کہ زندگی کی ہماہمی، دوستوں کے پیار اور تمہارے نہایت سودمند مشوروں سے جب مجھے ایک دم علیحدہ کیا جائے تو میری کیا حالت ہوگی

یہ خط میں نے اپنی طرف سے نہایت ہی LIGHT MOOD میں شروع کیا تھا، لیکن آہستہ آہستہ جب اپنے واضح سماجی پس منظر میں تم یاد آئے ——— تمہارے دکھ تمہاری مجبوریاں، تمہاری محرومیاں اور پھر اپنی کس مپرسی، گھر سے دوری نہیں بھائی اور ماں کی بے پناہ شفقت سے محرومی کا خیال آیا تو وہ LIGHT MOOD اداسی میں بدل گیا

اب میں سوچ رہا ہوں کہ تمام تر علم کے باوجود ہم کیا ہیں؟ ہماری حیثیت اُن تنکوں سے کسی طرح مختلف نہیں جو کف اڑاتے ہوئے دریا میں قہر آلود موجوں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں! ——— ہمیں دریا کے بہاؤ کا علم ہے، لیکن کیا ہم دریا کے بہاؤ کو روک سکتے ہیں؟ جمیل! میں قنوطی نہیں یہ جبر و اختیار کا بے معنی فلسفہ بھی نہیں، لیکن یہ ایک زندہ حقیقت ہے! تم نے کیا نہیں کہا ——— کوئی اسی اچھائی نہیں

گی، کس کس کا بھلا نہیں کیا لیکن ان تمام چیزوں کا کیا یہی صلہ ہے؟ خیر چھوڑو ان باتوں کو، ان تیز ناخنوں سے اپنے زخم کیوں چھیلنا شروع کریں۔

ہاں —— تو پنڈی کا کیا حال ہے —— ؟ کلیم کا معاملہ سلجھ گیا ہے، والدہ کا کیا حال ہے۔ انہیں میری طرف سے بہت پوچھنا کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں ان کے لئے یا جمیل ہوں یا بتول، ان کی بے پناہ شفقت کا ہمیشہ احساس رہتا ہے، قیوم صاحب کو میرا سلام کہنا اور کلثوم کو بہت بہت پیار۔

تم خود کس حال میں ہو —— نہیں تمہارا حال کیا پوچھوں، اپنے حالات کے آئینے میں تمہاری صورت دیکھتا ہوں۔ ضرور لکھنا اور ہاں ظفر صاحب کو میرا سلام کہنا۔

تمہارا اپنا

احمد شمیم

میرپور — ۹، اگست ۱۹۵۷ء

عمر گریزپا سے پیارے جمیل!

آج ہی تمہارا خط ملا ہے، اور اب جواب لکھ رہا ہوں اگر غالب نے یہ شعر نہ کہا ہوتا تو شاید آج میں ضرور کہتا:

خط لکھیں گے اگرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہم عاشق ہیں تمہارے نام کے

جمیل! یہ تعلی نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جس طرح میں تم سے پیار کرتا ہوں شاید ہی اس طرح تم سے کوئی پیار کر سکے۔ اس میں سے مراد وہ نہیں ہے۔ جو میرے دل کی گہرائیوں میں چھپا رہتا ہے جسے میں صرف اس وقت جانتا ہوں یا پہچانتا ہوں جب تنہائی کے

نہایت تلخ، کربناک اور زہر آلود لمحوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں تو اس حد تک اپنے آپ کو تم سمجھتا ہوں کہ جب تمہاری کا چیز، تمہارا نام چھپا ہوا دیکھتا ہوں تو وہی مسرت اور تسکین حاصل کرتا ہوں جو مجھے اپنا نام دیکھ کے ہوتی ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ زمانہ حد سے زیادہ ستم کوش اور —— زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد والا معاملہ ہے۔ ورنہ ہمارے دل میں بھی کیا کیا نہ کریں گے"! والی خلش ہے بہر طور رہو رہے گا کچھ نہ کچھ ——!

M.ED کرنے کا خیال نہایت عمدہ ہے ایک دم فسٹ کلاس ہے۔ لاہور میں تم رہو گے تو ویسے بھی ادبی طور پر بہت ہی آگے بڑھنے کا موقع ملے گا۔ اس زندگی میں ہمیں بہر طور . . . . STRUGGLE FOR EXISTENCE اور فراموش کردہ NATURAL SELECTION کے اصول کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ آخر ڈارون جاہل مطلق تو نہیں تھا۔ اسی نوے سال کی بے اندازہ ریاضت محض ذہنی خرافات پیدا نہیں کر سکتی۔ پیارے آگے بڑھنے کے لئے (ادبی طور پر) ہر دور میں لٹھ لے کے اپنی شخصیت کو منوانا پڑھتا ہے۔ تم چونکہ ادب کو خلوص اور ایمانداری اور . . SERIOUSNESS کے ساتھ اپنا چکے ہو اس لئے اس محبوبۂ جاں سوز کے غمزے بھی سہہ لو ——! میں تو منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے چیزیں رگیدتا ہوں، کھانے کا انتظام ہو ہی جاتا ہے۔ تم لاہور تو جاؤ۔

پیٹکو ریل کا معاملہ تم نے غلط سمجھا ہے۔ وہ میری زندگی سے متعلق کہانی ہے۔ جب میں تحریکِ آزادِ کشمیر کے سلسلے میں کام کرتا تھا۔

چنانچہ LAZY-BONES (ایک کردار ہے) میں اور مجھ میں کچھ نہ کچھ ضرور مشترک پاؤ گے! تمہارے متعلق میں بڑی خوبصورت انگریزی کہانی لکھ رہا ہوں جس کا عنوان ہے "SONG OF THE SOUL" یہ کہانی تلخ بھی ہے، ترش بھی ہے اور شیریں بھی پیارے جس طرح میں تمہیں دیکھتا ہوں ـــــ بس وہی ہو تم میری نظر میں!!

منگلا کا تو میں نے پچھلی چھٹی میں لکھ دیا تھا۔ عزیز حسن صاحب نے کسی کے کہے میں آکر اس POST کے لئے دوسرے کسی شخص کی سفارش کی اور اس طرح سے تین سو کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔

سنو، یہ DEMAND & VALUE والا کیا قصہ ہے؟ جانِ من! میرا اگر اس سلسلے میں کوئی خلوص سے چاہنے والا ہو تو وہ کرب، وہ تضاد، وہ یاس جو ویسے تمہیں نظر آتی ہے، کہاں ہوئی؟ کیوں ہوتی؟! پیارے تم نے خود ہی تو اس تلخ حقیقت کو شعر میں ڈھال دیا ہے۔

جو ملا صورتِ زیبا کا خریدار ملا

صورتِ زیبا کی صورت تو مختلف ہوتی رہتی ہے۔ ورنہ نوعیت اور اصلیت کے اعتبار سے وہی بات ہے۔ زندگی کو خلوص کو ہمدردی کو ہر زمانے میں سرمائے کے پیمانے سے ناپا گیا ہے ـــــ پھر پیار کیوں نہ اس پیمانے سے ناپا جائے؟ ـــــ تمہارے پاس ہے کوئی جواب؟ جواب دینے سے بیشتر اس حقیقت کو رد کرنے سے پہلے اپنے آپ کو دیکھو ـــــ تم کیا نہیں ہو، ہاں چونکہ تم مل کے مالک، کار والے صاحبِ دولت نہیں، اس لئے فی الحال کچھ بھی نہیں ہو ـــــ بعد میں دنیا تمہیں ہومر و رتجل ہی کیوں نہ سمجھے لیکن وہ تو اس وقت ہوگا جب تمہاری قبر پہ چراغ جلے گا۔

لیکن میری جان! اور حیاتِ ماغریبان نے چراغنے نے گلے! ——— گولی مارو اس قصّے کو!

ہاں تو تمہارا CHAMBER ٹھس ہو رہا ہے یا ٹھپ ہو رہا ہے۔ میری جان" پائے گدا لنگ نیست! اور اب تم تو M.A بھی ہو۔ ایک دفعہ ریڈیو اسٹیشن بھی میرے لئے ٹھپ ہوا تھا، زندگی میری جان! یوں ایک دم ہی غچہ نہیں دے جاتی، ہم اس سے پیار کرتے ہیں اور وہ بھی یہ سمجھ لیتی ہے ——— ہائے یہ عشوہ گر حرافہ! میں نے ایک نظم (ادبِ لطیف) کو بھیجدی ہے۔ چھپ جائے گی تو تم بھی دیکھ لوگے۔ لیکن اس سے پہلے ہی میں تمہیں وہ آئندہ خط میں لکھ کے بھیج دوں گا۔ آج کل کچھ نہ کچھ لکھنے کو جی چاہ رہا ہے ——— اور لکھنے کی کوشش کرتا ہوں! تم کیا کیا کر رہے ہو! شفقت تنویر مرزا ملے تو میرا سلام کہنا اور احمد ظفر کو بھی۔ وگی کا کیا حال ہے، تمہاری شامیں کیسی گزر رہی ہیں، اپنا حال نہ پوچھو،

چاند ڈوبا غمِ تنہائی کی آتش بھڑکی
چاند اُبھرا تو سلگنے لگا دل کا دامن!

والدہ کا کیا حال ہے؛ ——— انہیں میری طرف سے بہت بہت پوچھنا، وہ اکثر یاد آتی ہیں۔ قیوم صاحب سے بھی میرا سلام کہنا، چھیمو کو پیار!

تمہارا اپنا
احمد شمیم

میرپور آزاد کشمیر
۶ بجے شام — ۱۳؍اپریل ۱۹۵۸ء

جمیل میری جان

بہت اُداس شام ہے۔ دل پر ایک بے نام بوجھ محسوس ہو رہا ہے جو لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا ہے۔ اگر تمہیں خط نہ لکھوں تو ساری رات بے قرار رہوں گا۔ خدا جانے غم ایک سیال مادے کی طرح ریشے ریشے میں کیوں دوڑ رہا ہے۔ رونے کو جی کرتا ہے ——— جمیل بہت رونے کو جی کرتا ہے۔ اب تمہیں پاس بٹھایا ہے تو تم سے باتیں کرنے لگا ہوں۔ تمہارے بغیر اپنی زخم زخم زندگی کی کہانی سنا ہی کسے سکتا ہوں ——— اب سارے اُفق پر تم ہی ایک تنہا ستارے کی طرح ہو ——— باقی اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اور اگر تمہیں بھی اندھیرا نگل جائے پھر میری زندگی میں کیا رہے گا؟! یوں بھی میری زندگی میں دکھوں، حسرتوں، مایوسیوں اور ناکامیوں کے سوا کیا ہے!

ابھی ابھی ہنڈری سے لوٹا ہوں ——— سوچتا ہوں کل دفتر میں مجھے شاید تمہارا کوئی خط مل جائے لیکن کل تک کون انتظار کرے۔ جمیل! میری زندگی میں جب بھی کوئی گھاؤ پیدا ہوتا ہے، کوئی خلا پیدا ہوتا ہے میں ہمیشہ اُسے تمہاری یاد سے بھرتا ہوں ——— یہ خود غرضی ہے لیکن کیا کیجئے ——— تم ہی بتاؤ۔ یا تو تم بھی مجھے ان بے شمار دوستوں کی طرح چھوڑ جاؤ جو کل تک میرے ساتھ تھے اور اب کہیں بھی نہیں، اُن کے نظریات، عقیدے، فلسفہ ——— جمیل! یہ کتنا ناقابلِ یقین المیہ ہے کہ انسان ہزار خوشنما پردوں میں محض اپنی غلاظت اور ننگے پن کو چھپانے کے لئے بہروپ بھرتا ہے! ———

پر میری جان! تم یہ باتیں مجھ سے زیادہ جانتے ہو! (اور میری طرح تمہارے لئے بھی یہی المیہ ہے)

ہاں ـــــ ابھی ابھی پنڈی سے لوٹا ہوں۔ وہ چند مسکراہٹیں چند اشارے جو وہاں سے اپنی محفل سجانے کے لئے اُٹھا لایا تھا اب اس تنہائی میں ناسور سے بن گئے ہیں۔ میں تو ان سے اپنی تنہائی میں رنگ بھرنا چاہتا تھا، لیکن جمیل محض اشارے محض کتنے تو بھالے لگتے ہیں جو چھید ڈالتے ہیں!

پنڈی سے چند لمحے دامن میں بچا کے لایا تھا، لیکن وہ لمحے اب کرچیاں بن کر ذہن کو کرید رہے ہیں اور سوچتا ہوں کہ جب بھی اور جسے بھی خلوص اور خلوص سے چاہا وہ اپنے لئے زخم بن گیا۔

جمیل تم خدا کے واسطے کبھی یہ صورت اختیار نہ کرنا۔ کیونکہ اب تم ہی ہو جس کے ساتھ مل کر آنسو بہا سکتا ہوں۔

تمہارا خط ملنے سے پہلے ہی میں والدہ سے مل چکا تھا، خط ملنے کے بعد دوسری بار ملا، اور پھر جب تک پنڈی میں رہا روز ہی ملتا رہا جمیل والدہ نے مجھے اس طرح سے پیار کیا ہے۔ جیسے میں جمیل تھا دراصل مجھ میں اُسے اب تمہارا ہی عکس نظر آتا ہے۔ مجھے اس نے اپنی پُر خلوص دعاؤں کی دولت عطا کی مجھے جمیل والدہ سے مل کے یوں محسوس ہوا ہے جیسے سوکھی پیاسی زمین پر چھما چھم بادل برسے ہوں تمہاری بیٹھک میں تمہاری ہر چیز کو محسوس کیا ہے اور اس آئینے میں بھی اپنا چہرہ دیکھا جس میں ہر آدمی کا چہرہ غیریت کی حد تک بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ تم بے اختیار یاد آئے، بہت یاد آئے تم جمیل! اور پھر جب گھر آیا تو تمہارے سارے لکھے ہوئے خطوط پڑھ لئے تمہاری زندگی میں امنگوں، حسرتوں اور تمناؤں کا عکس پایا! جمی، تمہیں

بہت یاد کیا ہے۔ یہ آٹھ سات دن اور جب یہ خیال آتا تھا کہ زمانہ نہ معلوم ہمارے درمیان کتنی بڑی خلیج بن کے حائل رہے، تو ہول آتا تھا۔ لیکن کوئی بات نہیں پیارے، ہم ایک ہیں، اور یہ مجھے اس وقت بھی محسوس ہوا جب تمہارے گھر کا ہر فرد مجھ سے ملنے کے لئے اتنا ہی بے چین نظر آتا تھا جتنے تم ہو۔ قیوم صاحب سے بھی اسی لئے میں دوبارہ ملا ہوں۔

اچھا پیارے میں نے پرچے (جیسا کہ تمہیں یقین تھا) اچھے کئے ہیں۔ نمبروں کی ضرورت نہیں، پاس ہو جاؤں گا۔ جمیل آٹھ دن پڑھائی کی ہے۔ پاس بھی ہونا غنیمت ہے۔ البتہ اب تمہیں مجھے ایم۔اے کرانا ہے۔ اس سلسلے میں ابھی سے مجھے کچھ کیا کرنا ہے۔ تم یوں محسوس کرو کہ احمد شمیم نہیں بلکہ تم خود دوبارہ ایم، اے میں داخل ہو رہے ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کب آؤ گے؟ تمہارا یہاں آنا اتنا ضروری ہے — !

مقبول کا رول نمبر ملا ہے۔ کیسٹی بہت بہت شکریہ، اس کی امی تمہیں منتوں اور مسلسل دعائیں دیتی ہیں — اور اب بار بار تمہیں یاد کرتی ہیں اور دعائیں دیتی ہیں۔ ہم ناداروں کے پاس اور ہے ہی کیا۔ لیکن جمیل یہ بھی بہت ہے۔ کیوں ہے نا! میری جان مجھے فوراً لکھو یہاں کب آؤ گے؟ —— کسی اور پروگرام کو بیچ میں حائل نہ ہونے دینا، سمجھے۔

فقط تمہارا اپنا
احمد شمیم

(میرپور آزاد کشمیر)

۴ اپریل ۱۹۵۸ء

جان سے پیارے جمیل

تنہا بھی ہوں۔ اداس بھی ہوں۔ تمہیں خط لکھ رہا ہوں تو اپنی تنہائی کا اور بھی احساس ہوتا ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اپنی ہی آگ میں کب تک یونہی جلنا ہے۔ زندگی گیلی لکڑی کی آگ کیوں بن گئی ہے! کاش ہم لوگ ایک ہی بار بھڑک کے بھسم ہو جاتے۔ قدم قدم پر ناکامیاں ——— آخر یہ سب کچھ ہمیں ہی کیوں دیکھنا پڑتا ہے۔ بعض اوقات ارد گرد زندگی اس شدت سے مہک اٹھتی ہے کہ خواہ مخواہ رو دینے کو جی کرتا ہے اور پھر یہ احساس کہ ہم اپنے ہی دکھوں کے جزیرے میں ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے اسیر ہیں ——— بھائی تم ہی کچھ کہو، آخر ہم کہاں تک اس زندگی سے اس طرح نباہ کریں۔

جمیل دل میں کیا کیا ارمان تھے۔ اور پھر کسی زمانے میں اپنی امیدوں کے محل اس دھرتی پر تعمیر کرنے کا "دم خم" بھی تھا، لیکن اب تو معلوم ہوتا ہے یہ سب ایک فریب تھا۔ وہ تو پردے حائل تھے اور اب جو یہ پردے ہٹ گئے ہیں تو سامنے اپنی بے بسی اپنا منہ چڑاتی نظر آرہی ہے۔ شام کو یہ بڑا چاند طلوع ہوتا ہے تو اپنی بے کسی اور تنہائی یوں بول اٹھتی ہے جیسے پانی کی بوند آگ میں گر کے بول اٹھے ——— اور ہر قدم پر یہی محسوس ہوتا ہے۔ آج کل دنیا سے یوں قطع تعلق کیا ہے، کہ ذہنی اور جسمانی طور پر اپنے دکھوں کے جزیرے میں مقید ہو کے رہ گئے ہیں۔ تمہارا کیا حال ہے؟ ——— تم اجنبی انسانوں

سے بھرے جنگل میں ہر صورت کو حیران تکتے ہو کہ نہیں؟ لاہور بھرا بھرا شہر ہے نا؟ لیکن مجھے معلوم ہے تمہارے اور زندگی کے درمیان کتنا ناقابل عبور فاصلہ ہے۔ وہ جو تم نے اکسیر اعظم کی بات کی ہے۔ تو مجھے یا اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش کیوں کرتے ہو۔

اکسیر اعظم نہ تمہارے پاس ہے نہ ہوگا —— تم اپنے آپ کو فریب دینا چاہتے ہو۔ ہم یہ بھی نہ کریں تو یہ پہاڑ سی تنہائی کی گھڑیاں کیسے بیت جائیں گی۔ تمہارے خط سے مجھے تمہارے بارے میں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک اور گھاؤ ایک اور زخم تمہیں نصیب ہوا ہے —— سنبھالے رکھو ان زخموں کو، پھر انہیں قیمتی تجربات کا حسین نام دے کر خوش ہو جانا، لیکن ہم بھی کیا کریں شاعر ہیں نا،

ہم نے خود اپنی تمنا کو بنایا ہے صلیب
صلیب، کبھی مسیح کے حصّے میں آئی، یا کبھی میرے تمہارے
اور ہم جیسے ہزاروں لوگوں کے حصّے میں!

میں نے عید پر پنڈی جانے کا فیصلہ کیا تھا۔
سو وہ بھی نہ ہوا!

۲۶ تاریخ کو پنڈی جاؤں گا امتحان کے سلسلے میں۔ اب کسی ڈھنگ سے پڑھائی شروع کی ہے۔ پاس ہو ہی جاؤں گا۔

تمہارے لئے بہت بہت پیار
تمہارا اپنا
احمد شمیم

ترجمہ

پابلو نرودا

ترجمہ: اعجاز احمد

ماچوپی چو کی چوٹیاں

پتھروں کی سنگلاخ فصیل، اور انسان، وہ کہاں تھا؟
برفیلی ہواؤں کے پیچ وتاب، اور انسان، وہ کہاں تھا؟
وقت درونِ خانۂ وقت اور انسان، وہ کہاں تھا؟
کیا تم بھی تلوّن کے ایک شکستہ کا نچ تھے، ایک کھوکھلے
عقاب کے بوسیدہ پنکھ،
جو وقتِ حاضر کی گلیوں میں سے، پرانے رستوں پہ اڑتا،
ساری خزاؤں کے جھڑے ہوئے پتوں سے گزرتا،
ماتمی تازیانوں کے ساتھ مرقدوں کی راہ لیتا ہے؟
محتاج پاؤں، محتاج ہاتھ، اور محتاج، عزیز زندگی....
تیرے باطن میں بے مثال روشنی کے
وہ دن، وہ شناسا بارش
جو نوروز کے ہر شوخ ہدف پہ برستی رہی،
کیا روشنی اور بارش نے بھی اپنی تاریک غذا،
ایک ایک پنکھڑی کر کے،

ایسے خالی دہن کو عطا کی تھی ؟
قحط، انسانیت کے سنگدل پہاڑ،
بھوک، لکڑہاروں کی جڑ، رازبستہ کونپل،
قحط، مجھے بتا، کیا تیری کھردری چٹانیں تھیں
کہ ان چھڑی، فلک بوس چٹانوں کو چوم چوم آئیں۔
شاہراہوں پہ بکھرے ہوئے نمک، میرا سوال تجھ سے ہے،
میری آنکھیں تیرے اوزار دیکھنا چاہتی ہیں، فنِ سنگتراش، مجھے اجازت
کہ تیرے نفیس کنڈوں پہ اپنی چھڑی آزما سکوں،
ہوا کی ساری سیڑھیاں چڑھوں جو خلا کی سمت جاتی ہیں،
تیرے شاہکار کی انتڑیوں میں سے انسانیت کا سراغ لا سکوں۔
ماچو پی چو! کیا تو نے، چٹان در چٹان،
پتھروں پہ پتھر اٹھانے کے واسطے
فقط چیتھڑوں کا فرش بچھایا تھا ؟
کوئلے پہ کوئلوں کے ڈھیر، اور تہہ میں فقط آنسو ؟
آگ کے طلائی نقش، اور سونے میں کشید،
لہو قطرہ قطرہ سمیٹنے کے واسطے فقط وہ حریص کشکول ؟

وہ غلام مجھے لوٹا دو جو تم نے یہاں دفن کیا !
مفلسوں کی باسی روٹی ان کھیتوں میں سے

علاحدہ کردو، دکھاؤ وہ پیوند
جو مزارع کی عباؤں میں لگے۔
بتاؤ، اس کے گھر میں کھڑکی کدھر تھی؟
بتاؤ، وہ زندہ تھا تو کیسے سوتا تھا؟
خرّاٹے لیتا تھا؟
دیوار کی سمت رخ کیے، تھکن سے چور،
اس کا منہ سیاہ گھاؤ کی طرح کھلا ہوا؟
اور وہ دیوار! وہ دیوار!

کبھی ایسا نہ ہوا
کہ پتھّروں کا ہر ایک فرش
اس کی نیند پہ جھک آیا ہو، اور،
جیسے کوئی چاندنی کی ٹھنڈک میں پسر جاتا ہے،
وہ نیند اور پتھّروں تلے جھکتا چلا گیا ہو؟

عتیقی امریکہ، اپنے سمندر کے عروس میں لپٹی دلہن
تیری انگلیاں بھی تھیں،
جنگل کی سرحدوں سے دیوتاؤں کی نایافت سرفرازیوں تک،
پوجا اور روشنی کے شب رنگ پرچموں تلے،
نیزوں اور نقاروں کی گھن گرج میں شریک،

تیری انگلیاں، تیری انگلیاں ——
جاڑے کا سیندور اور ذہن میں چٹکتا گلاب تھامے،
مادے کی زرّیں نقش گری ہیں
لہلہاتی فصلوں کی خوں ریز چھاتی گپھاؤں کے تاریک سلسلوں تک پھیلائے۔
ان کے ہمراہ، ان کے ہم رکاب، مدفون امریکہ، کیا تو بھی
ان عمیق گہرائیوں میں موجود تھی،
اس زہریلے ہاضمے کے اندر،
جس کے خزانے بھوک کے بدنیت عقاب نے بھرے ہیں۔

(محراب لاہور)

فولکر فان ٹورنے

منیر الدین احمد۔ ہمبرگ

جنگی کھیل

(جرمن سے ترجمہ)

بچے سڑکوں پر
جنگ کھیل
رہے ہیں

بہت جلد جب وہ
بڑے ہو جائیں گے تو
جنگ اُن کے
ساتھ کھیلے گی

(اردو انٹرنیشنل کینیڈا)

فولکر فان ٹورسنے

منیر الدین احمد۔ ہمبرگ

اضطراری حالت

(جرمن سے ترجمہ)

چوروں کے
سپرد کیا میں نے
اپنا گھر

چھوٹوں کو
میں نے
ووٹ دیئے

قاتل
میری نیند
پر پہرہ دیتے ہیں

(اُردو انٹرنیشنل کینیڈا)

ایریش فریڈ
میزالدین احمد

آخری قابل حل مسئلہ

(جرمن سے ترجمہ)

جب کتے مرجھانے لگیں
بھونکتے ہوئے پھولوں کے درمیان
جب جنگل کام کرتے جائیں
کاغذ کی فیکٹریوں میں
جہاں پر انسانوں کے
ٹکڑے کیئے جاتے ہوں

وہاں دنیا کے نظام میں کچھ گڑبڑ ہے
مگر کچھ ایسی زیادہ نہیں
ایک دو لکیروں کے کھینچنے سے
سب کچھ ٹھیک ہوسکتا ہے
بغیر خون بہانے کے
اور بغیر مرنے کے

(اُردو انٹرنیشنل کینیڈا)

شیخ ایاز
نور محمد شیخ

جیل میں بلیک آؤٹ

جیسے ہی کھولی پر چاند کھلتا ہے
کوئی پرانا زخم پھر سے ہرا ہو جاتا ہے
جو بھی بیڑی کا کش کھینچتا ہے
چوکیدار اُس پر بھنّاتا ہے
میرا من سوچ رہا ہے
ممکن اور ناممکن کے متعلق
بمباری کے خوف سے بجلی
روز بجھائی جاتی ہے
مگر وہ چودھویں کا چاند کھلا ہوا ہے
(یہ رات ہی نہیں ہے، یہ دن کا سماں ہے)
اسے کوئی کیوں نہیں بُجھا دیتا
"اسے کون بُجھا سکے گا!"

(اُردو انٹرنیشنل کینیڈا)

فرانز کافکا
منیرالدین احمد، ہمبرگ

مختصر داستان

(جرمن سے ترجمہ)

"ہائے ہائے" چوہے نے کہا۔ "دنیا دن بدن تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ ابتدا میں وہ اس قدر وسیع تھی کہ مجھے ڈر لگتا تھا۔ میں چلتا گیا اور خوش ہوا جب میں نے بہت دور دائیں اور بائیں دیواریں دیکھیں۔ مگر یہ طویل دیواریں اس قدر سُرعت کے ساتھ ایک دوسرے کی جانب لپک رہی ہیں کہ اب میں آخری کمرے میں آن پہنچا ہوں اور وہاں پر ایک کونے میں پنجرہ دھرا ہے جس کی طرف میں نے رُخ کر رکھا ہے۔"

"تمہیں چاہیئے کہ اپنی دوڑ کی سمت کو بدلو" بلی نے کہا اور اسے ہڑپ کر گئی۔

متھیاس ہوفمان ———— جرمن سے ترجمہ ———— ڈاکٹر منیر الدین احمد

میری چارپائی کھڑکی کے پاس ہے

اس افسانے کا مصنف ۱۹۶۱ء میں پیدا ہوا اور اس نے نو عمری میں افسانہ نگاری کا اس شان سے آغاز کیا کہ صرف ۱۸ سال کی عمر میں یعنی ۱۹۷۹ء میں اس نے ذیل کے افسانے پر بہترین جرمن کہانی کا انعام حاصل کیا۔

مترجم

میری چارپائی کھڑکی کے پاس ہے کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ میرے بھائیوں کی چارپائیاں بھی اُسی کمرے میں ہیں اور اباجی کا کہنا ہے کہ ڈبل ڈیکر چارپائیاں نہیں لیں گے۔ وہ انہیں فوج کے دنوں کی یاد دلاتی ہیں۔ ہوا کچھ ایسا تنگ نہیں کرتی اور مجھے کھڑکی والی جگہ پسند ہے، صرف اُس وقت سے نہیں جب سے مجھے بیماری لگی ہے۔

سبھی اُسے محض "بیماری" کے نام سے پکارتے ہیں اور جب ملاقاتی آتے ہیں، تو وہ مجھے عجیب سے انداز میں دیکھتے ہیں اس طرح جیسے وہ افریقہ کے غریب فاقہ زدہ بچوں کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ مجھے اجنبی لوگوں سے ڈر لگتا ہے۔ وہ اونچی آواز سے بولتے ہیں۔ مردوں سے سگرٹوں کی بُو آتی ہے اور پسینے کی اور اکثر عورتیں ایک عجیب سا عطر استعمال کرتی ہیں اور وہ حد سے زیادہ محبت کا اظہار کرتی ہیں مگر دل سے نہیں۔ پھر میں انہیں باہر گیلری میں باتیں کرتے ہوئے سنتا ہوں اور ہر لفظ کو سمجھتا ہوں۔ مثلاً میں گھڑی بھر کے لئے تمہیں دیکھنے آ گئی ہوں۔ گیرٹروڈ، یا کوئی ایسی

اور بات۔ گیرٹرووڈ میری ماں ہے۔

بعض اوقات مجھے ماں پر ترس آتا ہے کیونکہ اجنبی لوگ اُس وقت ایک عجیب انداز سے اس کی طرف دیکھتے ہیں اور شاید اُسے شرم آتی ہے کیونکہ مجھے کبھی کبھار بستر سے اٹھنے کی اجازت ملتی ہے اور جب مجھے حاجت کے لئے جانا ہوتا ہے تو کسی کو میری مدد کرنی پڑتی ہے۔

مجھے کھڑکی کے ساتھ والی جگہ پسند ہے میں گھنٹوں تک باہر دیکھ سکتا ہوں۔ بہترین منظر خزاں میں ہوتا ہے۔ تب اماں مجھے کوستی ہے اگر میں کھڑکی کو کھلا رکھنا چاہتا ہوں، مگر سردی کی کچھ ایسی پروا نہیں ہے۔ بعض اوقات خزاں میں زبردست جھکڑ چلتے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے بادلوں کو بہت جلدی ہے۔ جب اماں چند ایک سرہانے میری پشت کے پیچھے لگاتی ہے تو میں گرجا گھر کے مینار کو دیکھ سکتا ہوں اس پر بیٹھے ہوئے کبوتر نچلے نہیں بیٹھتے۔ ایک لمحے کے لئے بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ انہیں یوں بستر میں لیٹے رہنا اور باہر نہ نکل سکنا یقیناً نہ بھائے۔

میرے پاس ایک ٹرانسسٹر ریڈیو ہے میں نے اپنے بھائیوں سے کہہ دیا ہے کہ انہیں ہر وقت میری دیکھ بھال کی ضرورت نہیں ہے۔ اماں کی خواہش کے مطابق وہ باہر جاکر کھیلنے کو پسند کرتے ہیں اور یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے۔ یہ بات بھلا کسے بھاتی ہے ہمیشہ کہانیاں پڑھ کے سنانا یا کلے پیٹر کا کھیل یا "یار غصہ نہ کھاؤ" نامی کھیل کا کھیلنا۔

پہلے میں اکثر ریڈیو سنا کرتا تھا صبح سے شام تک۔ اب میں سوچ بچار کو ترجیح دیتا ہوں اس کے علاوہ مجھے ایک کھیل آتا ہے۔ در اصل یہ کھیل ہار جیت والا کھیل نہیں ہے۔ ہفتے کی شام کو چھ بجے سے سوا چھ بجے تک گھڑیاں بجتے ہیں، اُس گرجا گھر کے جسے میں دیکھ سکتا ہوں جس پر کبوتر بیٹھتے ہیں۔ بہت خوب ہے جب میں لیٹا ہوتا ہوں اور مینار کو دیکھتا ہوں اور اُس سے ورے آسمان کو جو خزاں میں سفیدی مائل ہوتا ہے۔ خصوصاً شام کا سماں، پھر اگر موسم خراب ہو تو بس مزا ہی آجاتا ہے۔ گھڑیال کی آواز بہت افسردہ

ہوتی ہے۔ اباجی نے بتایا جب میں نے اُن سے پوچھا کیونکہ وہ کمپنی کے میوزک کور سے وابستہ ہیں کہ یہ "مول" کا سُر ہے۔

جب بادل آتے ہیں اور بارش لگ جاتی ہے اور پھر گھڑیال بجتا ہے۔ کاریں نیچے والی سڑک پر کچھ ایسے سنائی نہیں دیتیں۔ تب میں اپنے آپ کو عجیب سا محسوس کرتا ہوں، جیسے میں صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا، یوں جیسے اس وقت جب میرا کتا ٹونی کار کے نیچے آ گیا تھا۔ میرا دل رونے کو چاہتا تھا مگر میں رو نہ سکا تھا۔ بس معاملہ بن نہ پایا تھا صرف یہ احساس جیسے انسان کے حلق میں کچھ اٹکا ہوا ہو اور اس کو باہر نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہو مگر وہ باہر نہ نکل سکے۔

اماں کا کہنا ہے کہ یہ گھڑیال کا کھیل بے ہودہ ہے اور مجھے اپنے آپ کو افسردہ نہ کرنا چاہیئے وگرنہ میرا دماغ چل جائے گا۔ مگر وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ سچ مچ انسان کو تہوار سا احساس ہوتا ہے۔ موسیقی یا کسی دوسری ایسی چیز سے کہیں بڑھ کر۔

میرا خیال ہے کہ میں بتا چکا ہوں کہ جب ملاقاتی آتے ہیں تو میں ہمیشہ سنا کرتا ہوں۔ تب میں فوراً جان جاتا ہوں کہ وہ فلاں عورت ہے یا کوئی دوسری، کیونکہ اتنی بلند آواز سے بولتی ہیں مگر جب وہ صبح بخیر یا کچھ اور کہہ چکتی ہیں تو پھر کھسر پھسر کرتی ہیں اور مجھے پتہ چلتا ہے کہ وہ میرے بارے میں باتیں کرتی ہیں۔ ہاں میرا خیال ہے کہ اماں کو بعض اوقات سچ مچ شرم آتی ہے۔

کل شام اباجی نے بتایا کہ مقابل والے مکانات گرا دیئے جائیں گے اور ان کی جگہ پر ایک اونچی عمارت بنے گی بیس منزلوں والی اور اباجی نے کہا کہ میرے لئے دیکھنے کی موج لگ جائیگی۔

مگر میں رو رہا تھا کیونکہ میں تب گرجے کا مینار نہ دیکھ سکوں گا اور نہ ہی کبوتروں کو اور گھڑیال کی آواز بھی ایسی دل آویز نہ رہے گی یقیناً یوں لگے گا جیسے وہ بہت دور سے آ رہی ہو۔

اگر میں بہت ہمت سے کام لوں تو کھڑکی کی سل پر چڑھ سکتا ہوں۔ ہم آٹھویں منزل پر رہتے ہیں۔ نیچے فٹ پاتھ ہے۔ میں نے سوچا کہ میں اپنے آپ کو نیچے گرا دوں تو کیسا رہے گا۔ غالباً مجھے بالکل احساس نہیں ہوگا۔ اس قدر تیزی سے کام تمام ہوگا۔ یہی بات ہے اُونچی عمارت میں مجھے کبھی دلچسپی پیدا نہ ہوگی۔

اندوخته

شمیم حنفی

ترقی پسند ادب اور جدید ادب کی مشترک قدریں

قصۂ قدیم و جدید دلیل کم نظری سہی مگر یہ کم نظری ہمارے یہاں اس حد تک مقبول ہوئی کہ ترقی پسند ادب اور جدید ادب کے اختلافات کا قصہ شروع ہوا تو ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند جنھوں نے خود کو ایک نئی حیثیت کا نقیب جانا، بڑی راسخ العقیدگی کے ساتھ اپنے اپنے تعصبات کے مرکز پر ڈٹے رہے۔ کچھ یہ بھی تھا کہ اس طرح یار دوستوں کو گرمیِ بازار قائم رکھنے کا ایک بہانہ مل گیا تھا۔ دونوں حلقوں نے یہ بات بھلا دی کہ ادب میں اقدار کا تصور مذاہب اور اخلاقیات کی اقدار کے تصور سے مختلف ہوتا ہے۔ یہاں بیشتر قدریں مذاہب کے برعکس مطلق نہیں ہوتیں بلکہ اضافی ہوتی ہیں اور زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ان کی ماہیت، معنویت اور ان کی طرف ہمارے رویوں میں بھی تبدیلی آتی جاتی ہے۔

ایک مختصر سا گروہ ان افراد کا بھی تھا جو جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع سمجھتے تھے۔ وہ دراصل اس بات کے لیے کوشاں تھے کہ نام چاہے بدل دیا جائے مگر سلسلہ اسی کام کا جاری رہے جو پرانے ترقی پسند روزِ اوّل سے کرتے آئے تھے۔ ان افراد نے جدیدیت میں بھی ایک نیا پہلو صالح جدیدیت کا نکال لیا اور کہا کہ یہی نئی ترقی پسندی ہے۔ ترقی پسند ادب

اور وہ ادب جسے جدیدیت کے میلان سے وابستہ کیا گیا، اس میں ایک بہت بڑا فرق تو یہ تھا کہ دونوں کی جمالیاتی سرشت ایک دوسرے سے مختلف بلکہ بعض معاملوں میں متضاد تھی۔ اختلاف کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ترقی پسند اپنے معیاروں کو حرف آخر سمجھ بیٹھے تھے اور پرانا یا نیا جو بھی ادب اس معیار کا حق ادا کرنے سے قاصر ہوا ان کے نزدیک غیر ادب تھا۔

ان اختلافات کے باوجود اگر ہم اشتراک کے پہلوؤں پر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ اپنی شدت کے باوجود یہ اختلافات اس درجہ اہم نہ تھے جتنا اہم انہیں سمجھا گیا۔ دنیا کی تمام جمہوریتوں میں شاید سب سے بڑی جمہوریت ادب کی ہے جہاں اختلافات ایک ساتھ شانہ بشانہ چلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ایک دوسرے کی نفی کے بغیر ہی انفرادی طور پر اپنے اپنے اثبات کی قوت رکھتے ہیں میر اور سودا کا ادبی مزاج ایک دوسرے سے مختلف تھا مگر دونوں نے ایک ہی ادبی معاشرے میں زندگی گزاری۔ اسی طرح انیس اور دبیر ایک ہی ادبی معاشرے سے وابستگی کے باوجود تخلیقی اور جمالیاتی سطح پر ایک دوسرے سے کوسوں دور رہے مگر عجیب بات ہے کہ ترقی پسندی اور جدیدیت کی لڑائی نے دو الگ الگ خیمے قائم کر دیئے اور ایک دوسرے سے بات کرنا تو دور رہا ایک دوسرے کو دیکھنے کے بھی روادار نہ رہے۔ اگر دونوں کی مماثلتوں ہی پر زور دیا جائے تو تفریحاً یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت آدم اور آج کے آدمی میں ہزاروں صدیوں کے فاصلے کے باوجود اشتراک کے کئی زاویے نکلتے ہیں۔ ادب میں تہذیب کی طرح انقلابات بھی آتے ہیں اور نت نئے رویے بھی اپنا اپنا دور اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ مگر ہر تہذیب اور ہر روایت کی ایک بنیادی وحدت بھی ہوتی ہے جس کا تسلسل کبھی بھی ٹوٹتا نہیں۔ اپنی بنیادی وحدت کسی تہذیب یا روایت کو اس کا چہرہ عطا کرتی ہے اور اس طرح اس کی پہچان قائم کرتی ہے۔ دور کیوں جائیے، اب تو بعض اہل علم یہ تک کہنے لگے ہیں کہ دلّی اسکول

اور لکھنؤ اسکول کا جھگڑا فضول ہے اور دونوں میں ایک جیسی خوبیاں اور ایک جیسی خامیاں دکھائی دیتی ہیں۔ سارا فرق بس درجات کا ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ ہر دور کے ادب میں کچھ رویے، غالب میلانات کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ترقی پسند تحریک کے ابتدائی برسوں میں اجتماعیت، افادیت اور مقصدیت کی اصطلاحیں بہت مقبول ہوئیں ۱۹۶۰ء کے بعد جب جدیدیت کے میلانات نے زور پکڑا تو یہی اصطلاحیں بیماریوں کی لغت میں ڈال دی گئیں اور ہر وہ شخص جسے جدیدیت کی ترجمانی کا دعوٰی تھا وہ اصطلاحوں کے بخیے ادھیڑنے لگا۔ جس طرح ترقی پسندوں نے اپنا ایک منشور بنا لیا تھا اسی طرح جدیدیت کے ترجمانوں نے بھی ایک دستور العمل بنانے کی ٹھانی اور کچھ ایسے اصول وضع کیے جنھیں شرعی قوانین کی حیثیت دے دی گئی۔ مگر چونکہ اس رویے کی بنیادیں ناقص تھیں اور اسی کے ہاتھوں ترقی پسند بھی خاصے خراب ہوئے تھے اس لیے بہت دنوں تک جدیدیت کے ترجمانوں کا یہ سلسلہ چل نہ سکا اور ان میں بھی ایک نوع کی فکری فرقہ بندی شروع ہو گئی۔ صالح جدیدیت، تقلیدی جدیدیت، روایتی جدیدیت وغیرہ جیسی اصطلاحوں کا چلن اب دھیرے دھیرے عام ہونے لگا۔ دوسری طرف یہ بھی ہوا کہ ترقی پسند ادیبوں میں کٹھ ملائیت کی لے رفتہ رفتہ دھیمی ہوتی گئی، انھوں نے بہت کچھ اپنے تجربوں سے سیکھ لیا تھا۔ راشد، اختر الایمان، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر جنھیں ترقی پسندوں نے اب سے آگے قابلِ اعتنا نہ سمجھا تھا یکایک ان کے ثناخواں بن گئے اور ان کی تحریروں میں انھیں اچانک ترقی پسند عناصر کا سراغ مل گیا۔ اور تو اور انتظار حسین تک جن کی ترقی پسندوں سے چھیڑ چھاڑ اب بھی جاری ہے، سردار جعفری کے لیے قابلِ قبول بن گئے ہیں اور انہوں نے انتظار حسین کی ایک کہانی کو ترقی پسند ادب کی چالیس سالہ تخلیقات کے انتخاب میں شامل کر لیا۔ ادھر نئی حسیت کے مفسروں میں بھی کچھ کشادہ قلبی کے آثار پیدا ہوئے

اور ترقی پسند ادیبوں کے نام سے جو تعصب اب تک روا سمجھا جاتا تھا اس کی جگہ اب یہ ہونے لگا کہ ترقی پسند تخلیقات میں اچھی تخلیقات اور بُری تخلیقات کے خانے بنا دیے گئے۔ افتخار جالب نے فیض کی شاعری کو ایک نئی لسانی تشکیل کی روایت کا حصّہ بتایا اور بعض ادیبوں نے کرشن چندر، مخدوم، احمد ندیم قاسمی عصمت چغتائی حتیٰ کہ سردار جعفری تک کی نئی تعینات پر زور دیا۔

یہ واقعہ خوش آیند ہے اس لیے کہ مغرب میں نئے اور پرانے ادبی میلانات کی کشمکش کے سلسلے میں جو رویے اب سے تیس سال پہلے سامنے آئے تھے، ہمارے یہاں ان کا ظہور کہیں اب جا کر ہوا ہے۔ مغرب میں MODERNISM بھی پرانی چیز بن چکی ہے اور اب وہاں POST-MODERNISM بھی رفتہ رفتہ پرانی ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارے یہاں خیالات فیشن کی طرح سال کے سال تو نہیں بدلے لیکن مقام شکر ہے کہ اب ان میں تبدیلیوں کی ضرورت کا احساس ترقی پسندوں اور نئے لکھنے والوں دونوں میں عام ہو رہا ہے — مغربی Avant Garde میں شروع ہی سے مستقبلیت Futurism اور احتجاج کے عناصر مقبول رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انھیں عناصر کے ساتھ ساتھ وہاں فنا پرستی اور مراجعت پسندی کے میلانات بھی اپنی چال چلتے رہے لیکن ہمارے یہاں نئی حسیت کو ایک عرصے تک صرف اس حسیت کا ترجمان سمجھا جاتا رہا ہے جس کے تانے بانے فرانسیسی انحطاط پسندوں نے ترتیب دیئے تھے۔ لوگ ایک ہی سانس میں میراجی اور افتخار جالب دونوں کو جدیدیت کا نقیب گردانتے رہے۔ یہی کچھ ترقی پسند بھی کر چکے تھے۔ اور بغیر کسی فرق و امتیاز کے ایک عرصے تک وہ ہر اس ادیب کو جو ترقی پسند نقطۂ نظر کا حامی تھا ایک ہی مرتبے پر متعین کرتے رہے۔ سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" کو پڑھتے وقت، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ فیض اور نیاز حیدر میں بہتر کون ہے جدیدیت کے علم برداروں میں آج بھی ایک ایسا حلقہ موجود ہے جو ترقی

پسند تحریک کے عطیات کا یکسر سے منکر ہے اور ان کے ہر عمل کو اپنے شعری تخلیقی اور فکری عمل کی ضد کے طور پر دیکھتا ہے ۔ مگر اس حلقے کا اعتبار رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا ہے اور اس کے تئیں یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ جس طرح بعض جدید ترقی پسندوں نے اپنی شدت پسندی کے سبب ہر ادبی رویے کو ایک سیاسی رویے کی حیثیت بخش دی تھی ۔ اسی طرح بعض جدیدیت نواز بھی ترقی پسندی کی جا و بیجا مخالفت کو اپنے سیاسی مصالح اور مقاصد کے قیام اور ترویج کے لیے ضروری سمجھتے ہیں ۔

ترقی پسند اور جدید ادب کی مشترکہ قدروں کا غالب حصہ تو ان اقدار پر مشتمل ہے جو ادب کی کائنات میں ایک نوع کی ابدیت کا نشان ہوتی ہیں ۔ یہ زمانے کے ساتھ بدلتی نہیں ہیں اور مرتے ہوئے عہد کی خاکستر سے پھر ایک نئی کروٹ لیتی ہیں نظریہ سازوں کی بات تو الگ رہی کہ انھوں نے ادبی اقدار کی حرمت کا کبھی لحاظ نہ کیا مگر ترقی پسند ادیبوں اور نئے ادیبوں کی تخلیقات پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ ادب کی بنیادی قدریں ایک خودکار طریقے سے مختلف اور متضاد خیالات رکھنے والوں کے یہاں بھی خود کو منکشف کرنے کی قوت رکھتی ہے ۔ واضح رہے کہ یہاں میرا اشارہ شریعت زدہ ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ جدیدیت کے ان فلسفہ طرازوں کی طرف بھی ہے جنھوں نے جدیدیت کو ایک CULT کے طور پر دیکھا اور اس کے گرد کچھ بے لوچ ذہنی، سماجی اور لسانی رویوں کا حصار کھینچ دیا ۔ انہوں نے یہ حقیقت فراموش کر دی کہ ادب یا تو ادب ہوتا ہے یا پھر غیر ادب بن جاتا ہے کہ مخصوص فکری اور لسانی میلان سے وابستگی کسی ادب کا شناس نامہ تو بن سکتی ہے مگر اس کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونے کی دلیل نہیں ہوتی ۔ ادب کی بنیادی طینت قدروں کو قبول کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی لکھنے والے کے نظریات سے سو فیصدی اختلاف رکھتے ہوں ۔ پھر بھی بہ حیثیت ادیب اس کی اہمیت اور معنویت

کے قائل ہوں ۔ افتخار جالب اور ان کی تقلید میں چند نئے نقادوں نے اس عہد کی ادبی حسیت سے ماضی یا روایت کو یکسر منہا کرنے پر زور دیا تھا بعضوں نے اپولونیر کے اس قول کو ایمان کے طور پر قبول کیا کہ تم اپنے باپ کی لاش کو کب تک گھسیٹتے پھرو گے ۔ مگر ادبی یا تہذیبی روایت نہ تو لاش کی مثال بے جان ہوتی ہے، نہ کیلنڈر کا ایسا ورق جو ہمارے لیے بیکار ہو چکا ہے ۔ ہر موسم میں گزری ہوئی فصلوں کے تجربے بھی سانس لیتے ہیں اور کوئی بھی حال ماضی کے احساس سے خالی نہیں ہوتا ۔ چنانچہ ادب کے جو اصول و ضوابط ہمارے بزرگوں نے ترقی پسند تحریک کے آغاز سے بہت پہلے متعین کیے تھے، ان میں سب کے سب وقت کے ساتھ فنا نہیں ہوئے ۔ کلاسیکی ادب کی نئی تحسین و تعبیر کا بھی جواز ہے ۔ اسی رویے کی روشنی میں ناصر کاظمی نے یہ بات کہی تھی کہ میر کے عہد کی رات ہمارے عہد کی رات سے آملی ہے اور انتظار حسین نے ایک موقع پر یہ بات کہی تھی کہ ماضی کے بعض اسالیب کو از سرِ نو زندہ رکھنے کی ہر کوشش اس بات کا پتا دیتی ہے کہ ہم ان گم شدہ اسالیب کے واسطے سے اپنی شخصیت کے گم شدہ حصوں کی بازیافت کرنا چاہتے ہیں ۔

یہ تو ہوا ادب کی ان اقدار کا قصہ جن پر تخلیقی تجربے کی طویل روایت نے مہرِ دوام ثبت کر دی ہے مگر ترقی پسند ادب اور جدید ادب کی مخصوص قدروں پر بھی نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان میں زمانی، ذہنی اور جذباتی فاصلوں کے باوجود ان کے مابین ایک پل بھی قائم ہے جو جذبے، احساس، جمالیاتی قدر اور فکر کی دو بظاہر مختلف دنیاؤں کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے ۔ یہ پل اس طرزِ احساس سے عبارت ہے جسے مغربی اواں گارد کے مفسّروں نے پیش پا افتادہ تہذیبی اور سماجی رویوں اور ان کی پروردہ جمالیات سے برگشتگی یا انکار کا نام دیا ہے ۔ اسی طرزِ احساس میں اپنے عہد کی سماجی، ثقافتی اور ذوقی

تبدیلیوں اور ان کے تقاضوں کا شعور بھی شامل ہے۔ یہ طرزِ احساس نہ تو روایتی ترقی پسندی کے قوانین کو حرف بہ حرف قبول کرتا ہے، نہ تقلیدی جدیدیت کے فکری اور لسانی ضابطوں پر ایمان لاتا ہے۔ اس نے ترقی پسندی سے وقت کی تبدیلی کا عمل اور اس کے ذہنی، جذباتی اور جمالیاتی نتائج کا شعور حاصل کیا اور اسے اپنے زمانے کے ذہنی و جذباتی ماحول نیز اس ماحول میں پنپنے والی جمالیاتی قدروں میں آمیز کرنے کی کوشش کی۔ گزشتہ چند برسوں سے جدید ادب میں سائنسی کلچر اور عقلیت پسندی سے نفرت، یامحرومی، تنہائی اور فنا پرستی کے میلان کی عبارت میں نمایاں طور پر کمی آئی ہے۔ اس کے برعکس زندہ رہنے کی توانائی سے عاری تصورات سے انکار، ایک نوع کی مستقبلیت اور حسرتِ تعمیر کے شغف میں اضافہ ہوا ہے۔ اظہار کی سطح پر بھی اب ابہام یا اہمال کی حیثیت نئے ادیبوں کے یہاں ایک اساسی جمالیاتی قدر کی نہیں رہی۔ بیان کی شاعری Poetry of Statement یا براہِ راست اور دو ٹوک لہجے میں بات کرنے سے اب نیا ادیب نہ تو شرماتا ہے نہ اُسے یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ اس قصور کے سبب وہ فن کے دائرے سے نکال باہر کر دیا جائے گا۔ سیاست یا سیاسی موضوعات اور تجربوں کا بیان اب شجرِ ممنوعہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ اسی طرح ترقی پسندوں کے یہاں بھی اب ان اصولوں پر اصرار خال خال ہی نظر آتا ہے جو انھیں اپنے پیشروؤں اور اپنے بعد آنے والوں سے الگ ایک دائم و قائم فکری اور تخلیقی استحالے کا نشان بناتے تھے۔ عالی قسم کے ترقی پسند بھی اب نئے لکھنے والوں کے یہاں انقلابی عناصر کی شناخت کرنے لگے ہیں، چنانچہ ابھی حال ہی میں احمد ندیم قاسمی نے ناصر کاظمی کے بارے میں یہ بات کہی کہ وہ مرحوم تو ایک باکمال رجز خواں تھا، اس کے یار دوستوں نے محض ترقی پسندی کی مخالفت کے نشے میں اسے گمشدہ لمحوں اور تجربوں اور یادوں کا نوحہ گر ثابت کر رکھا دیا۔

سردار جعفری صاحب نے ایک روز باتوں باتوں میں اس امر کی جانب اشارہ کیا کہ ترقی پسند ادب اور جدید ادب کے اختلافات پر بہت بحث ہو چکی، اب ہمیں صرف ان حقائق پر اصرار کرنا چاہیئے جن پر دونوں متفق دکھائی دیتے ہوں۔ دراصل انھیں حقائق کی زمین سے ترقی پسند ادب اور جدید ادب کی مشترکہ قدروں کا ظہور ہوا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم ظہور کے اس مسلسل بڑھتے اور پھیلتے ہوئے لمحے کا خیر مقدم کریں۔

مسعود اشعر

ثقافت اور قومی تشخص

آندرے کاردا کی ایک کہانی ہے۔ "میپ" ۔ دراصل میپ اس بچی کا نام ہے جو کہانی سنا رہی ہے ۔ کہانی ہے ایک ایسے ملک کی جہاں بچوں کو ان کی پسند کی تمام چیزیں ملتی ہیں ۔ وہ جس چیز کی خواہش کرتے ہیں وہ مل جاتی ہے ۔ وہ بچی اس ملک کی خوبیاں گنگناتے ہوئے جب اپنی خواہش کی انتہا کو پہنچتی ہے تو کہتی ہے ۔

" اس ملک کے بچوں کا جب بھی جی چاہتا ہے وہ بازار جاتے ہیں اور اپنی پسند کے ماں باپ خرید لاتے ہیں "۔

یہ کہانی مجھے ہمیشہ اس وقت یاد آتی ہے جب ہم سال دو سال کسی (HIBER-NATION) کے بعد اچانک ہڑبڑا کر اٹھتے ہیں اور اپنی ثقافت اور اپنے تشخص کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ دراصل یہ تلاش اندھیرے کمرے میں کالی بلی کی تلاش ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ کمرے میں اندھیرا ہم نے خود کیا ہے۔ ہم اپنے آس پاس دیکھنے کے بجائے کہیں دور دیکھنے کی کوشش میں اپنی بینائی بھی ضائع کر رہے ہیں اور دوسروں کی سمجھ بوجھ بھی ۔

کہتے ہیں تلاش اس چیز کی کی جاتی ہے جو موجود نہیں ہوتی یا اگر موجود ہوتی ہے تو آنکھوں کے سامنے نہیں ہوتی یا پھر وہ چیز جو پہلے موجود تھی اور اب کہیں کھو گئی ہے لیکن یہاں معاملہ ایسا نہیں ہے ۔ یہاں جس چیز کو تلاش کرنے کا اعلان کر رہے ہیں وہ موجود بھی ہے اور ہمارے سامنے بھی ہے ۔ لیکن ہم جان بوجھ کر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ بعض چیزوں سے ہمیں

الرجی ہے۔ ہم انہیں نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتے۔ اُنھیں دیکھنے سے ہمارے نازک جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکل آتی ہیں اور چونکہ ہم خود ان کی طرف نہیں دیکھنا چاہتے اس لیے دوسروں کو بھی ان کی جانب دیکھنے سے روکتے ہیں۔

الرجی کی بات میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ بات پروفیسر کرار حسین نے کہی ہے۔ اُنھوں نے کہا ہے کہ ہم کلچر کے بارے میں "حسِّ شدید" کا شکار ہو گئے ہیں۔ انھوں نے کہا۔

'ایک مرتبہ انہیں نزلہ زکام ہوا اور ان کا سر جس کی موجودگی کا پہلے احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ ان کے لیے ایک مسئلہ بن گیا اس لیے "حسِّ شدید" میں کلچر بھی ہمارا مسئلہ بن گیا ہے۔"

تو گویا ہم حاصل کی تحصیل میں لگے ہوئے ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ تحصیلِ حاصل کیا ہوتا ہے۔

اپنی ثقافت اور قومی تشخص کا مسئلہ محمد حسن عسکری کو بھی پیش آیا تھا جب ۱۹۴۸ء میں عسکری صاحب نے کہہ دیا تھا کہ سید امیر علی پاکستانی نہیں ہیں تو پھر میں بھی پاکستانی نہیں ہوں۔ میں جو ایک عقیدے کے تحت اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آگیا ہوں۔

۱۹۴۸ء کا زمانہ ایسا تھا جب اس قسم کی جذباتی باتیں ہمیں اپیل کرتی تھیں، ہم اپنے تمام محبوب اور پسندیدہ لوگوں کو پاکستانی بنانے میں ہی خوشی محسوس کرتے تھے۔ خواہ وہ کہیں بھی رہتے ہوں۔ اس وقت ہم جغرافیائی حدود میں نئے نئے بندھے تھے۔ ہمارے سامنے ایک کائناتی تصور تھا جس میں ساری کائنات نہیں تو پورا برِّ صغیر ضرور شامل تھا۔ لیکن آج اگر کوئی ایسی بات کرے گا تو یقیناً حیرت سے اس کا منہ دیکھا جائے گا۔ اگر سید امیر علی پاکستانی نہیں ہیں تو خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت معین الدین چشتیؒ، اور خواجہ گیسو دراز کے مزار بھی پاکستان میں نہیں ہیں۔ اور تاج محل، لال قلعہ اور دہلی کی جامع مسجد بھی پاکستان میں نہیں ہے۔ اس طرح جس طرح حافظ، سعدی، اور مولانا روم کے مزار بھی پاکستان میں نہیں ہیں۔ اور میں تو یہاں تک کہنے کی جسارت کروں گا کہ خانۂ کعبہ، مسجد نبوی اور بیت المقدس بھی تو پاکستان میں نہیں ہیں۔ لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ اس طرح ان سے ہمارا رشتہ اور ہمارا تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ تو ہمارے خمیر میں شامل ہیں۔ ہمارے دل و

جان کا حصّہ ہیں۔ ہماری شناخت ہماری پہچان ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم اس حقیقت کو بھی کیسے جھٹلا سکتے ہیں کہ وہ پاکستان کے اندر نہیں ہیں۔

اسے سمجھنے کے لیے ہمیں اپنی تاریخ اور اپنا ماضی سمجھنا پڑے گا اور انہیں اپنانے کے لیے اپنے ماضی کو اس انداز میں قبول کرنا پڑے گا جیسا کہ وہ ہے۔

ایک تو ہم وہ ہیں جو ایک جغرافیائی حد بندی میں موجود ہیں اور ایک وہ ہیں جو مسلمانوں بالخصوص جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی مشترکہ تاریخ کے حوالے سے ایک وسیع تر تناظر میں اپنا وجود رکھتے ہیں۔ اس کے حوالے سے ہمارے ماضی کے بھی دو حصّے ہیں۔ ایک ماضی وہ ہے جو برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہزار ڈیڑھ ہزار سال پر پھیلا ہوا ہے اور ایک ماضی وہ ہے جو چھ سات ہزار سال کی تاریخ کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ بظاہر یہ پانچ چھ ہزار سال ہمیں اجنبی اور بیگانہ سے نظر آتے ہیں لیکن وہ ہمارے اجتماعی لاشعور کا ایک ایسا حصّہ ہیں جو ہماری روزمرّہ زندگی میں اٹھتے بیٹھتے اپنا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ انہیں دیکھنے کے لیے بہت زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بچّے کی پیدائش شادی بیاہ اور موت کی رسموں اور فصلوں کی بوائی اور کٹائی کے موقع پر منائے جانے والے میلے ٹھیلوں میں اس کی مختلف شکلیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہمارا یہ ماضی بھی مردہ نہیں ہے وہ بھی ہمارے اردگرد زندہ اور جیتا جاگتا موجود ہے۔

سلیم احمد بھی اس تقسیم کے قائل ہیں لیکن اجتماعی لاشعور پر آ کر وہ ٹھٹھک جاتے ہیں چونکہ خود کہنے سے گھبراتے ہیں اس لیے اپنی بندوق دوسروں کے کندھے پر رکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"ایک گروہ کہتا ہے کہ اسلامی تاریخ ہماری زندہ تاریخ اور ہمارا زندہ شعور ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اسلامی تاریخ صرف شعور ہی تو ہے، وہ لاشعور کہاں جائے گا جو موئن جودوڑو، ٹیکسلا اور گندھارا وغیرہ میں دفن ہے۔ تب شمیم احمد اور انتظار حسین پوچھتے ہیں کہ وہ لاشعور کس کام کا جس کو ہم خوابوں میں نہ دیکھتے ہوں۔"

شمیم احمد کا تو پتہ نہیں البتہ انتظار حسین کے لاشعور میں یہ پانچ چھ ہزار سالہ ماضی جس

طرح رچا بسا ہے اس نے اپنا اظہار کرنے میں بہت زیادہ دیر نہیں لگائی۔ بہت جلد وہ انتظار حسین کے افسانوں میں نمودار ہو گیا۔ اگر انتظار حسین کے خوابوں میں یہ سب کچھ نہیں آتا تھا۔ تو بزرگان دین مسلمان فقیروں اور صوفیوں کے ملفوظات اور حکایات سے مہاتما بدھ کی جاتکوں اور مہابھارت تک وہ کیسے پہنچ گئے؟ اسے ایک انفرادی مثال نہ جانئے۔ انتظار حسین تو ایک علامت اور ایک مظہر ہیں ان رویوں اور اس فکر کا جو پچیس تیس سال کی جذباتی آندھیوں کے بعد ایک ٹھہراؤ کی نشاندہی کرتی ہے۔ آپ گھبرائیے نہیں انتظار حسین اور سلیم احمد کے ساتھ باقی سنجیدہ لکھنے والوں کی تحریروں پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے آپ کو اس قسم کے بہت سے کرشمے نظر آئیں گے۔

سلیم احمد اور انتظار حسین کا ذکر خاص طور پر یہاں اس لیے کیا گیا ہے کہ پاکستانی ثقافت اور قومی تشخص کی پہچان کے سلسلے میں یہ دو ایسے نام ہیں جو عسکری صاحب کی روایت کے پیروکار مانے جاتے ہیں۔ خیر، انتظار حسین تو شروع سے کربلا کے ساتھ رام لیلا کا ذکر بھی کرتے رہتے ہیں لیکن سلیم احمد اس طرف نئے نئے آئے ہیں اور سلیم احمد وہ شخصیت ہیں جنہیں تمام حلقے قبول کرتے ہیں تاہم مشکل یہ ہے کہ سلیم احمد ادھر آئے تو ہیں لیکن ایک جھجھک کے ساتھ بلکہ وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں ذہنی تحفظات کے ساتھ۔ ہماری ساری پریشانی یہ ہے کہ اگر موئن جودوڑو اور گندھارا کو بھی اپنی ثقافت میں شامل کر لیتے ہیں تو ہم اور ہماری ثقافت ہندوستان سے کس طرح ممیز اور ممتاز ہو گی۔ اس پریشانی میں ہم آج اپنے بچوں کو سکولوں اور کالجوں میں جو تاریخ پڑھا رہے ہیں وہ ایک طرفہ تماشہ ہے۔ اس میں جہاں موئن جودوڑو اور گندھارا وغیرہ سرے سے غائب ہو گئے ہیں۔ وہاں بابر اور اکبر ایک وسیع پاکستان پر حکمرانی کرتے نظر آتے ہیں اور شہنشاہ اورنگ زیب پاکستان کی سرحدیں ایک طرف دکن اور دوسری طرف پشاور تک پھیلاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اب آپ خود ہی سوچ سکتے ہیں کہ وہ سب پاکستان تھا۔ تو پھر ہم نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ خطۂ زمین اور علیحدہ وطن طلب کرنے کی ضرورت

کیوں محسوس کی اور ایک خاص خطے میں پاکستان کیوں قائم کیا۔

آخر ہم اپنے بچوں کو کیا بتانا چاہتے ہیں ۔ آخر ہم ان کے اندر نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں ؟ کیا ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ان بچوں کو باہر کی ہوا نہیں لگے گی۔ اگر وہ باہر کی ہوا میں نکلیں گے اور انھیں دوسرے حقائق سے بھی سابقہ پڑے گا تو کیا ان کی شخصیت ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو جائے گی ؟ ۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ پاکستان کے لوگوں کا رہن سہن ، رسوم و رواج اور اپنے تیوہار حتیٰ کہ ذہنی اور فکری رویّے بھی عرب ایران اور ترکی سے مختلف ہیں اور کیا یہ اختلاف اس سرزمین پر دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ ہزاروں سال زندگی گزارنے کا نتیجہ نہیں ہے ؟ اور کیا یہی ہماری ثقافت نہیں ہے ؟ اور کیا اس سے ہمارا تشخص نہیں بنتا ؟ ۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جب یہ کہا تھا کہ پاکستان کا ایک کلچر نہیں ہے اور وہ کلچر ابھی بنے گا تو ایسا غلط نہیں کہا تھا ۔ ان کا مطلب تھا اس مشترک کلچر سے جس میں تمام علاقوں کے کلچرل اجزا شامل ہوں یہ ایک ایسا آمیزہ ہے جو بن رہا ہے ۔ اب آپ اپنے رہن سہن ، بول چال لباس اور مجلسی آداب اور اپنے سوچنے سمجھنے کے انداز پر غور کیجئے تو آپ کو نظر آئے گا کہ صرف گزشتہ آٹھ دس سال کے اندر ان میں کتنی تبدیلی پیدا ہوئی ہے کیا یہ ایک مشترک کلچر کی طرف قدم نہیں ہے ؟ سلیم احمد صحیح کہتے ہیں کہ ہمارے قومی احساس کی عمارت مشترک مستقبل کی بنیاد پر ہی کھڑی ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے کسی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں ہے ؟ ۔ یہ ایک تاریخی عمل ہے جو جاری ہے اور ہماری ضرورتیں اور ہمارا مشترک مستقبل ان کے لیے راہ ہموار کر رہا ہے ۔

دراصل ہم گھبرا اس لیے جاتے ہیں کہ یہ سب ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہو رہا ہے ۔ ہم اس دریا پر بند باندھ کر اسے اپنے رُخ پر چلانا چاہتے ہیں لیکن کیا آپ نہیں جانتے کہ اس طرح کئی حکڑ بندیوں سے آس پاس کی زمینوں میں بیج تو پیدا ہو جائے گا مگر آپ کے مطلب کا کلچر پیدا نہیں ہو سکے گا ۔ پاکستانی ثقافت کثرت میں وحدت کا نمونہ ہے اور یہ وحدت ایک مشترک مستقبل کے حوالے سے آہستہ آہستہ کثرت کے بہت سے اجزا کم کرتی جا رہی ہے ۔ ہاں اس کثرت میں

آپ مغربی کلچر کے آمیزہ کی موجودگی سے بھی انکار نہیں کر سکتے۔ یہ جو ہمارے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ پہنچ رہا ہے ہم اس سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ ہم اس کے اثرات سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ ہماری ساری کوششیں اور ساری منصوبہ بندی معاشی ترقی کیلئے ہے۔ معاشی ترقی کا مطلب ہے پُر آسائش زندگی اور زندگی کے لیے ضرورت ہے مشینوں کی اور آلات کی ہاور تمام مشینیں مغرب سے آتی ہیں۔ آپ نے اپنے ہاں فلموں پر سنسر سخت کیا تو لوگوں نے وی سی آر پر باہر کی فلمیں دیکھنا شروع کر دیں۔ آپ بچ کر کہاں جائیں گے؟ کسی انسان نے آج تک اپنے لیے ریشم کے کیڑے والا کپڑا تیار نہیں کیا۔

آیئے اب ہم اپنی بات ختم کریں اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے کا برملا اعلان کریں کہ پاکستان ایک جغرافیائی وحدت ہے۔ اس سرزمین اور اس پر بسنے والوں کی ایک تاریخ ہے۔ پھر اس سرزمین کا ایک ماضی ہے اور اس تاریخ اور اس ماضی نے ہمیں جو کچھ دیا ہے اور جس کا اظہار ہماری روزمرّہ کی زندگی میں ہوتا ہے وہ ہماری ثقافت ہے۔ جو کثرت میں وحدت کا نمونہ ہے۔ ایک مشترکہ مستقبل کے حوالے سے تاریخ کا عمل ایک مشترک ثقافت کی طرف ہماری رہنمائی کر رہا ہے۔ اس طرح ہماری سوچ ہماری فکر اور ہمارے جذبات و احساسات کی اساس یہ خطۂ ارض ہے اور اس زمین کی بوباس اور اس کا رنگ و روپ ہمارا جسم اور ہماری جان ہے۔ اور پاکستانی قوم پرستی ہمارا قومی تشخص ہے۔

قوم پرستی کے نام پر گھبرایئے نہیں۔ ٹھیک ہے اسے بعض لوگ دوسرے مقاصد کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں لیکن اگر مشترک قومی احساس کی عمارت کھڑی کرنے کے لیے مشترک مستقبل بنیاد بنتا ہے تو مشترک مستقبل کے لیے بھی قوم پرستی کی ضرورت ہے اور وہی ہمارا قومی تشخص ہے۔ اور یہ سب کچھ ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہمیں اس کی تلاش کے لیے "میپ" کے بازار جانے اور وہاں سے اپنی پسند کے ماں باپ خرید کر لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ماشاءاللہ ہمارے ماں باپ موجود ہیں اور ہمیں ان پر فخر ہے۔

انور سجّاد

آج ، ۳۱ - ۲۴

۲۴

وہ ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دباتی ہے ۔ بچھڑنے سے پہلے ان دونوں کے درمیان آخری مکالمہ سنائی دیتا ہے ۔

تم جانتی ہو ؟ کائنات ، روشنی کہاں سے حاصل کرتی ہے ؟

تم نہیں جانتے ؟ جہنم کے شعلوں سے ۔

۲۵

میں وادیوں کو پار کر کے اس دہلیز تک اس لیے پہنچی ہوں کہ تم میرے بچپن کے محافظ بنو جو میں ابھی تک اپنے اندر لیے پھرتی ہوں صرف یہی سچ ہے ہر چیز کا ماخذ ہر موسم میں اس کی حفاظت کرو تاکہ وقت اس میں خشک نہ ہو جائے ۔ پھول اور پھل کے درمیان اسقاط کی صورت دھیان رکھنا خزاں کے پھول میں چھپی آگ بجھنے نہ پائے ۔ کوئی نہیں جانتا میری چھاتیوں پر سورج نے آبلے کاڑھے ہیں ۔ تحیّر ، معصومیت اور عشق اب بھی میرے سانس ہیں ۔ تحیّر معصومیت ، عشق ۔ اگر میں خزاں کی خاردار باڑ پھلانگ جاتی ہوں تو اس لیے کہ میرا بچپن میری مٹھی اور پیروں کے آبلوں میں بھی دھڑکتا میری رگوں میں بند ھا ہے ۔ ذرا مسکرا دو ۔ اپنے ہونٹوں میں سمٹی تمام رعنائیوں کو بہا دو ، میرے سر میں کئی سفید بال مہندی رنگ کے باعث سنہرے ہیں ۔ میرے چہرے پر امڈتی جھرّیوں پر نہ جاؤ یہ تو ساری عمر کی سمٹی سوچیں ہیں تم اس لمحے میرے ساتھ جاگو جب محبت دل پہ رقص کرے اور روشنی کی کونپلیں لہو میں ڈوبتی ابھرتی ڈوبتی شہد کی مکھیاں بن جائیں تو بولو یہ وہی چوکھٹا ہے جس کے وسط سے لٹکتے پھندے کے نیچے کھڑے

تم میرے بچپن کی حفاظت کروگے۔ لیکن اس چوکھٹے کے دروازے کہاں ہیں۔ میں تمھارے پاس آنا چاہتی ہوں کہ مرنے سے پہلے مرنا نہیں چاہتی میں اپنے سورج کو غروب نہیں ہونے دوں گی۔ تحیّر معصومیت اور عشق کو بجھنے نہیں دوں گی۔ میں چوکھٹے کی دہلیز پر کھڑی ہوں۔ میری نظریں دُور اوپر لٹکتے پھندے میں جھولتی ہیں۔ میں اپنے آپ سے پوچھتی ہوں وہ کون ہے۔ کہاں ہے میرے ساتھ نہیں تو اسے کیسے پاؤں کہ اس کے کندھوں پہ پیر رکھ کر اُٹھوں اور وقت کی گردن سے پھندا اُتار کر راکھ کر دوں۔

۲۶

سائرن کی آواز اندھیرے کو چیرتی ہے۔

جیپ کے اوپر لگی جگ مگ جگ مگ روشنی جھاڑیوں کے اندر نہیں پہنچ پاتی۔

وہ اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی، صحن میں لگے نلکے سے ہٹ کر دیوار کے ساتھ اُگی جھاڑیوں میں نظروں سے کھوجتی ہے، جس کے چاروں اور سمندر ہے، اسے یقین ہے کہ جھاڑیوں کے نیچے اس وقت نظروں سے اوجھل، کھل کر پھول بنی کلی کا رنگ سُرخ ہی ہے۔ سب کی نظروں سے اوجھل کھلنے والی کلی کا رنگ، اپنے آپ بدل نہیں جاتا۔

—— بالکل میں یہاں ہوں۔ سُرخ

سرچ لائٹ کی کھوجتی تیز دھار اس کے کانوں کے پردے چاک کرتی ہے۔

—— تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔

وہ گندم کے خوشوں میں جھولتی ہے، سرسوں میں کھِل اُٹھتی ہے، کپاس کی مُٹھی میں پھوٹ پڑتی ہے۔ انار کا پھول، ریشم کے کیڑے کے مانند کومل لیکن وہ اس کا ڈنک نہیں دیکھ سکتا، وہ صرف سرچ لائٹ ہی میں دیکھ سکتا ہے۔ اپنے سائرن کے علاوہ اسے کوئی آواز نہیں آتی۔

—— مجھے تمھاری ضرورت ہے۔ کہاں کھو گئی ہو تم ؟

—— سرچ لائٹ بجھا دو۔ سائرن بند کر دو۔

اور سبز گھاس پر برہنہ پا آؤ ، سب کے سامنے ۔

——— میں تمھیں بالکل اپنے قریب ملوں گی ۔

سیاہ رات میں سُرخ ۔

لیکن اسے اپنی جیپ پر لگی سرچ لائٹ اور سائرن پر زیادہ اعتماد ہے، سرچ لائٹ اور سائرن سے گھومتی دیوانہ وار نکلتی بگولا بر چھیاں اس کی تلاش میں کہ اپنی لپیٹ میں لے کر اسے بستر سے ویلڈ کر دیں ۔ وہ آگے بڑھتا ہے ۔

وہ اپنے کمرے کے دروازے سے تیزی سے نکلتی ہے ۔ صحن میں لگے نلکے سے ہٹ کر دیوار کی طرف ، جس کے پاس اُگی جھاڑیوں کی اوٹ میں سُرخ پھُول کھِلا ہے ۔ اور جس کے گرد سمندر کا حصار ہے ، چل دیتی ہے کیونکہ اس نے سمندر میں کود جانے کے لیے روشنی اور آواز سے وقت چھین لیا ہے ۔ جہاں وہ سمندر کی تہہ میں خود کو کچھوے کی طرح محفوظ کرلے گی ، اپنے نرم نرم بدن کو کسی جھاڑی ، کسی چٹان میں چھپالے گی ۔

سائرن کی آواز اور سرچ لائٹ کی روشنی میں ملفوف وہ اسے اب بھی نہیں دیکھ سکتا ۔ شاید عدم وجود میں ہے ، موت کی پرچھائیں سے ہمکنار ۔ وہ بھی اِسے دیکھ نہیں پا رہی ۔

چاروں اور تاریک سناٹا ۔

سیاہ خاموشی یکدم کھل کر اس کے نازک بدن کے گرد جال کی طرح سمٹ جاتی ہے ۔

اس اندھیری چپ کے معنی اس کی سمجھ میں نہیں آتے ۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی چال چل رہا ہو ۔

——— میں یہاں ہوں ۔

سرچ لائٹ اندھوں کو نور نہیں دے سکتی ۔ سائرن کی چیخیں اور بھی بہرا کر دیتی ہیں کہ صحن میں لگے نلکے سے ہٹ کر دیوار کے پاس سمندر کے حصار میں جھاڑیوں تلے محفوظ سُرخ کلی کا رنگ اپنے آپ بدل نہیں جاتا ، وہی رہتا ہے جو وہ اپنے بطن میں لے کر کھِلی تھی ۔

یاد نہیں آتا میں اس کے ماتم کے لیے کب کہاں اور کیسے آئی ہوں۔ آئی بھی ہوں یا میرا وہم ہے گلاب، گیندے، موتیے کے ہالے میں دفن جسم میں ان تمغوں سے نظریں چرا لیتی ہوں جو اس کی پنجر چھاتی پر کابوس ہیں۔ میں شمعوں سے بہتی موم میں اپنے نقوش گوندھتی ہوں۔ اگر بتیوں کی خوشبو میری آنکھوں سے بہہ نکلتی ہے۔ الرجی کے باعث چھینکیں میری ناک کی پھننگ پر آکر اٹک جاتی ہیں۔ میں اپنے چہرے کو دوپٹے میں چھپا کر اپنے آپ پر مسکرا دیتی ہوں۔ آیتیں، حمدیں، نعتیں، درود سلام اور بخشش کے گیت جو فجر سے فجر تک گائے جاتے ہیں پھر بھی نا تمام رہتے ہیں۔ بلند آواز میں ایک بار پھر ڈھلکے ہوئے سروں پر اس کی روح کو اٹھائے میرے سر پر منڈلاتے ہیں۔ میں حیران رہ جاتی ہوں کہ مجھے بن چہرے کے ہونٹوں پر بوسہ دینے میں کیا عار ہے۔

سرد یو سے جلتی شمع سے ٹپکتی گرم گرم موم

سمجھ میں نہیں آتا میں اس کے ماتم کے لیے کب، کہاں اور کیسے آئی ہوں، ابھی آئی بھی ہوں یا میرا وہم ہے۔

۲۸

میں دشمن کے وار کو اپنے بدن کی دھار پر روکتی ہوں، تم سب کو فریب دے کر جلتی وادیوں کو ترک کر کے فرار ہو گئے۔ میں بے خوف بھڑکتی آگ میں لپکتی لپٹوں کے ساتھ ہم بستر۔ میری آنکھیں سربستہ رازوں کی حدت لیے دہکتی ہیں۔ جب میں اپنا گھونگھٹ اٹھا کے دیکھتی ہوں تو تم سب میں گھل مل جاتے ہو۔ میں چیخ کر کہتی ہوں۔ غدّار یہ وہ زبان ہے جو سنگین رات کو فاتح صبح میں بدل دیتی ہے جو بارود اور پرچم کے بھولے بسرے بوجھ کو حافظے سے نکال کر سامنے لے آتی ہے جو غداروں پر کوڑھی شبیہے داغ دیتی ہے جو بزدلوں منافقوں کی روحیں سربمہر کر دیتی ہے جو نیکیوں کو چور بازار میں بیچتے ہیں۔ میں ہر شے کا بطن ہوں۔ میں ستارہ میں پھول بن جاتی ہوں۔ میں کہتی ہوں ستارہ پھول میں چٹان اور بجلی۔ جب میں کہتی ہوں چٹان اور بجلی تو میں راکھ اور وطن بن جاتی ہوں۔ اداسی اور ایقان، اب میں چلّا کر کہتی ہوں راکھ، وطن، اداسی اور ایقان

کوئی گواہی نہیں دیتا کہ میں نے تمھیں دیکھا ہے، دشمن کی گولیاں میرے بدن پر سُرخ پھولوں کی صورت کِھل اٹھتی ہیں۔ میں نے اپنے خوابوں کو حقیقت میں شناخت کرلیا ہے۔ میں پکارتی ہوں لیکن کوئی جواب نہیں۔ مجھے حیرت نہیں ہوتی کہ میں وہ زبان بولتی ہوں جو آنے والے کل کے پہلے پہر کی زبان ہے۔

۲۹

وہ گنگناتے سورجوں سے پوچھتی ہے کہ اس کے بدن میں بنی نرم گرم خوش ذائقہ کوٹھری میں وہ بچہ کب اترے گا جو اپنی جیرتوں، اپنے سکوت سے نکل کر اس کے بدن پر ایڑی مار کر چشمہ جاری کرے گا۔

اگرچہ سورجوں کی زبان اس کے لیے اجنبی نہیں پھر بھی جواب اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔

گزرتی رات جس کا کوئی انت نہیں۔

وہ جنم کی شہادتوں کو آسمانوں میں ڈھونڈنا نہیں چاہتی لیکن سوال گوکھڑو ہیں۔ کون اپنے چولہوں کی روشن لپٹوں سے اپنے لیے لباس بُنے گا؟ وہ کب آئے گا جو بجھی مشعل کو ایک بار پھر زمین پر اترے لہورنگ ستارے سے روشن کرے گا؟

وہ ایک بار پھر توے سے روٹی اُتار کے، روٹی پر چھپے سیاہ آبلوں کو پڑھتی ہے۔

خوابوں کی جنّت سے وہ بیج کیسے لائے کہ بجلیاں انہیں سینچ کر روحوں سے پھول اگائیں

وہ روٹی کو دسترخوان میں لپیٹتی ہے۔ آٹے کے پیڑے کو ہاتھوں میں گھماتی، دونوں ہاتھوں کی تھپکیوں سے روٹی بنا کر توے پر ڈالتی ہے۔

اس کی آنکھوں میں وہ تمام کھلی بوریاں گھوم جاتی ہیں جن سے سُرخ، پیلے، نیلے، سنہرے سبز بیج نظر آتے ہیں۔ ایسے کِھلے کِھلے رنگ جن سے قوموں کے پرچم اور کنواریوں کے دوپٹے اگر رنگ دیئے جائیں تو سیاہ بختیاں ہمیشہ کے لیے غروب ہوجائیں کہ بیجوں میں مہکتی بہاریں، روشن جنّتیں مخفی ہوتی ہیں اور سنسناتی ہوائیں لہلہاتے کھیت، بچوّں کی کِھلکھلاہٹوں سے منور بازار گلیاں

اور ان گنت عورتوں مردوں کے گیت بھی۔

وہ توے پر روٹی ڈال کر یونہی مسکرا دیتی ہے۔ اگر وہ کبھی کبھار یونہی مسکراتی نہ رہے تو اس کا چہرہ سوچ اور کرب کا کھوٹا بن جائے۔

چشمہ اس کے بدن میں ایک بار پھر ایڑی کے انتظار میں سرسرانے لگتا ہے۔

توے سے آخری روٹی اُتار کے دسترخوان میں لپیٹتی ہے۔ توا چولہے سے اُتار کر دیوار میں ٹھکے کیل پر لٹکاتے اس کا ہاتھ رک جاتا ہے۔ توے پر لاتعداد لہو رنگ سورج ٹکڑیوں میں موج در موج ہنستے جلتے بجھتے ہیں۔ اس کے مسکراتے ہونٹ تشویش میں سمٹ جاتے ہیں۔ اسے بڑی بوڑھیوں کا قول یاد آتا ہے کہ توا یوں ہنسنے لگے تو فاقے، قحط ———

وہ لرز سی جاتی ہے۔ توا کیل سے لٹکا کر روٹیوں والی چنگیر کو نعمت خانے میں رکھتی ہے۔ اور سونے والے کمرے کی طرف دیکھتی ہے۔ ابھی اس کے آنے میں دیر ہے۔ پھر اپنے بدن میں سرسراتے چشمے کی گنگناہٹ پر چلتی اپنے بستر پر آجاتی ہے۔ معمول کے مطابق اس کے انتظار میں چارپائی پر لیٹ جاتی ہے۔

تب ایک بار پھر وہ اپنی آنکھوں میں کھلی بوریوں سے سُرخ، پیلے، نیلے، سنہرے، سبز بیج نکال کر اپنے بطن میں پرو دیتی ہے کہ جن کے کھلے کھلے رنگوں سے اگر قوموں کے پرچم اور کنواریوں کے دوپٹے رنگ دیئے جائیں تو سیاہ بختیاں ہمیشہ کے لیے غروب ہو جائیں اور ایڑی مار کے چشمہ جاری کرنے والے کے انتظار میں چرمراتے جسم شاداب ہو جائیں کہ آج جنم کی شہادتوں کو آسمانوں میں ڈھونے کا موسم نہیں۔

۳۰

میں تمھیں پریوں کی کہانیوں کے تاریخ جغرافیے میں تلاش کرتی ہوں۔ مشرق مغرب شمال جنوب میں سایہ ملتا ہے تو اپنے وطن اپنے شہر، اپنے گاؤں، اپنی گلیوں، بازاروں، کھیتوں میں اپنے ہم وطنوں میں تمھارے قریب آتی ہوں۔ تمھاری خاموش مسکراہٹ کہتی ہے مجھے چھونا نہیں تب

میرے پیر زمین میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ تمہارے سامنے بالکل قریب مجھ پر منکشف ہوتا ہے کہ تمہارا جسم آگ کی لپٹوں سے متشکل ہے۔ سُرخ سنہری جن کے سامنے تیز سے تیز آندھیاں بھی موم ہیں تو یہ کتنا سادہ معجزہ ہے کہ میں تمہارے سامنے بالکل قریب کھڑی ہوں جیسے یہ میرا حق ہے کہ خوشبو میں منجمد ایک بار پھر پگھل کر میں بن جاؤں۔

۳۱

اس کی ہمسائی کہتی ہے۔

میری جان، یاد؟ صرف اس پل کی جو ابھی گزرا ہے۔ ہر خواب آنے والے کل کے لیے ہوتا ہے۔ تمہارے پاس کوئی چاند، کوئی روشنی، کوئی کہانی نہیں؟

چھت سے اب بھی گزرے ہوئے کل کی باتیں لٹکی ہیں۔

وہ شہر کی غلام گردشوں میں اپنے خوابوں کو کھوجتی، چوراہے کی گھڑیال کو بھولنے کی کوشش کرتی ہے کہ گجر کو مکڑی کے جالوں سے باندھ کر وقت سے عاق کر دیا گیا ہے۔

ابھی اس کے دھندلے صحن میں لگے موتیے کی کلی پر شبنم نہیں اُتری۔ سیمنٹ سے بنے شہ نشین پہ رکھے گھڑے پیاسے ہیں۔ وہ زیرِ لب غور سے پوچھتی ہے،

کیا پریوں کی کہانیاں ہمیشہ دوسروں کے لیے ہوتی ہیں؟ اور الہام پرانے زمانوں کی صدا ہے؟

جواب میں شہر کی غلام گردشیں ان ہی سوالوں سے گونجتی ہیں کہ شہر کی گردشوں میں ہر غلام مکڑی کے جالوں سے بندھا ہے اور وقت ابھی دوبارہ دریافت نہیں ہوا۔

تب محرابوں کی جالیوں سے بندھے دھاگوں، طاقوں میں پڑے صحیفوں، گنبدوں کی چھتوں سے لٹکتے فانوسوں، ماتھوں سے منقش دہلیزوں، صندل لوبان میں سلگتی خوشبو کی لاٹ، فرش پر بکھرے باسی، تازہ، باسی پھولوں سے اُٹھتی دعاؤں میں وہ ایک بار پھر منجمد ہو جاتی ہے۔

رشید امجد

مخمل میں لپٹی رات

وہ اپنے آپ پر منکشف ہونا چاہتا ہے۔
لیکن جوں جوں اپنا آپ کھولتا ہے، دھند بڑھتی جاتی ہے اور اسے اپنا آپ نظر آنے کے بجائے چیزوں کے ایسے چہرے نظر آنے لگتے ہیں جنہیں کبھی دیکھا نہ سنا۔
اجنبی دنیا، ایک نیم تاریک گلی، جو اس کے وجود کی بالکنی سے شروع ہوتی ہے اور پھیلتے پھیلتے اس اونچے ٹیلے کو جاتی ہے جو شہر سے باہر زمین میں دور تک پاؤں پھیلائے خراٹے لے رہا ہے۔ اس ٹیلہ پر روز میلہ لگتا ہے صبح ہوتے ہی لوگ ٹولیوں میں ناچتے وہاں آتے ہیں اور سارا دن ڈھول کی دھمال پر رقص کرتے ہیں۔ شام ہوتے ہی رقص رک جاتا ہے اور اندھیرا پھیلنے سے پہلے سارے لوگ ٹیلہ کی بلندی سے نیچے چھلانگ لگا دیتے ہیں۔
میلہ آہستہ آہستہ خاموشی اور اندھیرے کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔
اس کے وجود کی بالکنی سے ٹیلہ تک پھیلی نیم تاریک گلی سائیں سائیں کرنے لگتی ہے۔
وہ نیچے اترتا ہے۔ گلی سے ہوتا ٹیلہ پر آتا ہے۔
اپنے آپ پر منکشف ہونا ایک عجیب لمحہ ہے۔
اور شاید ایک عجیب لذت۔

وہ اپنے ہونٹ چاٹتا ہے، میلہ کی دکانیں بھری پڑی ہیں۔
لیکن ایک اداسی ــــــــــ سنسناتی اداسی،
ویرانی ــــــــــ ویرانی سی ویرانی،
اجتماعی خودکشی ــــــــــ
عورتیں اپنے اپنے مرد کی لاش پر بین کرتی ہیں۔
مَیں اپنے آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں ــــــــــ اپنے آپ پر منکشف ہونا چاہتا ہوں
انفرادی آزادی
اجتماعی خودکشی اور انفرادی آزادی
وہ آہستگی سے نیم تاریک گلی میں رینگ آتا ہے ــــــــــ
کسی کی چاپ ہولے ہولے اس کے کانوں پر دستک دیتی ہے نیم تاریک گلی میں چلنا کتنا خواب آگیں ہے لیکن اس لمحہ ایک ڈراؤنا خواب، ایک المناک بین، دبے پاؤں اس کے پیچھے چلا آتا ہے۔
مڑ کر دیکھوں ــــــــــ
پتھر ہو جانے کا ڈر ــــــــــ
ڈر، خوف ــــــــــ بھری جنگ میں اکیلے رہ جانے کا خوف
تلواروں کی گونج اور رتھوں کے شور میں وہ سر اٹھاتا ہے ــــــــــ "اگر آپ مجھے اس سمے اپنے درشن دے دیں تو میں امر ہو جاؤں گا۔"
مسکراہٹ اپنے چہرے سے نقاب سرکاتی ہے۔
کثیف ایک آئینہ ہے
تیر برستا کا سر جنگ کے خاتمے تک کھلی آنکھ سے ایک ایک لمحہ کو گذرتے دیکھے گا
تو میں اپنا دھنش اٹھاتا ہوں
مسکراہٹ گھنی ہو جاتی ہے۔

زندگی تو نیم تاریک گلی ہے
لیکن اس نیم تاریک گلی میں وہ میرے پیچھے کیوں آتا ہے اور میری
آنکھوں کے خواب کیوں چرا کر لے جاتا ہے۔
خواب خواہشوں کی نازک کلائیوں میں پہنی چوڑیوں کی کرچیاں ہیں۔
ٹوٹی کرچیاں ——— خواب ہی خواب، ٹیلہ کے اس طرف بھی
خواب، اس طرف بھی خواب
اور وہ آواز جسے سن کر سارے ایک ایک کرکے نیچے چھلانگ لگا دیتے ہیں
یا اخی ——— یا اخی
لیکن وہ تو ابھی اس نیم تاریک گلی میں رینگ رہا ہے۔ جہاں کوئی دبے
پاؤں اس کے پیچھے آتا ہے،
کون ہے
میلہ میں اس کی آواز گونجتی ہے ——— یہاں کون ہے
کوئی نہیں سنتا، لوگ ڈھول کی تھاپ پر ناچتے گاتے، دھمالیں ڈالتے
آتے ہیں۔
عجب رنگا رنگی ہے ———
آوازوں کی آبشاریں، چہروں کے قمقمے، ذائقوں کی بھنبھناہٹ
یا اخی ———
یا اخی ——— یا اخی ———
ناچتے گاتے جسموں میں جھٹکا لگتا ہے۔ سر اٹھا کر آواز کی سمت کا تعین
کرتے ہیں اور لبیک لبیک کہتے دوڑ پڑتے ہیں۔ ایک ایک کرکے
——— ایک ایک کرکے گہرائیوں کے فاصلے میں اترنے لگتے ہیں۔
میلہ سنسان ہو جاتا ہے
تو آج کا دن بھی تمام ہوا ——— کھیل ختم ہوا

لیکن کھیل کبھی ختم نہیں ہوتا
کل کھیل پھر شروع ہوگا، اسی سج دھج کے ساتھ
"زندگی کیا ہے ؟
ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ جنم لیتی ہے —— "زندگی ایک چُپ آواز ہے"
"چُپ آواز" ——
"—— سمجھ میں آجائے تو آواز، نہ سمجھ میں آئے تو گہری چُپ"
میلہ میں جو اس آواز کو سن لے وہ لبیک کہتے ہیں۔ جو نہ سن پائیں وہ نیم تاریک گلی میں سے ہوتے ہوئے واپس اپنے آپ میں آجاتے ہیں۔
بالکنی کا دروازہ تو ہمیشہ کھلا رہتا ہے
دونوں ہاتھ بلند ہوتے ہیں —— "لوماتا جنگ تو تمام ہوئی اب ہم جاتے ہیں۔"
بنتی کرتے ہاتھ عرض کرتے ہیں —— "اب آپ کے درشن کب ہوں گے؟"
لمحہ بھر توقف ہوتا ہے —— "جب تم دکھ میں ہو گے کہ میں دکھ کے ہر لمحہ میں آنے کا پابند ہوں۔"
بنتی کرتے ہاتھ دعا کرتے ہیں —— "مجھے ہمیشہ دکھ میں رکھنا۔"
اور دکھ میری پہچان ہے ——
وہ نیم تاریک گلی میں اترتا ہے آہستہ آہستہ ٹیلہ پر آتا ہے۔ ستسانی دبے پاؤں چاروں طرف پھر رہی ہے۔
تیر پر ٹنگا سر آنکھیں جھپکاتا ہے ——
"تو یہ سر ابھی تک اسی طرح ٹنگا ہے لیکن جنگ تو کبھی کی تمام ہوئی اور جانے والے جا بھی چکے۔"

آگے بڑھ کر ہر کو تبر سے اٹھانا چاہتا ہے، مگر رک جاتا ہے

"مجھے تو ابھی اپنا کشف ہی نہیں ہوا"

اٹھے ہاتھ نیچے گر جاتے ہیں۔ خاموشی سے واپس پلٹتا ہے اور بوجھل قدموں سے نیم تاریک گلی طے کر کے اپنے جسم کی چار دیواری میں آگرتا ہے ——— اپنے آپ پر منکشف ہونے کی تمنا ——— بس ایک تمنا ہی ہے ———

برف کی سل پر وہ سارے دائرے میں بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کی آنکھ جھپکنے کے منتظر ہیں۔ وہ بھی اپنی باری کا انتظار کر رہا ہے کہ یا تو آنکھ جھپکا کر اپنے آپ کو دوسروں سے چروا پھڑوا لے، یا پھر کسی کی آنکھ جھپکتے ہی اسے چیر پھاڑ ڈالے،

ایک لمحہ کی فرصت ہے ———

اور اس لمحہ بھر کی فرصت میں اگر وہ آگے بڑھ کر ہمت کر کے درخت کی شاخ پر جوڑ کھاتے پرندے کے جوڑے میں سے تبر کو کھینچ کر نکال بھی لیں تو کیا کہ وہ تو عین لذت کی گھڑی میں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔

تو پھر اپنے آپ پر منکشف ہونا بھی کیا اور نہ ہونا بھی کیا؟

مستنصر حسین تارڑ

کوٹ مراد

ایک زنجیر لائی گئی ۔
" کھانوں یہ تمہارے پاؤں میں ڈال دیں ؟"
" میں کوئی جنور تے نیئں ——— "
" نہیں نہیں ۔ تم انسان ہی ہو جانور تو نہیں لیکن ——— "

منور خاں ٹھیکیدار کہتا ہے ——— " میں نے کھانوں کو پہلی مرتبہ چھ ماہ پیشتر دیکھا تھا ——— میری بلڈنگ سائٹ پر کام کرنے والے دو راج عید گذار نے اپنے گاؤں کوٹ مراد گئے تو واپسی پر دو مزدوران کے ہمراہ تھے ——— ٹھیکیدار صاحب یہ اپنے گاؤں کے لڑکے ہیں ۔ وہاں ناکارہ پھرے تھے ہم انہیں ساتھ لے آئے ہیں مضبوط جُثّے کے ہیں جانوروں کی طرح کام کریں گے ، مزدوری بھی جو دیں گے اور جب دیں گے راضی خوشی لے لیں گے ——— مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا ، مزدور مرضی کا ہو تو راج بھی ستھرا کام کرتے ہیں اور مزدوری میں بھی بچت تھی ۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا ——— ایک تو جعفری تھا ، چھینکا سا ، جب صاف ستھرے کپڑے پہنتا تو بالکل شہریا لگتا اور دوسرے کا نام کھانوں تھا . . . ۔ کالا شاہ (راج اُسے کالا شاہ کا کو کہتے) جیسے کوئلے پیس کر اس پر لیپ کیا گیا ہو جُثّہ موٹا اور بے ڈھبا لیکن گندم کی بھری ہوئی بوری کی طرح سخت اور پیڈا ۔ بال دکھائی ہی نہیں دیتے تھے پتہ نہیں کیسے تھے ، البتہ آنکھیں مہین مہین پھرکیاں تھیں جو گھومتی رہتیں میں نے اس کا پورا نام پوچھا تو کہنے لگا " چوہدری خان محمد " ۔ میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا اس لیے نہیں کہ وہ عام مزدوروں کی طرح بنجیر ، سُلّی یا ساڈو نہیں تھا بلکہ چوہدری خان محمد تھا بلکہ یہ اس کی آواز تھی جو اس کے جُثّے کے سیاہ کنوئیں میں سے ایک بوڑھے مینڈک کی طرح گھاں

488

گھاں کرتی برآمد ہوئی تھی۔ آئندہ دنوں میں جب بھی اس سے کچھ پوچھتا تو پہلے اپنے آپ کو اس کی گھگھیائی ہوئی مردہ آواز کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیتا اور میں کبھی تیار نہ ہو پاتا۔ اس کا منہ کھلتا اور میں پہلے لفظ کی گھاں پر ہمیشہ قدرے ٹھٹھک جاتا۔ . . . اس کے چلنے پھرنے کا انداز بھی کچھ عجیب سا تھا یا مجھے نظر آتا تھا، وہ یوں قدم اٹھاتا جیسے اس کے پاؤں میں چکی کے پاٹ پر وئے ہوئے ہوں یا قدم اُٹھاتے ہوئے اس کا سارا وزن اس ایک پاؤں میں منتقل ہو گیا ہو۔ اس کے بازو بھی کسرتی نہ تھے بس کالے گوشت کے لٹھ سے تھے انہیں وہ پہلوؤں میں لٹکا کر نہیں چلتا تھا بلکہ پیٹ کے آگے ہتھیلیاں کھوسے رکھتا جیسے کچھ اُٹھا رکھا ہو

ایک روز وہ کام پر نہ آیا۔

میں اُسے دیکھنے کی خاطر مزدوروں کیلیے بنے ہوئے چھپڑ میں گیا تو اس کی " ہائے ہائے " سے پورا چھپڑ گونج رہا تھا۔

" کیا ہوا کھانوں ؟ "

" جی کَس چڑھ گئی اے ——— ہائے "

" کچھ دوا دارو کیا ؟ "

" ہیں جی ——— ہائے " میرا خیال ہے کہ بیماری میں دوائی وغیرہ کا استعمال اس کے لیے کچھ ناقابل فہم تھا۔

" زیادہ تکلیف ہے جو اتنی بلند آواز میں ہائے ہائے کر رہے ہو ؟ "

" تکلیف تے نیئں جی ——— ہائے ہائے کرن نال کَس گھٹ ہو جاندی اے جی "

" دوسرے روز اس کا بخار واقعی اتر چکا تھا۔

" اب کیا حال ہے کھانوں ؟ "

" جی باہر دی کَس تے اُتر گئی اے اندر دی ہے "

" ہیں ؟ " اب یہ میرے لیے کچھ ناقابل فہم تھا کہ باہر کا بخار اُتر گیا ہے اور اندر کا باقی ہے۔

تیسرے روز وہ حسب معمول اپنے بوجھل قدم اُٹھا اُٹھا کر بلڈنگ سائٹ پر کام کر رہا تھا بچوں کو چھٹیاں تھیں وہ میرے ساتھ ہی بلڈنگ سائٹ پر آ گئے اور حسب معمول ریت کے گھروندے بنانے میں مگن ہو گئے ۔۔ پھر انہوں نے کھانوں کو دیکھ لیا۔ پہلے تو وہ

489

ایک محفوظ فاصلے پر کھڑے ہو کر اُسے بغور دیکھتے رہے جیسے بلی کا بچہ کسی مینڈک کے ساتھ کھیلنے سے قبل اس کا تفصیلی مشاہدہ کرتا ہے کہ یہ کیا ہے اور پھر اس نتیجے پر پہنچ کر کہ سیاہ گوشت کا یہ تودہ بالکل بے ضرر ہے وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ کھانوں اپنا دابڑہ اٹھائے جدھر جاتا وہ اس کے دائیں بائیں ہو ہو کر اس کا چہرہ دیکھتے اور اس کی بن مانسوں ایسی چال سے لطف اندوز ہوتے۔ دوپہر کے وقت جب کھانوں نے اپنے ہاتھ کی پکائی ہوئی چکی کے پاٹ اتنی پانچ روٹیوں کو چار چار حصوں میں تقسیم کر کے فی الفور نگل لیا تو ان کی مسرت عروج پر تھی ---- وہ ہر ٹکڑا بڑی مہارت سے تہہ کرتا اور پیسٹ لیا ٹ کے منہ کے اندر گھیڑ لیتا اس کے جبڑے ہلتے اور وہ ایک مٹی ڈکار نما آواز بلند کر کے اُسے پیٹ کی طرف دھکیل دیتا۔ پھر بچوں کی طرف دیکھ کر مسکراتا اور گھاں گھاں کرتے ہوئے سر ہلاتا کہ بہت مزا آیا ہے۔ اگلے روز بچوں نے پھر بلڈنگ سائٹ پر چلنے کی ضد کی مگر میں نے انکار کر دیا۔ ایک تو ان کی وجہ سے میرے کام میں ہرج ہوتا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ وہ کل سے کھانوں کی طرح چلنے اور کھانے کی مشق میں مصروف تھے اور یہ صورت حال قابل فہم طور پر میرے لئے قابل قبول نہ تھی۔

ایک روز پھر وہ کام پر نہ آیا ...... میں نے اس کے بعد کھانوں کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ نور خاں ٹھیک اور درست کہتا تھا کیونکہ کھانوں کی زندگی کا ایک باب اختتام پذیر ہو چکا تھا۔

کھانوں واقعی گاؤں میں ناکارہ پھرتا تھا۔ اس قسم کے کھانوں کا خاندانی پس منظر وغیرہ نہیں ہوتا وہ بس ہوتے ہیں۔ مٹی سے پیدا ہو کر مٹی ہو جاتے ہیں اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ کبھی کوئی کھانوں بھی تھا۔ بہر حال ہمارے والا کھانوں گاؤں کے راج مستریوں کی مہربانی سے شہر پہنچا اور مزدوری کرنے لگا ---- وہ فجر کے وقت اُٹھ بیٹھتا اور پتہ نہیں کون سی زبان میں نماز پڑھتا پھر سر جھکا کر قرآن پاک کھولتا اور اس کی عبارت پر اپنی بھدی انگلیاں پھیرنے لگتا۔ اُسے یقین تھا کہ آیتیں صرف پڑھے لکھوں کے لئے ہی نہیں ہیں بلکہ اس جیسے چٹے ان پڑھ اگر ان پر صرف انگلیاں ہی پھیرتے رہیں تو بھی کچھ نہ کچھ ثواب ہو جاتا ہے ---- پھر وہ کام کاج میں جُت جاتا اور شام کو دابڑے اور کہی کو زمین پر رکھنے والا وہ آخری مزدور ہوتا وہ رزق حلال پر بھی یقین رکھتا تھا ---- البتہ جمعے کے روز چھٹی ہوتی وہ قریبی مسجد میں جا کر انتہائی باوقار صاف ستھرے اور تقدس کے چہروں والے نمازیوں کی صفوں میں گھس کر بیٹھ جاتا اور اسے ہمیشہ خاصی جگہ مل جاتی کیونکہ انتہائی باوقار صاف ستھرے اور تقدس کے چہروں والے نمازی

۴۹۵ کراہت ہیں رینگتے رینگتے اس سے دور ہو جاتے۔

ادھر چڑیا گھر کا افسر اعلیٰ بے حد پریشان تھا۔

چڑیا گھر کا افسر اعلیٰ اس لیے بے حد پریشان تھا کہ پچھلے چار جمعوں سے چڑیا گھر میں آنے والوں کی تعداد میں پُرتشویش اضافہ ہو رہا تھا ——— اور پرتشویش اس لئے کہ تعداد جب بڑھے تو ہجوم بنتی ہے اور ہجوم اکثر اوقات بے قابو ہو کر نعرے لگانے لگتا ہے اور مُردہ باد کے نعرے کسی کو اچھے نہیں لگتے۔ اور اس چڑیا گھر کا افسر اعلیٰ پریشان تھا کہ گر افسران بالا کو اس عوامی اجتماع کی خبر ہو گئی تو اس کی ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی کیونکہ ان دنوں عوامی اجتماع ——— صرف چڑیا گھروں میں ہی ممکن ہو سکتے تھے۔ چنانچہ افسر اعلیٰ نے اپنے سے ادنےٰ تمام ملازمین کو بلا کر چڑیا گھر کی یک لخت مقبولیت کا سبب دریافت کیا لیکن وہ مہر بلب رہے کیونکہ ان دنوں مُہر بلب رہنے کا بھی رواج تھا۔ بالآخر اس نے اپنے ایک بااعتماد کلرک کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ اس امر کا سراغ لگائے کہ جمعہ کے روز لوگوں کی آمد میں اضافہ کیوں ہو جاتا ہے۔

بااعتماد کلرک نے اگلے ہفتے رپورٹ پیش کی کہ جناب جمعہ کے روز ہجوم کا ایک بڑا حصہ جو بچوں پر مشتمل ہوتا ہے ایک کالے گھڑے نما شخص کھانوں کو دیکھنے آتا ہے۔

"اور یہ کھانوں کیا دیکھنے آتا ہے؟"

"وہ جانور دیکھتا ہے"

"تو پھر یہ بچے بھی جانوروں کو کیوں نہیں دیکھتے؟"

"لوگ انہی جانوروں کو بار بار دیکھ کر اکتا چکے ہیں جناب ——— وہ تبدیلی کے خواہشمند ہیں چنانچہ یہ جو کھانوں ہے اس کی حرکات اور چال ڈھال سے وہ بے حد محظوظ ہوتے ہیں اور ہمہ وقت اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہتے ہیں"

افسر اعلیٰ نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا ——— اگر بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے تو خطرے کی کوئی بات نہیں بچے جب بڑے ہو کر مردہ باد وغیرہ کہنے کے قابل ہوں گے تو پھر دیکھا جائے گا۔

افسر اعلیٰ دفتر سے باہر آیا تو سامنے سے کھانوں چلا آ رہا تھا۔ وہ ہر پنجرے کے سامنے کھڑے ہو کر اس میں قید جانور کو پُراشتیاق نظروں سے دیکھتا تھا اور اس کے پیچھے بچوں کا ایک ہجوم اُسے پُراشتیاق نظروں سے دیکھتا تھا۔

۴۹۱

کھانوں ان دنوں منور خان ٹھیکیدار کی بلڈنگ سائٹ پر مزدوری کرتا تھا اور جمعے کے روز کرابت سے رنگتے ہوئے انتہائی باوقار، صاف ستھرے اور تقدس کے چہروں والے نمازیوں کے ہمراہ نماز پڑھنے کے بعد سیدھا چڑیا گھر دیکھنے آجاتا تھا۔

اس روز افسرِ اعلیٰ جب چڑیا گھر کے جانوروں کو دی جانے والی خوراک، ان کی بیماریوں کے لیے دوائیوں اور دیگر انتظامی امور کے حساب کتاب سے فارغ ہوا تو بااعتماد کلرک نے اس کے سامنے افسرانِ بالا کا بھیجا ہوا ایک سرکلر رکھ دیا۔

" آخر یہ کیا چاہتے ہیں؟" افسرِ اعلیٰ نے سرکلر کا مطالعہ کرنے کے بعد انتہائی بے چارگی سے کہا بااعتماد کلرک ایک مؤدب کھانسی کھانسا اور گویا ہوا" ہمارے افسرانِ بالا عوام کو ہمہ وقت خوش وخرم دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ پورے ملک میں ایک جشن کی سی کیفیت جاری رہے۔ لوگ سڑکوں پر نہ آئیں بلکہ تفریح گاہوں، پارکوں اور چڑیا گھروں میں آئیں۔ گھروں میں رہ کر کڑھنے سے بہتر ہے کہ انسان تازہ ہوا میں سانس لے اور جانور وغیرہ دیکھے"

" اوہو ۔۔ اتنی انگریزی تو میں بھی سمجھتا ہوں" افسرِ اعلیٰ ناراض ہو کر بولا" لیکن پہلے تو یہ احکام تھے کہ لوگوں کا ہجوم نہ بننے پائے اور اب یہ سرکلر آگیا ہے کہ اپنے چڑیا گھر کے ناظرین کی تعداد میں اگر اضافہ نہیں کرو گے تو تمہیں معطل کر دیا جائے گا۔"

" یہ سرکلر میں نے نہیں لکھا" بااعتماد کلرک بھی ناراض ہو گیا۔

" ہوں ۔۔" افسرِ اعلیٰ نے اپنے ذہن پر زور ڈالا" اگر ہم چند مگرمچھ، کچھ بنگالی شیر اور اُلّو وغیرہ حاصل کریں تو بات بن سکتی ہے"

" مشکل ہے جناب ہمارے پاس ان جانوروں کو درآمد کرنے کے لیے زرِ مبادلہ نہیں ہے"

" صرف بنگالی شیر حاصل کر لیتے ہیں"

" جناب بنگالی شیر بھی درآمد کرنے ہوں گے" بااعتماد کلرک خباثت سے مسکرایا۔

" میں اپنی تاریخ سے اتنا بھی ناواقف نہیں ہوں ۔۔" افسرِ اعلیٰ اپنی حماقت پر جھلا گیا

" بہرحال ۔۔ مقامی طور پر کون سے جانور حاصل کیے جا سکتے ہیں؟"

" مقامی طور پر ۔۔۔" بااعتماد کلرک نے بظاہر کچھ دیر کے لیے سوچا اور پھر سر کھجا کر کہنے لگا" بھیڑیں اور بھیڑیے ۔۔"

" کیا احمقانہ باتیں کرتے ہو۔ بھیڑیں دیکھنے کون آئے گا ۔۔۔ اور بھیڑیے، لوگ مزید

خوفزدہ ہوں گے ۔"

افسرِ اعلیٰ اب سوچ میں پڑ گیا، نوکری کا معاملہ تھا۔

" تو پھر ۔۔۔ کیا کرنا چاہیئے ؟" بالآخر وہ لجاجت سے بولا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پُر اعتماد کلرک کے ذہن میں تمام مشکل امور کا فی الفور حل موجود رہتا ہے اور پُر اعتماد کلرک نے فی الفور وہ حل پیش کر دیا " کھانوں ۔۔۔"

افسرِ اعلیٰ نے اس نام کے جانور کا تعین کرنے کے لیے فوراً اپنے ذہن میں دنیا کے دیگر درندوں وغیرہ کے نام دُہرائے اور پھر شرمندہ ہو کر بولا " کھانوں "؟

" جی جناب ۔۔ " پر اعتماد کلرک سیدھا ہو گیا " وہی کھانوں جس کی وجہ سے ہر جمعے کے روز چڑیا گھر کی رونق بڑھ جاتی ہے ۔"

" کتنے میں ملے گا ؟" افسرِ اعلیٰ نے فوراً کہا۔

" وہ انسان ہے جناب ۔۔۔"

" ہاں آں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ درست "

" جناب اگر ہم اُسے کسی طور قائل کریں کہ وہ صرف جمعہ کی بجائے ہر روز چڑیا گھر آجایا کرے تو ہمارے ہاں افسرانِ بالا کے حکم کے مطابق میلہ لگ سکتا ہے "

" کھانوں کو تلاش کیا جائے ۔۔" افسرِ اعلیٰ نے افسرانہ حاکمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گرج کر کہا۔

بااعتماد کلرک کو کھانوں تلاش کرنے میں چنداں دشواری پیش نہ آئی کیونکہ اس روز جمعہ تھا اور کھانوں حسبِ معمول چڑیا گھر میں گھوم رہا تھا۔

" تم ہی کھانوں ہو ؟" افسرِ اعلیٰ نے نرمی سے پوچھا۔

" آہو جناب "

افسرِ اعلیٰ کی تھوڑی سی گھگھی بندھ گئی کیونکہ اس سے پیشتر اس نے ایسی ڈکراتی ہوئی خوفناک آواز چڑیا گھر میں بھی نہیں سنی تھی۔ بہر حال اس نے خطا ہوئے اوسان بحال کئے اور نہایت دوستانہ لہجے میں کہا " دیکھو کھانوں، اگر تم وعدہ کرو کہ ہر روز چڑیا گھر آؤ گے بلاناغہ، تو ہم تم سے داخلے کے پیسے وصول نہیں کیا کریں گے "

کھانوں جو بڑے اطمینان سے چڑیا گھر کی سیر میں محو تھا اور جسے بااعتماد کلرک باقاعدہ درغلا

کر دفتر میں لے آیا تھا قدرے خوفزدہ تھا کہ شائد اس نے کسی بندر کو جو اپنی باسی روٹی کھلا دی تھی اس کی پاداش میں اس کی یوں پیشی ہو گئی ہے اب ایک گہرا سانس لے کر بولا" پر جناب میں تے مجبوری کرناں ـــــ میں کیویں آواں مروز روز"

اس پر بااعتماد کلرک اور افسر اعلیٰ نے آپس میں کچھ کھسر پھسر کی اور پھر بااعتماد کلرک کھانوں کے کندھے پر بڑے بے تکلفانہ انداز میں ہاتھ رکھ کر بولا" تمہیں وہاں کتنی مجبوری میرا مطلب ہے مزدوری ملتی ہے ؟"

" جی پندراں روپے "

" ہم تمہیں تیس روپے دیں گے ـــ "

کھانوں پھر خوفزدہ ہو گیا" پر کیوں جی ! "

" اس لیے کہ ہم تمہیں پسند کرتے ہیں ـــ " افسر اعلیٰ نے بھی بااعتماد کلرک کی پیروی کرتے ہوئے کھانوں کے دوسرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اگرچہ اُسے سیاہ گوشت کے اس تودے کو چھوتے ہوئے کراہت سی محسوس ہوئی .

" پر جی میں تے مستری غلام علی نال پنڈوں آیاں ـــــ اونہوں پچھ لیئو "

" اُسے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے ـــ" افسر اعلیٰ نے اس مستری غلام علی کے لئے مزید کراہت محسوس کرتے ہوئے کہا" تمہیں یہاں پر دُگنی مزدوری ملے گی اور تم ایک نادار اور مستحق شخص کی بجائے جلد از جلد ایک صاحب ثروت فرد بن کر اپنے گاؤں لوٹ سکو گے ـ کیا نام ہے تمہارے گاؤں کا ؟ "

" کوٹ مراد "

" تو بس ٹھیک ہے تم ابھی جاکر اپنا سامان لے آؤ "

کھانوں کے دانت دکھائی دیئے پھر اس کے اندر ایک گراری سی چلی اور گھاں گھاں کرتا ایک قہقہہ باہر آگیا .

افسر اعلیٰ اور بااعتماد کلرک ایک دوسرے کے قریب سمٹ آئے کیونکہ ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے" ہنستے کیوں ہو ؟ "

" جی میرا تے سمان ای کوئی نیئں . بس ایہہ کپڑے نیں جیہڑے دے "

" تو پھر ٹھیک ہے کل سے تمہاری ڈیوٹی شروع "

۴۹۶

اگلے روز صبح سویرے بندروں کے پنجرے کے قریب ایک چار میٹر × چار میٹر کا پختہ تھڑا تعمیر کیا گیا۔ اس پر کھانوں کے نام کی تختی نصب کی گئی اور کھانوں کو بلایا گیا۔

"اس پر چڑھ کر بیٹھ جاؤ"

کھانوں نے فوراً تعمیل کی اور تھڑے پر چڑھ کر آرام سے بیٹھ گیا۔

"نہیں درمیان میں بیٹھو"

وہ اٹھا اور درمیان میں جا بیٹھا۔

افسر اعلیٰ اور با اعتماد کلرک نے تسلی سے ہاتھ ملے اور جانے لگے

"پر جی میں مجوری کی کراں!" کھانوں نے جلدی سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں ـــ" افسر اعلیٰ بولا "بس اس تھڑے پر سارا دن بیٹھے رہو اور شام کو تمہیں تیس روپے مل جائیں گے"

"پر جی ـــ" کھانوں تھڑے سے اتر آیا "میں ویلا نیئں رہ سکدا"

"کمال کے آدمی ہو بیکار نہیں بیٹھ سکتے ـــ" افسر اعلیٰ جھلا گیا اور پھر با اعتماد کلرک کو آنکھ مار کر بولا "ـــ اچھا تو پھر تمہاری مزدوری یہ ہے کہ تم سارا دن تھڑے پر بیٹھ کر ہنستے رہا کرو"

"اچھا جی ـــ" کھانوں قدرے حیرت سے بولا۔

"لیکن ابھی نہیں ـــ جب چڑیا گھر کھلے گا تب!"

چڑیا گھر کھلا تو کھانوں ہنسنے لگا ـــ دوپہر تک اس کا گلا بیٹھ گیا منہ خشک ہو گیا اور اس کا کالا گوشت پسینے سے تر بتر ہو گیا۔۔۔ وہ رزق حلال پر یقین رکھتا تھا۔ اسے یہاں بیٹھنے اور ہنسنے کے پیسے ملتے تھے اس لیئے وہ ڈکراتا رہا زور لگاتا رہا۔۔۔ اس کی رگیں پھول گئیں اور چہرہ جو سیاہ ہونے کی وجہ سے سرخ نہیں ہو سکتا تھا مزید سیاہ ہو گیا۔ اور اسی شام جب چڑیا گھر بند ہوا اور جانوروں کو خوراک دینے والے خاکروب نے کھانوں کے آگے دال کی رکابی اور چند روٹیاں ڈالیں تو وہ جانوروں کی طرح ان پر پل پڑا۔

یوں کھانوں کی نئی مجوری شروع ہو گئی۔ وہ رات کو تھڑے پر ہی سو رہتا اور چڑیا گھر کے کھلتے ہی اس کے درمیان ایڑیوں کے بل بیٹھ کر ہنسنے لگتا ـــ شروع شروع میں نزدیکی پنجرے کے بندر بھی اسے چھوٹے بچوں کی طرح دلچسپی سے دیکھتے رہے اور پھر انہیں اس نئے ہمسائے کی عادت ہو گئی۔ کھانوں کے لیے پہلی رات بقول اس کے بڑی اوکھی تھی کیونکہ طرح طرح کے

جانوروں کی آوازیں اس کے لیے دہشت کا سامان بن رہی تھیں اُسے خطرے کا احساس ہوا مگر پھر اس نے سوچا کہ خطرہ تو ہینڈر گھومتے وقت بھی موجود ہوتا ہے کہ کوئی بھی شہتیر تمہاری کھوپڑی پر گر کر اس کے ٹکڑے کر سکتا ہے یا مصالحے سے بھرے دابڑے کو اٹھا کر جھوتی ہوئی سیڑھی پر اپنے کیچڑ سے بھرے ہوئے پاؤں کے ساتھ تیسری منزل تک جانا بھی تو خطرناک ہوتا ہے تو پھر طے پایا کہ رزقِ حلال کمانے کی خاطر خطرہ مول لینا پڑتا ہے اور یہاں تو تمام درندے فی الحال پنجروں میں بند تھے ۔ اب اسے ہنسنے کی مشق ہو چکی تھی وہ ہمہ وقت نہیں ہنستا تھا بلکہ جب کبھی بچوں کا کوئی غول اس کے قریب آتا تو وہ انہیں محظوظ کرنے کی خاطر گلے کی رگیں پھلا کر گھا گھا کرنے لگتا ... . اس دوران وہ باقاعدگی سے نماز ادا کرتا رہا البتہ اس کا قرآن پاک چھن چکا تھا. ایک صبح وہ حسب عادت اس کی عبارت پر انگلیاں پھیر کر اُسے "پڑھ" رہا تھا کہ ایک بارلیش شخص نے اسے بے حرمتی ٹھہرا کر مقدس کتاب کو اس سے ہمیشہ کیلئے چھین لیا تھا.

ایک روز کسی شرارتی بچے نے اُسے چھوٹا سا کنکر دے مارا. اُس نے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اس کا خون بھی سیاہی مائل تھا. کھانوں نے اس شام افسرِ اعلیٰ سے شکایت کی " مینوں بال ڈھیماں مار دے نیں " " میں کوئی ہلکایا ہویا کُتا تے نیئں ". افسرِ اعلیٰ نے متانت سے سر ہلایا اور اگلے روز کھانوں کے نام کی تختی کے سامنے ایک اور تختی نصب کر دی گئی " پتھر مارنا منع ہے " ... پھر ایک روز کسی بچے نے اس کے سامنے روٹی کا ایک ٹکڑا پھینک دیا. روٹی کا ٹکڑا شام تک وہیں پڑا رہا کھانوں نے اسی شام افسرِ اعلیٰ سے شکایت کی " میں منگتا تے نیئں. مینوں لوک روٹی کیوں پاندے نیں " افسرِ اعلیٰ نے متانت سے سر ہلایا اور اگلے روز نام اور " پتھر مارنا منع ہے " کے پہلو میں ایک اور تختی نصب کر دی گئی " کھانوں کو خوراک کھلانا منع ہے " ... . ایک اور روز کسی نے یونہی ایک روپے کا نوٹ کھانوں کی طرف پھینک دیا. کھانوں کا چہرہ سیاہ ہونے کی وجہ سے سُرخ نہ ہو سکا مزید سیاہ ہو گیا اور اس نے اسی شام افسرِ اعلیٰ سے شکایت کی. " میں مجبوری کرناں، لوکی مینوں اللہ واسطے پیسے کیوں دیندے نیں " افسرِ اعلیٰ کی ذاتی اخلاقیات میں تو یہ نہایت عمدہ بات تھی کہ یوں بیٹھے بٹھائے نوٹ ملتے جائیں بہرحال اس نے پھر متانت سے سر ہلایا اور اگلی صبح ایک اور تختی کا اضافہ ہو گیا " کھانوں کو بھیک دینا منع ہے " اس کے بعد کھانوں ایک مطمئن اور پُر امن زندگی بسر کرنے لگا. لوگ اُسے دیکھنے آتے اور تختیوں پر

ہدایات پر عمل کرتے۔ البتہ کچھ عرصے بعد ایک آسودہ حال خاتون غصّے سے سُرخ ہوتی ہوئی افسرِ اعلیٰ کے دفتر میں داخل ہوئی اور یہ خاتون اس لیے سُرخ ہو سکتی تھی کہ اس کا رنگ سیاہ نہ تھا بلکہ انتہائی دودھیا اور ملائم سفید تھا۔ خاتون نے اتنی قوت سے افسرِ اعلیٰ کی میز پر مُکّا مارا کہ افسرِ اعلیٰ جو قدرے غنودگی میں تھا فوراً اچھل پڑا کہ شاید کوئی ببر شیر وغیرہ خوراک کی کمی کی شکایت کرنے بنفسِ نفیس اس کے دفتر میں گھس آیا ہے۔

496

"جی فرمائیے" افسرِ اعلیٰ نے آسودہ حال خاتون کے آسودہ چہرے اور آسودہ لباس سے مرعوب ہوتے ہوئے دریافت کیا۔

"آپ نے ایک نہایت خوفناک درندے کو برسرِ عام بٹھا رکھا ہے" خاتون گرجیں۔

"درندہ؟" افسرِ اعلیٰ دوبارہ اچھل پڑا۔

"جی ہاں، جسے آپ نے ایک تھڑے پر بٹھا رکھا ہے"

"اچھا وہ...." افسرِ اعلیٰ مسکرایا "محترم خاتون وہ تو کھانوں ہے"

"وہ سیاہ اور کریہہ المنظر چیز جو بھی ہے خطرناک ہے۔ اس نے میرے بے بی کو اس طرح گھور کر دیکھا کہ بے چارہ بے بی ابھی تک اپ سیٹ ہے"

"میں اس سے بات کروں گا کہ وہ آئندہ بے بیوں کو گھور کر نہ دیکھے"

"بات! ..... اوہ" خاتون نے "اوہ" کرتے ہوئے اپنی ہتھیلیاں کنپٹیوں پر جمائیں اور آنکھیں پھاڑ کر چھت کی طرف دیکھا "میں کہتی ہوں وہ خطرناک ہے اُسے باندھ کر رکھنا چاہیے زنجیروں وغیرہ سے ....."

"لیکن خاتون وہ باقاعدہ جانور تو نہیں کہ اُسے ..... دیکھیے ہم ایک اور تختی نصب کر دیں گے کہ یہ خطرناک ہے"

"تختی سے کام نہیں چلے گا، کیا چھوٹے بے بی اُسے پڑھ سکیں گے ...."

"لیکن خاتون ......"

"اُسے فی الفور زنجیروں سے باندھ دینا چاہیے" خاتون نے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے افسرِ اعلیٰ پر جیسے تھوکا "ورنہ میں آپ کے بڑے افسر سے شکایت کر دوں گی آپ جانتے نہیں کہ میں کس کی بیوی ہوں؟"

افسرِ اعلیٰ نے یہ جاننے کی ہرگز کوشش نہ کی کہ خاتون کس کی بیوی ہے اور اُسے ایک

ایک معقول تجویز قرار دیتے ہوئے فوراً ہامی بھر لی۔

497

یہ وہی دن تھا جب کھانوں کے لیے۔۔۔۔۔۔

ایک زنجیر لائی گئی۔

"کھانوں یہ زنجیر تمہارے پاؤں میں ڈال دیں؟"

"میں کوئی جنور تے نئیں"

"نہیں نہیں تم انسان ہی ہو جانور تو نہیں لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ لیکن" افسر اعلیٰ نے زنجیر ڈالنے کے لیے کوئی مناسب قسم کا جواز نہ ملنے پر با اعتماد کلرک کو گھورا جو فوراً گویا ہو گیا "بھئی کھانوں دراصل یہ تھڑا خطرناک ہے۔ تم اس سے نیچے گر سکتے ہو تمہیں چوٹ لگ سکتی ہے"

کھانوں نے ایک فٹ بلند چبوترے کی طرف دیکھا اور گھاں گھاں کرتا ہنسنے لگا "یُس تے کہیا تریجی منزل توں نیئں ڈگ‌گا۔ ایتھوں کنج ڈگ پواں گا"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "اب کیا کریں؟"

خاموشی کے مختصر وقفے کے بعد افسر اعلیٰ ایک خبیث مسکراہٹ سے لیس ہو کر آگے بڑھا "دیکھو کھانوں ہم دونوں تمہارے دوست ہیں کمال ہے یار دوستوں کی اتنی سی بات نہیں مانتے۔ شاباش"

"دوست؟" کھانوں نے منہ کھول دیا "پھیر جیویں آکھو"

با اعتماد کلرک پھرتی سے چبوترے پر چڑھا اور کھانوں کی دونوں پنڈلیوں میں زنجیر ڈال دی۔۔۔ زنجیر کھانوں سے بھی وزنی تھی۔۔۔۔ وہ اپنے دوستوں سے شکایت تو نہیں کرنا چاہتا تھا مگر زنجیر کے بوجھ کی وجہ سے اب وہ ایڑھیوں کے بل بیٹھ نہیں سکتا تھا چنانچہ اس نے پھر منہ کھولا "پر جی میں اِنج بہہ نیئں سکدا"

"اگر وزن کی وجہ سے بیٹھنے میں دشواری پیش آرہی ہے تو بے شک اپنے دونوں ہاتھوں کو استعمال میں لاؤ۔۔۔ یوں" با اعتماد کلرک نے چبوترے پر چڑھ کر اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر جما کر کھانوں کی مشکل آسان کر دی۔

کھانوں نے بھی اپنی دونوں ہتھیلیاں زمین پر رکھیں اور سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا "جی اینج؟" "بالکل" افسر اعلیٰ نے خوش ہو کر کہا

"جی اِنج تے جنور بہندے نیں" کھانوں نے پرتشویش لہجے میں کہا
"بالکل، جانور اس طرح بیٹھتے ہیں اور اس لیے اتنے آرام سے بیٹھے رہتے ہیں... فکر نہ کرو تمہیں عادت ہو جائے گی۔"

کھانوں کو زنجیر کی عادت ہو گئی۔

اُسے جانوروں کی طرح بیٹھنے کی بھی عادت ہو گئی۔

وہ حوائج ضروریہ کے لیے بھی اٹھ کر نہیں جا سکتا تھا اس لیے ایک خاکروب چبوترے کی صفائی پر مامور کر دیا گیا۔

اب وہ پلید رہتا تھا۔ مقدس کتاب کے بعد نماز بھی چھن گئی۔

چڑیا گھر کھلتا تو بچوں اور بڑوں کے غول اس کے چبوترے کے گرد ہو جاتے وہ سر اُٹھاتا اور ہنسنے لگتا۔ اس کی آواز مزید گھگھیا چکی تھی اور گلا اس طور بھول چکا تھا کہ اکثر اوقات گمان ہوتا کہ وہ ہنس نہیں رہا بھونک رہا ہے۔ ... اس کی ہتھیلیاں اب تلووں کی طرح سخت ہو چکی تھیں۔ زمین کے ساتھ جیسے جڑ چکی تھیں پہلے پہل یوں کھڑا ہونے سے اس کی کمر میں شدید درد شروع ہو جاتا اور وہ اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے کے بعد رات کے وقت تھوڑی دیر کے لیے دونوں ہتھیلیاں اُٹھا کر اگلے زمانوں کی طرح کھڑا ہو کر آرام کر لیتا پھر آہستہ آہستہ اُسے صرف دونوں پاؤں پر کھڑے ہونے میں دقت محسوس ہونے لگی اور ایک رات کھانوں جب حسبِ معمول آرام کرنے کی خاطر اپنے ہاتھ زمین سے اُٹھانے لگا تو اس کی کمر میں اذیت ناک درد کا ایک جھٹکا سا لگا اور وہ منہ کے بل گر گیا۔ اس نے لاکھ کوشش کی مگر اس کے ہاتھ زمین سے جُدا نہ ہو پائے اگر ہو نے تو ان کی جگہ اس کا مُنہ جا گرتا اس نے صرف ایک ہاتھ زمین سے اُوپر کرنے کی کوشش کی مگر وہ پھر اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور گر گیا۔ ... اگلی صبح کھانوں کی آنکھیں سُرخ تھیں اس لیے وہ سیاہ نہ تھیں اس لیے سُرخ ہو سکتی تھیں۔

کھانوں کو روزانہ تیس روپے رزقِ حلال کی صورت میں ملتے رہے۔ وہ ہنستا رہا اور اپنے خدا کی نعمتوں کا شکر ادا کرتا رہا کہ اس نے اُسے اب دو کی بجائے چار پاؤں لگا دیئے تھے

پھر ایک اور سرکلر آگیا

"جلدی جلدی۔ ہمارے چڑیا گھر کے بہترین جانور، اونٹ، ہاتھی، شیر، مگرمچھ

سانپ، بندر وغیرہ ۔۔۔۔ فوراً افسرِ اعلیٰ ایک ہذیانی کیفیت میں مبتلا نظر آتا تھا۔
"انہیں فوراً پورٹ ایبل پنجروں میں بند کیا جائے۔۔۔۔ ہم کل صبح روانہ ہو جائینگے
"مگر کہاں کے لیے؟" با اعتماد کلرک نے بصد ادب دریافت کیا۔

"یہ" افسرِ اعلیٰ نے تازہ سرکلر ہوا میں لہرایا" ملک صرف شہروں کا نام نہیں اس میں دیہات بھی ہیں اور دیہاتی آبادی ان دنوں قدرے ناخوش ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی تفریح کا بھی خیال رکھیں چنانچہ اونٹ ہاتھی شیر۔۔۔۔"

"جناب میں سمجھا نہیں" با اعتماد کلرک نے پھر بصد ادب کہا۔

"افسرانِ بالا کا حکم ہے کہ ہم ایک سفری چڑیا گھر ترتیب دیں اور ملک کے دیہات میں جا کر جنگلی جانوروں کی نمائش کریں تاکہ وہاں بھی موج میلے کی ایک کیفیت پیدا کی جا سکے چنانچہ اونٹ، ہاتھی، شیر، مگرمچھ۔۔۔۔"

"مگر جناب ۔۔۔ مگرمچھ ۔۔۔ تو نہیں جا سکتے، ان کے لیے پانی درکار ہوتا ہے"

"مگرمچھ بنیادی طور پر خشکی کا جانور ہے" افسرِ اعلیٰ نے اپنے ماتحت کو ڈانٹ پلائی"۔ ہم انہیں پیک کر کے لے جائیں گے اور ہر گاؤں کے جوہڑ میں چھوڑ دیں گے ۔۔۔۔"

"بہت عمدہ تجویز ہے جناب" با اعتماد کلرک نے پھر بصد ادب کہا۔ اگرچہ اُسے ابھی سے تشویش شروع ہو گئی تھی کہ بعد میں ان مگرمچھوں کو جوہڑوں سے نکالا کس طرح جائے گا۔۔۔ اُسے معلوم تھا کہ بالآخر یہ کام بھی اسی کے سپرد ہو گا۔

اگلی صبح جب تمام مقبول ترین درندے پورٹ ایبل پنجروں میں بند کئے جا چکے تھے تو با اعتماد کلرک نے افسرِ اعلیٰ کے کان میں صرف ایک سرگوشی کی۔

"درست بالکل درست ۔۔۔ اُسے بھی پنجرے میں بند کر دیا جائے"

"مگر جناب یہ ذرا اچھا نہیں لگتا بہرحال وہ اتنا زیادہ جانور تو نہیں ہے"

"درست بالکل درست ۔۔۔ ہمیں انسانی اقدار کی پاسبانی کرنی چاہیئے اس کے لیے زنجیر ہی کافی ہے ۔۔۔۔"

دیہات میں سفری چڑیا گھر کی دھوم مچ گئی ۔۔۔ ہر گاؤں کے باہر جانوروں کی نمائش ہوتی اور مگرمچھوں کو نزدیکی جوہڑ میں ڈال دیا جاتا۔ کسان اور مزدور پیشہ لوگ اپنے کام کاج ترک کر کے بھنگڑا ڈالتے ہوئے اس نئے میلے میں شرکت کے لیے آتے

اور کھاد کی کمی پانی کی کمی آزادی کی کمی وغیرہ کو چند لمحوں کے لیے بھلا دیتے۔ اگلی صبح مگرمچھوں کو جوہڑوں میں سے نکالا جاتا اور ہر مرتبہ ایک آدھ مگرمچھ کم ہوتا اور سفر جاری رہتا۔۔۔ سفری چڑیا گھر کا تجربہ کامیاب ہو رہا تھا۔ دیہات میں بے چینی کا گراف وقتی طور پر کم ہو رہا تھا۔۔۔ البتہ افسر اعلیٰ کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ اگرچہ اونٹ ہاتھی مگرمچھ وغیرہ بڑے ہیٹ جا رہے تھے مگر کھانوں کے چبوترے کے پاس بہت کم لوگ دیکھنے میں آتے تھے تحقیق پر معلوم ہوا کہ دیہات کے اکثر نوجوانوں کی شکلیں کھانوں سے ملتی جلتی تھیں اور انہیں اپنے جیسے ہی کسی جانور کو دیکھنے میں دلچسپی نہ تھی بلکہ ان کی آنکھوں میں قدرے ناپسندیدگی کے جذبات تھے۔۔۔ شائد کھانوں کے لیے اشائد افسر اعلیٰ کے لیے۔۔۔ کھانوں ان نوجوانوں کے سامنے سر جھکائے بیٹھا رہتا اور جب بھی اوپر دیکھتا اُسے اپنی تصویریں حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتیں۔ اس نے ہنسنا ترک کر دیا۔ اب بھی رزق حلال پر اس کا پختہ ایمان تھا مگر سفر کے ساتھ ساتھ، نوجوانوں کے چہروں تپے زمینوں کی قربت نے کھیتوں کی باس نے اس کے سیاہ جسے کو ایک عجیب طرح کی بے چینی کے قریب کر دیا جو اس پر ایک آری کی طرح چلنے لگی، کھانوں کے اس دماغ پر جس میں بھس بھرا ہوا تھا چنگاریوں کی صورت گرنے لگی۔۔۔ اب وہ اپنے آگے رکھی ہوئی خوراک کو بھی منہ نہ لگاتا اور بھوکا بیٹھا رہتا، نگران عملہ چپکے سے یہ خوراک چٹ کر جاتا کہ وہ بہرحال انسانی خوراک تھی۔

مسلسل فاقوں سے کھانوں کا وزن کم ہونے لگا۔ اس کے بدن کی سیاہ زمین میں دراڑیں پڑ گئیں۔ آنکھوں کی پھرکیوں کی حرکت مدھم ہونے لگی۔۔۔ افسر اعلیٰ اور باعتماد کلرک اپنی بے مثال کامیابی پر اتنے پُرمسرت تھے کہ انہیں کھانوں کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی۔

ایک روز کھانوں نے اپنی اصلی ٹانگ ہلائی، زنجیر جو ہمیشہ پنڈلیوں سے اوپر پھنسی رہتی تھی ایک چھناکے سے ٹخنوں پر آ گری۔۔۔

اسی شام قریب سے گذرتے عملے کے کسی شخص نے اس کے گاؤں کوٹ مراد کا نام لیا وہ کوٹ مراد و" کھانوں نے زمین میں پیوست ہتھیلیوں کو اٹھانے کی کوشش کی اور حسبِ معمول منہ کے بل گر گیا۔ وہ اسی حالت میں پڑا رہا۔ ایک خاکروب جب رات کے

501

کھانے کی رکابی اس کے آگے رکھنے آیا تو کھانوں نے وہیں پڑے پڑے پوچھا" بھائی جی کل ساڈھا چڑی گھوڑ بڑے پنڈ جائے گا ؟"

" کل صبح کوٹ مراد میں جانوں کی نمائش لگے گی" خاکروب نے جاتے جاتے جواب دیا کھانوں کے دماغ میں بھرا تمام تر بھُس سلگنے لگا۔ ۔ ۔

" کھانوں "

" پتھر مارنا منع ہے "

" کھانوں کو خوراک کھلانا منع ہے "

" کھانوں کو بھیک دینا منع ہے "

" کھانوں یہ زنجیر تمہارے پاؤں میں ڈال دیں ؟ "

" میں کوئی جنور تے نیئں "

میں جنور تے نیئں ۔ ۔ ۔ میں جنور تے نیئں۔ کھانوں کے اندر بے شمار گراریاں سی چلنی لگیں اور ان میں سے ایک گھاگھا کرتی آواز آئی میں جنور تے نیئں ۔ ۔ میں جنور تے نیئں اور اس شور میں ایک کالی کوئل کوکی، کوٹ مُراد۔ کوٹ مُراد ۔ ۔ ۔ ۔ نصف شب کے قریب کھانوں نے زور لگا کر پاؤں کھینچے ٹخنوں کے گرد گوشت کو چھیلتی ہوئی زنجیر کی اذیت نے اُسے کراہنے پر مجبور کر دیا۔ " کوٹ مُراد" کالی کوئل کوکی اور اس نے اپنے بھدّے ہونٹ بھینچ کر پھر زور لگایا" کوٹ مُراد" کوئل کوکی اور اس کے کالے بدن سے پسینے پانی کی طرح بہنے لگے ۔ ۔ ۔ " کوٹ مُراد" اس کا بدن کوکنے لگا اور اس نے پھر زور لگایا اور ٹخنوں کے اُوپر کا گوشت چھلتا چلا گیا۔ خون کی رطوبت نے زنجیر کی سختی کو نرم کیا اور کھانوں منہ کے بل گر گیا۔ لیکن وہ اس مقام سے ایک ہاتھ آگے جاکر گرا جہاں پر وہ ہمیشہ گرتا تھا، زنجیر اور اس کے پاؤں کے درمیان بھی ایک ہاتھ کا فاصلہ تھا۔ ۔ ۔ وہ رینگتا ہوا چبوترے سے اُتلا سفری چڑیا گھر کے میدان سے باہر آیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر چاروں "پاؤں" پر چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اس حالت میں وہ مدتوں بیٹھا رہا تھا مگر اس طور چلنے کی یہ پہلی کوشش تھی۔ اگلے زمانوں میں وہ زمین کو بلندی سے دیکھتا تھا اور آج وہ اس پر ناک رگڑتا ہوا چل رہا تھا۔ ۔ ۔ اس کی ہتھیلیاں تو پاؤں کے تلووں کی مانند سخت ہو چکی تھیں مگر جنگلی گھاس اُس کے نتھنوں کو چھید رہی تھی اور اُسے سامنے دیکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی اور سامنے صرف گھاس تھی ۔ ۔ ۔

وہ تیز تیز بھاگنے لگا، سرکنڈوں کی تیز دھاریں اس کے جسم پر اذیت کی لکیریں کھینچ رہی تھیں ہر سرکنڈا اس پسینے اور خون میں ڈوبے ہوئے سیاہ بھاگتے ہوئے بدن کی کمر کے گرد بندھے ہوئے مختصر کپڑے کی ایک دھجی اپنی نوک سے اُچک لیتا تا آنکہ یہ پسینے اور خون میں ڈوبا ہوا سیاہ جسم صرف ایک جسم نظر آنے لگا، بھاگتا ہوا زبان نکالے، سانس کے لیے ہونکتا ہوا بھاگتا ہوا . . . گھاس اور سرکنڈوں کا میدان ختم ہو گیا۔ آگے ایک سوکھا ہوا راجباہ تھا وہ پاؤں جما جما کر نیچے اُترا اور پھر دوسرے کنارے پر چڑھنے لگا۔ راجباہ عبور کرنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ جنگلی گھاس اور سرکنڈوں کا میدان ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایک سبز زمین ہے جو اس کے جسم کے گرد پھیل رہی ہے۔ اس کے پاؤں تلے مٹی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر ہتھیلیوں کو زمین کی گرفت سے آزاد کرنے کیلئے زور لگایا اور ایک مرتبہ پھر اوندھے مُنہ گر گیا۔

اس کی ناک بھربھری مٹی میں دھنس گئی اور اس کے کھُلے مُنہ کو بھی مٹی نے پُر کر دیا اس نے ہاتھ پھیلائے ہتھیلیاں کھول کر زمین پر رکھیں، انہیں مٹی سے آشنا کیا۔ وہ تھکا ہوا اُسی حالت میں اوندھے مُنہ پڑا رہا . . . پھر اس کے نتھنے ایک پیاسے پرندے کی طرح پھڑ پھڑائے اور اس نے ایک طویل سانس لیا، باریک مٹی اور اس کی باس ہوا کے ساتھ مل کر ایک مٹیالی دھند کی صورت اس کے بدن میں اُتری اور شریانوں میں پھیلتی گئی۔ اس نے گرد آلود لبوں پر زبان پھیری اور اس کا حلق اپنی مٹی کے ذائقے کی پہچان سے آشنا ہوا . . . . اس کا بدن مٹی تھا اور اس کا رنگ مٹی کا رنگ تھا . . . گندم کی بالیاں اس کے سر پر سرسرا رہی تھیں اور یہ بالیاں اس کے بدن کی مٹی میں سے پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے ایک اور گہرا سانس لیا اور سر اُٹھایا اور پھر جس طرح کہ اس کی ماں نے سکھایا تھا۔ اور جس طرح کہ اس کی مٹی نے بتایا تھا اور جس طرح کہ وہ ہمیشہ سے تھا اور جس طرح کہ اس کا بدن تھا اور جس طرح وہ بدن بلا تردد اس کا کہنا مانتا تھا اس نے مٹی سے بھری ہتھیلیاں اُٹھائیں اور سیدھا کھڑا ہو گیا . . . سامنے کوٹ مُراد تھا۔

یونس جاوید

کتا مکھی

"پولی کو تلف کرو ـــــ پولی کو تلف کرو" ـــ گذر نے راستے کی دیواروں پہ جگہ جگہ لکھا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ پولی نظر نہ آتی تھی۔ شاید تھی ہی نہیں ـــ محض شبہ تھا۔ البتہ کچھ ایسے درخت ضرور تھے جو ٹنڈ منڈ، کانٹے دار اور بے سایہ تھے اور زمین کا سارا رس چوس رہے تھے انہی کی وجہ سے گلابوں کی کیاریاں سوکھ رہی تھیں، رنگ تھا نہ سبزہ۔ نہ خوشبو ـ! حتیٰ کہ خودرو گھاس بھی بے رس زمین سے رزق نہ ملنے کی وجہ سے زرد تھی ـــــ ان کانٹے دار، بے پھل، بے سایہ درختوں کے نیچے کچھ بھی تو نہیں اُگ رہا تھا ـ سب لوگ پولی کی تلاش میں تھے ان بوجھل درختوں کی طرف کوئی متوجہ نہ تھا۔

صرف یوسف تھا جو اس کے بارے میں سوچ رہا تھا ـــ شاید دوسرے لوگوں نے بھی اپنی جگہ ایسا ہی سوچا ہو مگر ـــ شاید کوئی بھی اکیلا تنہا انہیں نہ کاٹ سکتا تھا ـــ یوسف بھی نہیں۔ اُسے صرف راستہ چاہیے تھا مگر ہر ٹنڈ منڈ درخت دوسرے بے پھل درخت سے اس طرح الجھ کر، جڑ کر کھڑا تھا کہ گذرنا تو درکنار ـــ دوسری طرف دیکھنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ زمین کانٹوں سے اٹی تھی ـــ کہ یوسف کے پاؤں زخمی تھے ـــ پیاسا ہونے کے سبب یہ کانٹے حلق تک میں اُگ رہے تھے وہ بولنا چاہتا تھا ـ مگر بول نہ سکتا تھا ـــ سننے والا بھی تو کوئی نہیں تھا۔ وہ صرف سوچ سکتا تھا ـــ گیلی لکڑیوں میں دھواں زیادہ تھا ـــ آگ کم۔ پاؤں سہلاتے۔ سلگتے، سوچتے اس نے ایک مرتبہ پھر یار دیکھنے کی کوشش

کی —— ایسا گھنا — کالا جنگل —— اس نے پہلے نہ دیکھا تھا۔

برسوں پہلے جب وہ بچہ تھا —— تو قصر آباد کی تلاش میں نکلا تھا —— اس کا سارا زور سارا حسن سب کچھ قصر آباد کو دیکھنے، پا لینے کی امنگ کی صورت میں موجزن تھا —— جذبہ صادق ہوتے ہوئے بھی سب راستے ہر پھر کر اسی راستے سے آ ملتے تھے۔ جہاں سے وہ چلا تھا راستہ موجود تھا —— اور اس کا وجود —— ایک امید ——

اسی امید کی حدّت سے اس نے اپنے آپ کو پگھلایا، موم کیا۔ اور سفر کے قابل بنایا —— پھر یکایک وہ بنا بدل گئی ——

لوگ کل دار کھلونوں کی مانند چلنے پھرنے لگے —— کوئی کچھ کہتا نہ سنتا —— اس نے ہر آنے، جانے والے کے سامنے بہت زبان چلائی —— مگر یوں لگتا تھا لوگ آواز سنتے ہیں —— زبان نہیں سمجھتے ——

وہ تھک کر سستانے بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے —— سب اسے اپنی اپنی آواز میں راستہ بتا رہے تھے —— ساری آوازیں مل کر شور بن رہی تھیں —— اور حاصل کچھ نہ تھا۔ جس شخص نے پہلی مرتبہ اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی اس کی آواز اس تک پہنچے ہی نہ دی گئی —— آوازوں کا بھنور پھیلا تو وہ پہلا شخص کہیں گم ہو گیا —— وہ اس آواز کی تلاش میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا —— مگر تھکن پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔

پھر دوسرا آیا —— پھر تیسرا —— سب کی کوشش یوسف کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے تک تھی۔

پھر شاید مرعوب کر لینے کی قوت تھی یا مرعوب ہو جانے کی تھکن —— کچھ تھا ضرور ——

وہ کون تھا جس سے وہ مرعوب ہو گیا تھا —— اسے معلوم نہ تھا۔ مگر اس کے لیے اس کے دل میں احترام بیدار ہوا تھا —— بیٹا کہہ کر محبت سے گلے لگانے والے نے کچھ ایسا ظاہر کیا کہ اس کے اندر درد کی ابھرتی ڈوبتی لہروں نے دم توڑ دیا ——

منزل کا نشان سمجھ کر سکھ، سکون کا سانس اس کے لیے کیا خوشی لے آیا تھا کہ وہ اس کے پاس رہ گیا ــــ دونوں قصر آباد کی گفتگو کرنے لگے۔

روشنی اور سایوں کی اس بنتی بگڑتی امیدگاہ کو اس نے اپنا پہلا پڑاؤ سمجھا تھا۔ لات، آرام دہ بستر، روشنیاں، سبھی کچھ تھا ــ مگر ان سب کے عوض اس باپ نے بھی اس کی رانوں پر ہاتھ مارا تو وہ چونک گیا۔ یہ کیسا رشتہ تھا، اعتماد بحال ہونے کا لمحہ گذرتے ہی سارا تانا بانا بکھر کر رہ گیا وہی کچھ جو وہ ایک عرصے سے بھگت رہا تھا۔ مگر اس شخص کو اس نے دل سے اپنا باپ اپنا رہبر مان لیا تھا سارا اعتماد، سارے عقیدے اس کی ذات میں یکجا کر دیئے تھے پھر یہ رشتہ کیوں ایکسپلائٹ ہوا۔ دکھ کی بات یہی تھی۔

سخت صدمے نے جہاں اسے نڈھال کیا تھا وہاں وحشت زدہ بھی ــــ اس وقت یہی وحشت اس کے کام آئی ــــ اور اس سے پہلے کہ وہ شخص اس کی گردن دبوچ لے وہ اپنی بچی کھچی قوت اور وحشت کے ترازو میں تل سا گیا اور تیزی سے بھاگ لیا ــــ تیز ــــ بہت تیز ــــ بے حد تیز۔

تیز دوڑنے سے چیزیں پیچھے رہی جاتی تھیں اور ہوا بھی یہی ــــ وہ آگے نہیں بڑھ رہا تھا ــــ چیزیں پیچھے دوڑ رہی تھیں ــــ اپنی ساری صلاحیتوں کے باوجود جب وہ نڈھال ہو کر گر پڑا تو وہ کولھو پر ہی کھڑا تھا ــــ سب کچھ وہی تھا ــــ جوں کا توں ــــ تو پھر وہ کہاں دوڑتا رہا ہے؟ ساری سمتیں ایک سمت میں جذب ہو گئی تھیں کیا؟

سین بدل نہیں رہا تھا ــــ گرنے کے باوجود وہ ہوش میں رہا دن گذرا اس گذرا پھر مدت گذر گئی ــــ اور یہ سین اس وقت بدل گیا، جب فٹ پاتھ کیساتھ بیگم وقار جمال کی گاڑی یوں آگئی جیسے کشتی ساحل سے آلگتی ہے۔ کہنے کو تو بیگم وقار جمال کی گاڑی ساحل سے آ لگی تھی مگر ہوا یوں کہ اسے ساحل سامنے دکھائی دینے لگا جب بیگم وقار جمال گاڑی سے اتریں، اسے اٹھایا، پتہ پوچھا۔ اور یہ جان کر وہ بے راہ ہے گم راہ نہیں، اور قصر آباد جانا چاہتا ہے ــــ تو انہوں نے اسے تسلی دی ــــ حوصلہ بڑھایا اور گاڑی میں اپنے برابر بٹھا لیا۔

یہ وہ وقت تھا جب وہ گندے کپڑوں میں تقریباً بے سدھ پڑا تھا پھر بھی بیگم وقار نے میٹھی نظر سے اس کی طرف دیکھا تو اسے لگا کہ ایک ٹھنڈک اس کے خون میں اتر گئی ہے۔

"تمہارا گھر؟" بیگم وقار نے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا

"گھر؟" یوسف نے شاید اپنے آپ سے سوال کیا

"ہاں گھر!"

"گھر؟؟" یوسف نے کرید کر پوچھا

"قصر آباد میں ہے نا؟" وہ بولی

"مجھے نہیں معلوم" اس نے بے دلی سے کہا

"قصر آباد کیوں جانا چاہتے ہو؟"

وہ چپ رہا۔

"کیوں جانا چاہتے ہو" وہ پھر بولی تو اس نے کہا "وہی تو ہے ہمارا مسکن — منزل —"

"ہمارا؟" بیگم وقار جال نے چبا کر کہا

"ہاں" وہ کہنے لگا — "میرا — تمہارا — سب کا مسکن"!

گاڑی ایک عظیم الشان مگر پرانی عمارت کے اندر داخل ہوگئی۔ جو پرانی پرشکوہ اور پراسرار تھی حسن اس کی نس نس میں گندھا تھا اس نے آنکھیں جھپک کر دو مرتبہ دیکھا۔

بیگم وقار جال گاڑی سے اتری — دروازہ کھولا۔ ہمدردی سے اسے سہارا دیا۔

"یہ تمہارا گھر ہے — پسند ہے؟"

وہ چپ رہا — حالانکہ وہ بڑی دیانت داری سے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر سمجھ نہ سکا تھا۔

تب سے اب تک اس نے رنگ بدلتے رشتے دیکھے تھے — یہاں ہر پل رشتہ کیوں بدل جاتا ہے۔ خاص طور پر لیڈ کرنے والے کا؟ — راہنما — یا منزل کا پتہ دینے والوں کے روپ — یوں تو اسے مختلف نظر آئے — مگر

اندر سے سب کا خون، سب کی نیت ——— ارادے ——— سب کچھ یوں نکلتی تھا —— جیسے تمام سڑکیں میرے گھر سے نکلتی ہیں۔ سب کا منبع بھی ایک تھا — فنا بھی ——— ! ایک ایڈونچر ہوتا ہے جو نئے سے نئی راہ سجھاتا ہے ——— یا پھر امید — کتنے بھی روپ بدلے — تھوڑی سی دنیا ——— تھوڑی کشش ہمیشہ ہر دفعہ اس کے اندر موجود رہتی ہے ——— جس کے لیے وہ اس مرتبہ بھی اس گاڑی میں بیٹھ گیا تھا ——— قصر آباد تک پہنچنے کی تمنا ابھی زندہ تھی ——— اور جوانی میں تو تمنائیں کچھ زیادہ ہی توانا اور پر جوش ہوتی ہیں۔

دونوں اندر آ گئے

سنسان مگر سجی حویلی میں ہر دروازہ مختلف رنگوں، مختلف ریشموں اور مختلف ڈیزائنوں میں سلے پردوں سے مزین تھا۔ یہ شیش محل تو نہ تھا مگر دیواروں میں وہ چمک تھی کہ قدم قدم پر تحیر اس کا دامن تھام لیتا تھا وہ ابوالحسن کی طرح کا کوئی خواب بھی نہیں دیکھ رہا تھا —— ہوش میں تھا ——— کچھ کچھ جوش میں بھی۔ بیگم وقار جمال کے رویے، سلوک اور گفتگو کے توازن نے اسے اس حد تک آسودہ کر دیا تھا کہ اسے قصر آباد سامنے دکھائی دے رہا تھا

فرشتے ہمیشہ انسان کے روپ میں اترے ہیں ——— اس لیے کہ انسان فرشتے سے افضل ہے، ارفع ہے ہر چرند پرند، ہر جانور ہر مخلوق سے زیادہ۔

سب سے پہلے اسے نہلایا گیا۔ ہر کثافت، ہر آلودگی ——— ساری تھکن دھل کر بہہ گئی پھر اس نے ایسا لباس پہنا۔ جو اس سے پہلے شاید نہ پہنا تھا۔ کچھ کھایا تو آنکھوں میں روشنی اتر آئی —— اور جب آئینہ دیکھا تو اسے لگا کہ وہ شہزادہ ہے۔

وہ اس سے پہلے کہاں تھا ——— ساری نعمتیں ——— ساری آسودگیاں اس کے لیے ہی تو تھیں ——— وہ ان سے کیوں محروم رہا ——— اور اگر سب کو ہر ایک کو اس طرح سے سکھ مل جائیں ——— تو یہ علاقہ قصر آباد ہو سکتا ہے ——— بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہی ہو ——— وہ سوچ رہا تھا ——— یہ سوچ بھی شاید اچھے کھانے اور اچھے لباس کے باعث تھی۔

"میرے سائز کے کپڑے آپ کے پاس کیسے پہنچے؟" وہ خاموشی سے

508

اکتا گیا تھا۔ کچھ کہنا، جاننا چاہتا تھا۔

"میرے پاس ہر سائز، ہر رنگ کے کپڑے موجود ہیں" رک کر بیگم وقار جلال کہنے لگی "میں اکثر دوسروں میں کپڑے تقسیم کرتی ہوں۔ اس لیے کہ اکیلی ہوں۔ اور میرے پاس ــــ میرے اخراجات سے کچھ زیادہ ہے"

"آپ کے بچے ــــ میاں ــــ؟" اس نے رک رک کر پوچھا ــــ

"سب ہیں۔ اپنی اپنی جگہ" رک کر اس نے کہا" اور مطمئن ــــ" پھر اس نے بات بڑھائی ــــ "کوئی بزنس ہیں ــــ کوئی سروس ہیں۔ مگر تم نے اپنے بارے میں مزید کچھ نہیں بتایا؟"

"میں پانچ برس کا تھا ــــ" وہ اداس ہو کر کہنے لگا ــــ "جب اس شہر میں آیا تھا"

"پھر ــــ؟" وقار جلال نے کریدا ــــ

"تب سے اب تک پندرہ سال گذر گئے یا پتہ نہیں کتنے ــــ"

"اتنے برس ــــ؟" وہ پوچھنے لگی ــــ "کہاں رہے؟"

"بھٹکتا پھرا ــــ" لمحہ بھر خاموشی رہی پھر وہ خود ہی کہنے لگا۔ "میں بھٹکنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے گم راہ کیا جاتا رہا ــــ ہمیشہ ــــ ہر دفعہ ــــ ایک ہی صورت میں ــــ مختلف روپ ــــ مختلف چہرے ــــ مگر صورتِ حال ــــ ایک جیسی ــــ ایک ہی طرح کی سی ــــ" وہ رک گیا کافی دیر بعد اس نے سوال کیا ــــ "میں قصر آباد جانا چاہتا ہوں ــــ مگر کوئی میرے ساتھ چلتا ہے ــــ نہ مجھے راہ بتاتا ہے ــــ کیوں راستہ نہیں بتاتے یہ لوگ؟"

"کیوں جانا چاہتے ہو ــــ کس لیے" رک کر بیگم نے بات بڑھائی

اس لیے کہ کوئی کسی پہ جبر کرتا ہے نہ سر کاٹتا ہے ــــ سب لوگ ــــ آپ کی طرح رہتے ہیں ــــ سکھ میں دکھ میں ــــ ایک ہیں ــــ مل کر کام کرتے ہیں بوجھ اٹھاتے ہیں ــــ پر کپڑے میلے نہیں ہوتے کسی کے ــــ کیا آپ کو پسند نہیں وہ؟ ــــ نہیں جانا آپ کو؟"

"تم جنت کی بات کرتے ہو شاید" وہ کہنے لگی

"نہیں ـــــ قصرآباد کی" ـــــ وہ مصر رہا ـــــ

"تو پھر کچھ دن انتظار کرو ـــــ" رک کر وہ بولی ـــــ "میں ہی پہنچاؤں گی تمہیں ـــــ تمہیں کسی نے سہارا نہیں دیا نا ـــــ میں تمہیں سہارا دوں گی ـــــ"

"سہارا تو مجھے بہت سوں نے دیا ـــــ" وہ کہنے لگا ـــــ

"پھر ـــــ؟"

"راستہ نہیں بتایا ـــــ بتایا تو چل کر نہیں دکھایا ـــــ روشنی نہیں دی ـــــ بس وعدے دیے ـــــ شاید سب کے پاس صرف وعدے تھے۔"

وہ اٹھی اور سنگھار میز کے آئینے کے ساتھ کھڑی ہو کر بولی ـــــ "تم اب جوان ہو کچھ مفادات ہیں تمہارے بھی ـــــ تمہیں زندہ رہنا ہے ـــــ رہنا چاہیئے" وہ خاموش رہ کر مسلسل اس کی طرف دیکھنے لگی ـــــ اور بولی "میری طرف دیکھو ـــــ اس آئینے کی طرف ـــــ"

اس نے آئینے میں اپنے آپ کو دوبارہ دیکھا تو وقار جمال نے کہا "شاید تمہیں معلوم ہی نہیں کہ تم کیا ہو ـــــ کتنے خوبصورت ہو ـــــ خوبصورت اور معصوم ـــــ"

"خوبصورت کیا ہوتا ہے؟" ـــــ وہ سادگی سے کہنے لگا ـــــ

"جو شے نظر کو اچھی لگے ـــــ اور دل میں اترنے لگے اسے ....."

"مجھے معلوم ہے" ـــــ وہ بات کاٹ کر بولا ـــــ

"کیسے ـــــ کیسے معلوم ہے تمہیں؟"

"میں کھانا کھاتا ہوں ـــــ تو ایسا ہی دکھائی دیتا ہوں ـــــ اور اس طرح کپڑے پہن لوں تو ـــــ"

بیگم وقار جمال نے پیار سے گال تھپتھپا کر اس کی بات کاٹ دی ـــــ "وہ کپڑے بہت ـــــ" وہ بولی

اس لیے تو چل رہے ہیں ہم ـــــ اٹھو ـــــ آؤ ـــــ"

"کہاں ـــــ؟ وہ تحیر سے بیگم وقار جمال کی طرف تکنے لگا۔

"کچھ شاپنگ کر لیں ـــــ" بیگم نے وضاحت کی ـــــ

"کیا؟ ـــــ" رک کر اس نے پوچھا ـــــ "یہ کیا شے ہوتی ہے؟"

"سب کچھ سیکھ جاؤ گے ـــــ سکھا دوں گی میں ـــــ ابھی تمہیں بہت بہوت تربیت کی ضرورت ہے اور قصر آباد پہنچنا ہو تو ـــــ" ادھوری بات چھوڑ کر وہ گاڑی میں بیٹھ گئی ـــــ وہ بھی بیٹھ گیا ـــــ

510

بوڑھے ملازم ـــــ اور ملازماؤں نے جاتے ہوئے ـــــ حسرت سے دونوں کو دیکھا۔

"قسمت ؟" ایک بولا ـــــ

"ہاں ـــــ قسمت !" دوسرا بڑبڑایا۔

دو گھنٹوں میں سارا بازار چھن کر رنگ رنگ کے ڈبوں میں بند ہوا اور پھر بیگم وقار جال کے بیڈ روم میں بکھر گیا۔

"صبح اٹھ کر تم گاؤن پہنا کرو گے" گاؤن بستر پہ پھیلا کر بیگم وقار نے کمرے میں گویا شوخ رنگ بکھیر رہے تھے۔

"پہنو ذرا" انھوں نے اس کے ڈھیلے ڈھالے ـــــ اور پرانے کپڑے ایک ایک کر کے اتارے ـــــ اور جلدی سے گاؤن اس پر ڈال دیا۔ اس ایک لمحے میں وہ خود بھی اپنے آپ سے شرما گیا تھا اور حیلے سے اس کے کانوں کی لویں لال انگارہ ہو گئی تھیں ـــــ مگر یہ سب کچھ اسقدر تیزی سے ہوا کہ دوسرا لمحہ شروع ہو گیا۔

"واہ" بیگم وقار نے انہی دو لمحوں کے درمیان یہ لفظ ادا کیا تھا ـــــ یہ معلوم کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ گاؤن پہننے سے پہلے انھوں نے آنکھوں میں اپنی ذات کی روشنی بھر کر "واہ" کہا تھا ـــــ یا گاؤن پہننے کے بعد ـــــ

ریشمی گاؤن پہن کر وہ خود بھی مسرور ہو گیا تھا دل میں ایک اجلاپن، ٹھنڈک اور آسودگی کا احساس جاگ اٹھا تھا نئے کپڑے کی باس ہی کچھ ایسی تھی یا بیگم وقار کا قرب تھا

"خوشبو کیسی ہے" وہ پوچھنے لگا۔

"ہر نئی شے میں ایک خوشبو ہوتی ہے" ـــــ وہ بولی ـــــ "تمہارے لیے یہ گاؤن ہی نہیں ـــــ یہ گھر ـــــ یہ ماحول ـــــ میں ـــــ ہر چیز نئی ہے" ـــــ

وہ کچھ سمجھا ـــــ کچھ نہ سمجھا تھا ـــــ مگر حیران ضرور تھا ـــــ تجربے کی ایک باریک پرت نے اسے حیران تو رکھا ہی تھا ـــــ گدگدا بھی دیا تھا اور تجسس کے مضراب نے تو اس

کے اندر تحیر سمو رہے تھے. بیگم وقار نے اس کے دن بھر کا شیڈول بنایا — اور مختلف لباس ترتیب سے سجا کر سمجھایا بھی ۔

ناشتے کی میز تک — ناشتے کے بعد — باہر جانے کے لیے — سہ پہر آرام کے لیے اور یہ رات کا لباس —

خوشیوں بھری حیرانی اور امید افزا نظروں میں اس نے ہر ہر منظر سمیٹ لیا — اور سوچا کہ شاید قصرِ آبادی یہی ہے — یہ خواب تو نہ تھا — مگر خوابوں کی طرح خمار تھا — مدھم سُر سیلا — اور رسیلا —

سوچنے کی صلاحیت ابھی سلب نہ ہوئی تھی سو اس نے سوچا کہ یہ خواب ہوتا تو اس کے رنگ اس قدر گاڑھے نہ ہوتے — یہ کیسا عجیب منظر تھا کہ سارے خزاں میں بسنت جیسی — بہار جیسی کٹھاس مٹھاس بن کر پوروں پر اتر رہی تھی پاؤں دبیز قالینوں میں دھنس رہے تھے — لگتا تھا ہونٹوں سے بنے ہوں — وہی نشہ جو چومنے سے پاؤں کو چڑھتا ہے — ہاں بالکل وہی —

وہ اسے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی

تنہا ہونے کے احساس نے اس میں خود مختاری کا جذبہ جگایا تو اس نے ایک ایک چیز کو گھور کر دیکھا. پھر انہیں چھوا — ان پر ہاتھ پھیرا اور پھر قد آدم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے گم سم رہ گیا ابھی تک وہ سات رنگوں والے ریشمی گاؤن میں تھا — شہزادہ سا — اسے خود پر پیار آنے لگا — اپنے آپ کو زیادہ روشن دیکھنے کی خواہش میں اس نے پردہ ہٹایا مگر کھڑکی نہ کھلی — پھر اپنا آپ دیکھنے کے بجائے باہر دیکھنے کی خواہش ابھری — اس نے دوسرا پردہ اٹھایا — مگر پردے کے پیچھے دیوار تھی. اس نے دوسری کھڑکی کے پردے کو ہٹایا. وہاں بھی دیوار تھی.

ایک ایک کر کے اس نے سب پردے ہٹائے مگر وہاں سب دیواریں تھیں.

ہر پردہ ہر کھڑکی — ہر دروازہ — دیوار تھی — صرف ایک دروازہ تھا جس سے کچھ دیر پہلے بیگم وقار باہر گئی تھی اس نے بڑھ کر اسے کھولنے کی کوشش کی — وہ بھی بند تھا — پہلے خوف نے جنم لیا پھر جوشش نے — اور اس نے بڑے جوش اور جذبے سے پہلے دستک دی پھر زور سے کھٹکھٹایا — اور اس کے بعد دھڑ

بیٹ ڈالا ــــ لگتا تھا یہ آسیب زدہ گھر ہے ــــ کسی نے کوئی نوٹس نہ لیا جواب میں گہری خاموشی اور دہلا دینے والا سناٹا کاٹنے کو آیا۔ 516

"دیوار کیوں ہے؟ ــــ دیواریں کیوں ہیں؟؟ ــــ" وہ چیخا تو اس کی آواز گھوم کر اس کے کانوں میں آئی اور پھر پہلے کا سا سناٹا۔ اسے گھٹن ہونے لگی ــــ اتنا سجا ہوا ــــ مسرور کرنے والا ماحول۔ اتنی ذرا سی بات میں اسے قبر کی طرح تنگ دکھائی دینے لگا۔

اس حالت میں آدمی صرف سانس لینے پر اکتفا کرتا ہے۔ لمبے لمبے سانس۔ اس نے اتنا کھینچ کھینچ کر سانس اپنے پھیپھڑوں میں بھرنا شروع کیے کہ سانسوں کی آواز سے سناٹا کسی قدر کم ہو گیا ــــ پلنگ پر پاؤں رکھ کر وہ اوپر جانا چاہتا تھا۔ مگر پاؤں فوم میں یوں دھنس گیا ــــ جیسے دلدل ہو۔

اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ لیٹ کر کروٹ بدل لے ــــ اور سو جائے یا کم از کم سونے کی کوشش کرے۔

سو وہ سو گیا۔

جب جاگا تو صبح قریب تھی۔

خالی ذہن کے ساتھ وہ اٹھا تو اسے محسوس ہوا کہ پچھلے بیس برسوں کے مقابلے میں وہ کتنا پرسکون سویا ہے جاگنے کے بعد، جو بوجھل پن، خوف، بے زاری اور ایک ٹیس کی کیفیت سے ملتی جلتی دکھن اس کا مقدر تھی۔ آج نہ تھی۔ آج تو وہ ہلکا اور تازہ ہو گیا تھا ــــ کیسا اجلاپن تھا کیسی تازگی تھی۔ نشے کی طرح، سرور کی مانند کہ اس کا وجود مہک رہا تھا۔

بستر سے اتر کر اس نے سامنے دیکھا ــــ قدِ آدم آئینہ تھا ــــ اور مقابل وہ۔ لمحہ بھر کو دانستہ ــــ عکس پر نگاہیں جمائے وہ کھڑا رہا ــــ کیسی رت بدلی تھی ــــ وہ اپنے آپ کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔

پھر اس نے گھڑی دیکھی جو مدت سے بند پڑی تھی ــــ صبح ہوئی تھی ــــ مگر سورج نہ تھا ــــ کرن تک نہ تھی روشنی کی اجالا اندھیرا ایک سے لگ رہے تھے اندر کی فضا میں ــــ

اسی ادھیڑ بُن میں زندگی کے قیمتی لمحات اڑتے چلے گئے۔ جب دروازہ کھلا۔ تو ملازم کھانے کو کچھ لایا تھا۔ حیرت سے اس نے سوچا ـــ کیسی تنظیم ہے ـــ اس وقت وہ جس شئے کی آرزو کر سکتا تھا ـــ وہی کھانے کے لیے رکھ دیا گیا تھا کیا بیگم وقار جمال دلوں کا بھید جانتی ہے ـــ؟ ایک پہر ـــ دو پہر ـــ سہ پہر ہر پہر دروازہ کھلتا اور اس کے لیے وہ سامان اندر رکھوا دیا جاتا جو اس کی خواہش کے مطابق ہو سکتا تھا ـــ پھر شام ہوئی ـــ اور پھر رات اس مرتبہ ـــ ہلکا کھانا آیا ـــ اس نے لانے والے ملازم سے وقت پوچھا ـــ

وہ چپ رہا ـــ

اس نے اصرار کیا ـــ "وقت بتاؤ مجھے؟" ملازم نہ بولا تو اس نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا اور کہا ـــ "رات ہے یا دن؟"

پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ یہاں کی ہر چیز کی طرح ملازم بھی گونگے ہیں چیزیں تو بولا نہیں کرتیں ـــ مگر زبان تو بولنے کے لیے ہوتی ہے ـــ اور جب زبانیں چپ ہوں ـــ تو خاموشی بولتی ہے ـــ مگر اس بولتی خاموشی میں جب اس کا دھیان آئینے کی طرف گیا تو وہ سب کچھ بھول کر آئینے کے سامنے آکھڑا ہوا ـــ اسے بار بار شک ہونے لگتا تھا کہ وہ ـــ وہ نہیں ہے جو اس آئینے کے سامنے کھڑا ہے وہ ـــ وہ بھی نہیں جو اس گاؤن میں لپٹا ہے ـــ جو اس ماحول میں سانس لے رہا ہے تو پھر وہ کیا ہے اس سوال کے جواب میں وہ اپنے آپ کو پہچان نہیں رہا تھا۔ مگر بیگم وقار نے اسے پہچان لیا تھا۔

دروازہ کھلا تو اسے اندازہ ہوگیا کہ گہرا اندھیرا زمین پر اتر آیا ہے ـــ پہلے ملازمہ ایر کلینر سے کمرے کی اصل بو باس مٹا گئی ـــ پھر دوسری آئی ـــ اور مشروبات اندر رکھ کر چلی گئی۔ پھر بیگم وقار جمال آئی ـــ اور اسے کھانے پینے کے آداب سمجھانے لگی ـــ خصوصاً پینے کے۔

پہلی بات تو یہ کہ وہ خود بیگم وقار جمال نہیں تھی تو پھر وہ کون تھی ـــ ایک الہڑ دوشیزہ تھی جس کے انگ انگ میں رنگ رنگ میں ایک سیماب بھرا تھا ـــ لمبے سیاہ ریشمی گاؤن ـــ پر کھلے دراز بالوں کا ایک حاشیہ تھا ـــ اور وہ بیگم کہاں تھی

جو اسے کمرے میں چھوڑ گئی تھی —— یہ کیسا روپ تھا کیسا بہروپ تھا؟ کہ وقار جہاں رات بھر میں بیس برس چھوٹی ہو کر —— اپنی اصل سے بھی کم بلکہ کم سن ہو گئی تھی —— آنکھیں تھیں کہ کاجل تھا پھیل کر اس کا احاطہ کر رہی تھیں —— اور ہونٹ گلاب اور شہد میں گندھے لگتے تھے ——

بغیر کچھ بولے —— وہ اٹھلاتی ہوئی آئی تھی —— شاید وہ پنجوں پر چل رہی تھی —— مشروبات میں سے کچھ لے کر اس نے دو جام بنائے —— اور ایک اسے دے دیا ——

یہ کیسا کسیلا پن تھا —— وہ واقف نہ تھا —— نیا سا ذائقہ تھا —— اور نیا ہی سرور —— یوں تو یہاں کی ہر ہر تصویر —— اس کے لیے نئی تھی —— مگر یہ تو کچھ اور ہی تھا جس نے پچھلے تمام منظروں کو بھلا دیا تھا —— یاد تھا تو صرف ایک —— موجودہ —— سانس لیتا جیتا جاگتا —— منظر۔ اسے لگا —— کہ وہ مشروب نہیں —— اعتماد پی رہا ہے کچھ دیر پہلے بیگم وقار جہاں کے احکام کے سامنے اس کی کیا مجال تھی —— کچھ کہے —— یا انکار کا خیال کرے —— یا —— "بس" کہہ دے —— اس وقت وہ اس کے لیے صرف محسن تھی —— اور کانٹوں بھری زندگی —— اور ریت بھری آنکھوں میں ٹھنڈک بن کر اتر رہی تھی۔ وہ اس کے لیے اب تک مؤدب تھا —— مگر ان چند ساعتوں میں سارا تانا بانا بکھر گیا تھا نہ یہ وہ تھا —— نہ —— وہ یہ ——

"ایک اور ——" وہ بولی ——

"نہیں" ایگو کہاں سے آ گئی تھی —— انکار ابل رہا تھا ——

"پلیز" معنی اسے نہ آتے تھے —— مگر بیگم وقار جہاں کے انداز کے معنی اس لیے صاف تھے کہ محبت اور جنس کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔

اس انداز نے اسے گلاس اٹھانے پر مجبور کر دیا ——

ساری بو —— ساری تلخی۔ آنکھوں میں اترنے والے نشے نے پہلے ہی کم کر دی تھی اس گلاس کے اترتے ہی ختم ہو گئی —— اب —— ہر طرف ایک مہک تھی —— ایک سی مہک —— اور وہ تھا ——

اب وہ کچھ بھی دکھائی دے رہا تھا — جو پہلے نظر نہ آیا تھا — مگر پہلی چیزیں چھپ گئی تھیں۔ بیگم وقار جمال اس کے لیے آندھی کی طرح امنڈ رہی تھی — وہ خود ابل رہا تھا۔ وہ بے حد حسین تھی اس وقت — اس کی آنکھیں خمار سے بوجھل ہو کر نیلی ہو گئی تھیں یا ایسے دکھائی دے رہی تھیں — نائٹی گاؤن اتار کر بیگم نے کھونٹی پر لٹکا دیا تھا عام حالت میں شاید اس کے اوسان خطا ہو جاتے — یا دل زور زور سے دھڑکتا یا پھر ڈوب جاتا — یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ وحشت زدہ ہو کر بھاگ نکلتا مگر اس وقت کیا تھا — سب کچھ سلب ہو گیا تھا — سوچنے کی مہلت تھی نہ صلاحیت پاؤں من من کے ہو رہے تھے — پور پور گدگدا رہی تھی — وہ اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھنے لگا —

یہی وہ لمحہ تھا — جس کے انتظار میں بیگم وقار جمال دیوان پر لیٹی سلگتا — سگرٹ بنی تھی —

اور پھر ستار کے سُروں پر پہلے الاپ ہوا پھر مدھیہ — اور پھر دُرت۔

تیز ہوا چلنے کی پرشور آوازوں کے بعد بادل گرجے — اور پھر بجلی کڑکی اور کسی درخت پر گری — سب کچھ راکھ ہو گیا — خاموشی آہستہ آہستہ خون میں کیسے سرایت کرتی ہے — یہ وہ لمحہ تھا — یا پھر جیسے سمندر کی تیز لہر واپس چلی جانے کے بعد ریت پر ننھی ننھی لہروں کی تصویریں بُن دیتی ہے — کہ ہاتھ لگاؤ — تو سب اوجھل ہو جاتا ہے —

نیند ایک چادر کی طرح تنی تھی — اور پھر دونوں یوں نیند میں گھل مل گئے جیسے پانی ریت میں جذب ہو جاتا ہے۔

وہ جاگا — تو رات کا پچھلا پہر تھا — گہرے سناٹے میں کتنے رو رہے تھے — اور ایک گہری تھکن اور پژمردگی اس سے لپٹ کر سو رہی تھی — جونہی اس کی نگاہ بیگم وقار جمال پر پڑی تو اسے اپنے اندر کی تھکاوٹ دور ہوتی ہوئی محسوس ہوئی — کروٹ بدلتے ہی اس کے اندر ساری حرارت عود کر آگئی جیسے کوندا سا لپک جائے۔ اس نے منہ پھیر لیا مگر سامنے آئینہ تھا —

اور وہ دونوں تیز روشنی میں نہا رہے تھے —

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا ـــــ غنودگی آہستہ آہستہ گم ہونے لگی اور آنکھوں کا بوجھل پن کم ہو کر ختم ہو گیا ـــــ ! اسے ایک مرتبہ خیال آیا ـــــ کہ وہ جا سکتا ہے ـــــ بھاگ سکتا ہے ـــــ بھاگنے کے خیال کے ساتھ اسے کچھ خوف محسوس ہوا اس نے مڑ کر بیگم وقار جمال کی طرف دیکھا وہ جاگ رہی تھی ـــــ ! جاگ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی ـــــ دونوں میں سے کسی نے کچھ نہ کہا ـــــ وہ انگڑائی لے کر اٹھی تھی ـــــ یہی اس کی زبان تھی ـــــ اس کے چہرے پر خوف کی گہری پرچھائیاں تھیں یہ اس کی زبان تھی ـــــ دونوں ایک دوسرے کا مفہوم سمجھتے تھے مگر خاموش تھے۔ بیگم وقار جمال نے دو ایک گلاس پیئے ـــــ تو اس کا جسم تھکن کے بجائے حدّت بن گیا ـــــ وہ تن کر کھڑی ہو گئی ـــــ اس نے بچا ہوا گلاس یوسف کے ہونٹوں سے اس محبت اور اس سپردگی سے لگا دیا جیسے چڑیا کے ننھے بچے کو چلّو سے پانی پلا رہی ہو وہ پی گیا ـــــ تو اس کا خوف ختم ہو گیا ـــــ شاید اسی لیے وقار جمال نے اسے اس طرح اچک لیا تھا جیسے چیل ننھے چوزے کو اچکتی ہے ـــــ یہ چوزہ ذرا اسی دیر میں دوبارہ وحشی بن کر کھڑا تھا ـــــ اور پھر ایک وحشت دوسری وحشت میں یوں حل ہو گئی جیسے پانی کے گلاس میں سیاہی کی اک بوند ـــــ تھوڑی دیر میں سارا پانی نیلا ہونے لگا ـــــ سانس کی ملناہیں کتنی مرتبہ ٹوٹیں ـــــ ٹوٹیں ـــــ شریانوں میں جیتا لہو ـــــ ابلتا ہوا لاکھوں کروڑوں دائرے بنتا ـــــ بگاڑتا بوڑھے بیمار خون میں اتر گیا ـــــ نشہ پور پور سے رس بن کر ٹپک گیا۔ وحشت کم ہونے لگی ـــــ ہانپنا بند ہوا ـــــ تو مردنی اور پھر گہری نیند نے انہیں ـــــ لپیٹ لیا ـــــ

صبح ـــــ وہ جاگا تو اکیلا تھا ـــــ کچھ دیر بعد وقار جمال اسے جگانے کے لیے آئی تو وہ بے سدھ ہو گیا ـــــ وقار جمال نے اسے پکارا تو اسے شدید دکھ ہوا ـــــ ایسی رات گذر جانے کا نہیں ـــــ بیٹا کہہ کر پکارنے کا ـــــ اس کے لیے یہ بات صدمے سے کم نہ تھی ـــــ دبے لفظوں میں اس نے وقار جمال سے احتجاج کرنے کی کوشش کی مگر وہ مسکرا دی۔

"عادت بننے سے پہلے کچھ چیزیں ـــــ صدمے اور دکھ کا باعث ہوا کرتی ہیں"
وہ لمحہ بھر اس انتظار میں رہی ـــــ کہ یوسف کچھ بولے گا ـــــ مگر وہ خاموش

517

رہا —— وقار جمال کہنے لگی —— "تم نیک ہو —— اس قدر —— کہ آئندہ کا سارا انحصار تمہی پر ہے —— تم نئی نسل کے نمائندہ ہو —— ہونا ——"
یوسف کے پلے کچھ نہیں پڑا تو وہ بولی —— "—— اٹھو —— کچھ کھالو ——"
"یہ کب سے ہو رہا ہے ؟" چائے میں چینی ہلاتے ہوئے یوسف نے لب کھولے۔
"ازل سے ——" رک کر اس نے کہا —— "ازل سے یہی ہوتا رہا ہے ——"
یوں لگتا تھا وقار جمال کے دل و دماغ میں پہلے سے ہر سوال —— ہر جواب ترتیب سے ڈھلا ڈھلایا موجود ہے —— وہ چپ رہا —— چائے کے آخری گھونٹ تک —— خوف اور وسوسے اس کے ذہن پر سنپولیوں کی طرح لہراتے رہے —— مگر کھانے کا ایک الگ نشہ ہے —— آنکھیں خمار سے بھر بھی جائیں تو روشن ہو جاتی ہیں ——
ہونٹ کاٹتے ہوئے وقار جمال یوسف پر جھک گئی "تم بہت ڈیسنٹ ہو"
"وہ کیا ہوتا ہے ؟" کاش وہ جاہل نہ ہوتا۔
"تم لاکھوں میں ایک ہو —— زرخیز —— اور صبار فتار ——" رک کر وہ پھر بولی —— "شاداب اور شگفتہ —— تازہ اور شبنم آلود ——"
"میں کچھ نہیں سمجھا ——" وہ ممیایا ——
"میرا نام لو —— وقار کہو یا پھر جمال کہو مجھے ——" لمحہ بھر کو وہ گنگنائی —— پھر کہنے لگی —— "وہ تمہاری آبیاری، تمہاری تہذیب ہو جائے —— تو تم —— دنیا بھر کی ذمہ داریاں سنبھال سکتے ہو ——"
"جی ——؟" وہ اتنا احمق تو نہیں تھا —— مگر لگ رہا تھا۔
"تمہارا نام جیکی ہے —— یہ مت سمجھو کہ یہ صرف کتوں کا نام ہے —— بس یہ مجھے پسند ہے"
"مگر ——" یوسف نے بولنے کے لیے لب ہلائے وقار جمال نے موقع نہ دیا۔
"سب کچھ سمجھا دوں گی" وہ بولتی چلی جارہی تھی "یہ باتیں کتابوں میں ہوتیں ——

518

تو تم پڑھ چکے ہوتے ۔"

"میں تو ان پڑھ ہوں" اس نے پھر کوشش کی بولنے کی ۔

"تجربہ کتابوں سے الگ علم ہے" ، خاموشی کے وقفے میں وقار جمال نے اس کے چہرے کو پڑھنا چاہا تھا ــــــ

"اٹھو ــــ اور تیار ہو جاؤ ــــ" شاید اس نے پڑھ لیا تھا ــــ کہنے کو ایک برس گذرا تھا ــــ مگر قیامت گذر گئی تھی ۔ ــــ وہ سب کچھ بھول گیا تھا ۔

قصر آباد ــــ اس کا راستہ ــــ منزل ــــ مقصد ــــ ازل ــــ ابد ــــ حتیٰ کہ وہ کن راستوں پہ چلا ــــ اور کیسے یہاں پہنچا ــــ کچھ یاد نہ تھا اُسے ۔

پھر نادرہ آگئی ــــ وہ چالیس سے اوپر تھی یا نیچے ــــ کوئی مجان نہ سکتا تھا ۔ لگتا تھا ابھی ــــ سولہ چہرے لگے ــــ بہت سنبھال کر رکھا تھا اس نے اپنے آپ کو ۔

میک اپ کی تہہ اتار دی جائے تو چہرہ چغلی کھانے لگتا ہے ــــ جونہی اس نے خاموشی کی چادر ہٹا کر ذات کو باہر نکالا ــــ تو وہ اسے وقار جمال ہی لگی ــــ شروع میں وہ تنہائی کا رونا روتی رہی ــــ اور یوسف کو مسلسل تکے گئی ۔ اور جب وہ ذرا کی ذرا اٹھ کر دالان میں گیا تو سارے موضوعات کو روک کر اسی نے جھٹ سے وقار جمال سے پوچھا ــــ "یہ کون ہے ؟"

"بیٹا ــــ"

"اچھا" کہہ کر نادرہ دیر تک ہنستی رہی ــــ حتیٰ کہ یوسف آگیا ــــ وہ اُسے محض دیکھ رہی تھی ــــ یا شاید تول رہی تھی ــــ

"میرے ہاں تم لوگ کب آؤ گے ــــ؟"

"بھجوا دوں ؟" وقار جمال کا کیسا جواب تھا ــــ وہ تو بولی کی آخری حد پہلی جست میں پھلانگ گئی تھی ــــ نادرہ کو اس کی توقع نہ تھی ــــ اس کی پوریں دوہری ہو ہو گئیں ــــ وہ لرز گئی تھی ــــ دل پھڑک سا گیا تھا ابھی یوسف میں بڑا حسن تھا ــــ مگر وقار جمال کا جواب ایسا تھا جیسے وہ اس سے اکتا گئی ہو ــــ حالانکہ اکتانے کی کوئی وجہ

نظر نہ آئی تھی ۔ اپنی بے چینی چھپاتے اور سینے میں اٹھنے والے طوفان کو اندر ہی اندر جذب کرتے ہوئے اس نے لاپروائی سے کہا۔ "وہ تم جانو بھی ——— میری تنہائی کو چوکیدار تک بھاگ گیا میرا ———"

519

وقار جمال نے بات کو سنا ان سنا کر دیا اور یوسف کے قریب آ کر اسے کہا "جیکی ——— باجی کے ساتھ چلے جاؤ ———"

وہ نہیں سمجھا تھا ——— کہ باجی کا لفظ اس کے لیے ہے یا وقار جمال نے نادرہ کو باجی کہا ہے نہ ہی اس نے مزید اس پر سوچا ——— فوراً مان گیا ——— کہ یکسانیت ——— اکتاہٹ کا دوسرا نام ہے ——— لذت ہی کے لمحات کیوں نہ ہوں طویل ہو جائیں ——— تو عذاب ——— ہوتے ہیں ...... ——— یہ تو پھر جبر تھا نادرہ اسے لے آئی تھی ———

مکمل قبضہ اسی کا تھا ——— مگر چند روز جیکی بھائی خوب چلا ——— پھر ایک شام جیکی چندا ہوا اور ایک رات جیکی جان ہو گیا ——— اور رات معمول کے مطابق گذر گئی پہلے پہل اسے لگا کہ نادرہ وقار جمال سے زیادہ مخلص ہے ——— مگر شروع میں تو وقار جمال بھی اسی طرح کی تھی ——— ہر نیا ذائقہ شروع میں اچھا لگتا ہے۔ پھر اس میں کچھ کمی ہونے لگتی ہے ——— حتیٰ کہ لذتیں ختم ہونے لگتی ہیں ——— اور روٹین شروع ہو جاتی ہے۔ ہر جذبے کو ——— اچھا ہو یا بُرا ——— یہیں سے زوال آتا ہے ——— یہاں تو دونوں طرف ایک ہی طرح کا شکوہ تھا۔

تجربات، نیا شعور بھی تو بیدار کرتے ہیں ——— یوسف ——— اڑتی چڑیا کے پر نہ سہی پر تلذذ اور خلوص میں فرق کرنے لگا تھا ——— لہٰذا برس بعد ہی وہ واپس چلا آیا ——— یا شاید بھجوا دیا گیا ——— مانگے کے اجالے کی طرح ———

اگلا برس کچھ وقار جمال کے ہاں گذرا ——— کچھ اس کے دوستوں، مہربانوں کے ہاں ——— کتنے لوگ تھے ——— کوئی دوست بنا کر لے گیا ——— کوئی کزن ——— کوئی بھائی اور کوئی بیٹا ——— مگر لکا وہ وقار جمال کے ہاں ہی۔

یوسف کے نزدیک سبھی عورتیں تھیں ——— سب کا روپ الگ تھا ——— ذائقہ الگ تھا۔ وقار جمال سے الگ ——— آپس میں وہ سب ایک طرح کی تھیں ———

وقار جمال سب سے زیادہ غائب تھی — جابر بھی تھی — مگر پسند بھی وہی آئی۔ آزاد پھرنے کی خواہش اس کے اندر دم توڑ چکی تھی — جبر کا عادی انسان — آزاد ہونے سے مرجاتا ہے — شاید اس لیے کہ وہ ایک لاش ہوتا ہے۔

یوں بھی وقار جمال عورت نہ تھی — کتا مکھی تھی — بال بال سے رنگ اور مچے مچے سے رس نچوڑ لیتی تھی۔

برس اس کے ہاں اڑ کر گزرتا تھا جبکہ دوسروں کے ہاں — دن رینگتے تھے۔ اس عرصے میں کتنا خون بنا — اور مردہ ہوا — یہ حساب کون کر سکتا ہے وقار جمال کے بدن پر چکنائی کی جو تہہ چڑھ گئی تھی — اس سے اندازہ ضرور ہو سکتا تھا۔ اس کی تمکنت اور تازگی ہر پل بڑھتی جا رہی تھی — خوبصورتی جسم میں ہوتی ہے یا چال میں — یوسف کو اندازہ تھا بھی — اور نہیں بھی — ان ساری آسائشوں کے بیچ وہ اکثر سوچتا — کہ قصر آباد جانا کبھی ممکن نہ ہوگا۔ ایک کسک اندر ہی اندر — البتہ سلگتی اور اسے سلگائے رہی۔

شروع میں رات بھر کی حرارت نشہ بن کر اس خیال کو مسترد کرتی رہی مگر جب یہی حرارت نشہ کم اور مشقت زیادہ بننے لگی تو اسے قصر آباد کا خیال آنے لگا اور یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ نڈھال ہو رہا ہے — یا پھر تھک گیا ہے اکتاہٹ بھی ہو سکتی تھی اور شاید تھی بھی کہ یوسف نے اس کے بڑے روپ دیکھے تھے۔

آسائشیں تھیں — زندگی تھی — مگر معمول — بے مزہ بھی ہوتا ہے اور بوجھ بھی۔

ساری پرتیں ساری تہیں ایک ایک کر کے کھل گئیں — باقی نہ بچا کچھ۔

"اب کس کا انتظار کیا جائے" اس نے اپنے آپ سے پوچھا — "اور کیوں"

اسی لمحے زرینہ بیگم آ دھمکیں — تیس پینتیس کے پیٹے میں تھیں — ہم عمر تھیں — اس لیے لپٹ کر ملیں اچھی بات یہ تھی کہ جیجی نہ کہا — یوسف کہا۔

یہ پہلی شخصیت تھی — جس نے اس سے کسی قسم کا رشتہ قائم نہ کیا تھا۔ اپنی تنہائی الاپی تھی — نہ مدد چاہی تھی نہ اسے گھورا تھا — وہ مریض بھی نظر نہ آئی تھی۔ — وہ اس سارے کھیل میں برابر کی حصے دار بننا چاہتی تھی جیسے محبت

یا اس جیسے کسی جذبے میں ہوتا ہے —— بڑی بے تکلفی سے وہ یوسف سے گھل مل گئی تھی —— اور وقار جمال کے واپس آنے سے پہلے یوسف کو اپنے ساتھ چلنے پر رضامند بھی کر لیا تھا۔

521

وقار جمال آئی —— اسے زرینہ پر ذرا بھی اعتراض نہ تھا۔

یوسف کو یہ توقع تھی ہی نہیں —— اس کا خیال تھا وقار جمال اس سے لمحہ بھر دور نہ رہ سکے گی۔ نہ اجازت دے گی خواہ وہ زرینہ کے ساتھ جانے پر رضامندی کا اعلان ہی کر دے۔

اس نے نگاہ اٹھا کر سامنے دیکھا —— آئینے نے کبھی جھوٹ کہا تھا جو اب کہے —— وہ آئینے میں صرف ایک سجی دکان کی طرح نظر آتا تھا —— وہ دکان جو لٹ جانے کے بعد بچی کھچی اشیا سے سجائی جائے —— خریدار اب اس کا فرنیچر —— بلب، اور دوسری چیزیں خریدنے کے منتظر تھے جو بھری دکان میں کبھی نہ بکتیں۔ نہ بیچی جاتیں

جب ذہن کام کرنے لگے، اور پچھتاوے ڈسنے کے لیے منہ کھولیں تو پاؤں اندر ہی اندر دھنستے ہوئے —— ریت کی دلدل میں اترنے لگتے ہیں —— نیچے —— اور نیچے ——

کیا وہ بھاگ سکتا ہے؟ —— یہ سوال آئینے سے نہ تھا —— اپنے آپ سے تھا۔ اسی سوال کی حدت سے پہلے من من بھر کے پاؤں ڈولے —— پھر ٹانگیں لرزیں۔ اور آخر میں تنفس تیز ہونے لگا —— وہ ہلا —— لڑکھڑایا —— چلا —— اور پھر بھاگنے لگا۔ فاصلہ تو طے ہوا پر زمانے بیت گئے —— وہ بھاگتا چلا گیا حتیٰ کہ وہیں آ گیا —— جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

یہ اب گھنا جنگل تھا۔ پگڈنڈیاں کانٹوں سے اٹی تھیں —— راستے مسدود تھے دن —— دن نہ تھا —— میلے کالے دھوئیں کی طرح تھا۔ قصر آباد کے راستے کی طرف تیر —— کا نشان دکھانے والا بورڈ پہلے پہل اس نے یہیں دیکھا تھا —— مگر حیرت یہ تھی کہ اب ہر درخت —— ہر شجر پہ ہر کسی نے اپنا بورڈ آویزاں کر رکھا تھا ہر ایک کی اپنی سمت تھی اپنا رخ تھا ہر شجر پر کیل گاڑھنے کے نشانات تھے مگر

بورڈ تھا تو نشان نہ تھا ——— اور نشان تھا تو بورڈ گر چکا تھا۔ جو بچے تھے وہ مختلف سمتوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ صحیح رُخ کا تعین ممکن نہ تھا ——— اور اگر تھا ——— تو کوئی متفق نہ تھا۔ لوگ اب تک ——— استنے زمانے بعد بھی کولھو کے بیل بنے تھے۔

وہ بھی چلنے لگا ——— بغیر سوچے ——— بغیر تعین کیے ——— اسے پورا یقین تھا کہ جنگل کی دوسری جانب قصر آباد یا اس کا راستہ ضرور ہے ——— یا کوئی ایسی فضا ہے جو اسے زندگی واپس دے سکتی ہے ——— یا جس پر وہ زندگی قربان کر سکتا ہے۔

فاصلہ بھی زیادہ نہ تھا ——— یہی بات تسلی کے لیے کافی تھی ——— اس کی چال میں تیزی آگئی ——— پھر اس نے بھاگنے کی کوشش کی ——— محض کوشش ——— پاؤں کانٹوں سے لہو لہو ہو گئے ——— ہر پگڈنڈی ——— ہر راستہ کسی بے برگ و گیاہ درخت نے روک رکھا تھا ٹکراتے ٹکراتے اس کا ماتھا چھل چھل گیا ——— لہو پیشانی سے رستا ہوا پہلے گردن تک آیا ——— پھر پیٹ پر چلتا ہوا رانوں پر بہہ گیا۔

وہ چلتا رہا ——— چلنے کی کوشش کرتا رہا ——— مگر ——— ہمت اب ٹوٹ رہی تھی یہ کیسا dead no man ——— تھا ——— کہ پیچھے آگ تھی ——— سامنے جنگل ——— اور دائیں بائیں تاریکی اور کانٹے تھے ——— اور ہوا مسموم۔

زچ ہو کر وہ پاؤں کے بل بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ مگر سوچنے کو کچھ نہ بچا تھا۔ گومگو اور کنفیوژن میں رات اتر آئی تھی اور آہستہ آہستہ ———

اندھیرے اور خستگی نے اسے اپنے اندر جذب کر لیا تھا۔

سرد ہوا چلی اور خون منجمد کر گئی ——— پھر بے بسی کی نئی تہہ اتری اور اسے بے سُدھ بنا گئی ——— اس نے تاروں بھرے تاریک آسمان کی طرف دیکھا اور دعا مانگی "اے خدا مجھے روشنی دے ——— مجھے راستہ دے ———"

پھر ایک گونج سنائی دی ——— پھر پتوں کے چرمر ہونے کی آواز پھر جیسے لاکھوں کروڑوں مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں ——— اس نے بند آنکھوں کو کھولا ——— سامنے کون تھا ——— جو جنگل کے رکھوالے کی طرح اچانک سامنے آیا تھا۔

اس نے دیکھا وہ اسے شک بھری نظروں سے گھور رہا ہے شک سے یقین تک آنے کے ——— جب اس رکھوالے نے ماچس جلائی تو یوسف نے دیکھا

اس کے ہاتھ میں نیزہ ہے جس کا پھل تو جلنے والی بجلی کے کوندے میں چم چم کر کے بجھ گیا تھا ـــ مگر رخ یوسف ہی کی طرف تھا۔ ہولے ہولے۔ بہت آہستہ۔ گھڑی کی ٹک ٹک ـــ ٹک ٹک کی طرح۔

وہ لمحہ لمحہ آگے ـــ اس کی طرف بڑھا ـــ نیزے کی انی اس کے قریب آتی گئی حتی کہ دل سے ذرا اوپر آکر ٹک گئی ـــ

اس ساری صورت حال کے دوران میں یوسف نے پوری قوت سے ہا... چلانے کی کوشش کی ـــ مگر وہ ہل بھی نہ سکا۔ پاؤں ـــ بلکہ سارا جسم شل ہو چکا تھا انی ذرا سی کھبی ـــ تو اس کے حلق سے پوری شدت سے چیخ بلند ہوئی ـــ ... چیخ تھی ـــ کرب اور دکھ میں ڈوبی ہوئی ـــ مگر بے آواز ـــ ہوا کا ایک غبارہ سا سانس کے ساتھ باہر کی طرف بہہ گیا تھا اور بس!

اس نے پاؤں اٹھانے کی ایک کوشش اور کی ـــ اسے لگا وہ دلدل میں دھنس رہا ہے ـــ باہر کے بجائے اندر جا رہا ہے ـــ زنجیر نہ تھی ـــ مگر محسوس یہی ہوتا تھا کہ وہ جکڑ دیا گیا ہے اور نیزہ ـــ آہستہ آہستہ ـــ ہر آن ـــ ہر پل ـــ دل کی ہر ہر شریان کاٹتا چلا جا رہا ہے ـــ "اسے مر جانا چاہیئے تھا ـــ"

ابھی سوچنے کی قوت موجود تھی ـــ مگر ـــ میدان حشر کی خصوصیت تو یہی ہے کہ سزا کتنی بھی اذیت ناک ہو موت نہ آئے گی ـــ ہر ذی روح کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جینا ہوگا۔

خون کا کوئی ذرہ ـــ کوئی خلیہ ـــ اور اسے جذب کرنے والی کوئی شریان باقی نہ بچی تھی ـــ مگر ـــ وہ زندہ تھا ـــ شاید اس سے بڑی سزا ایجاد نہ ہو سکی تھی۔

تحریر : گیبرئیل گارسیا مارکیز
ترجمہ :۔ الطاف احمد قریشی

لاطینی امریکہ کی تنہائی

فلورنس کے جہازراں انتونیو پگافیتا نے، جو دُنیا کے گرد پہلے سفر پر میگیلان کے ہمراہ تھا امریکہ کے جنوبی علاقوں کی سیاحت کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ بالکل صحیح تھا تاہم وہ کسی خواب وخیال کی سرزمین کا حال معلوم ہوتا ہے۔

اپنے اس سفر نامہ میں اس نے لکھا ہے کہ یہاں اس نے ایسے سؤر دیکھے جن کی ناف ان کے پُٹھے پر تھی۔ بغیر پنجوں والے ایسے پرندے بھی دیکھے جن کی مادہ اپنے نر کی پیٹھ پر انڈے دیتی تھی، بے زبان پیلی کن سے ملتے جلتے پرندے دیکھے جن کی چونچیں چمچوں جیسی تھیں۔ اس نے لکھا کہ اس نے وہاں ایسے عجیب الخلقت جاندار دیکھے جن کے سر اور کان خچر کے، جسم اونٹ کا، ٹانگیں ہرن کی اور منمناہٹ گھوڑے جیسی تھی۔ اس نے بتایا کہ کس طرح پیٹاگونیا میں ایک مقامی آدمی کو جس سے ان کی مڈبھیڑ سب سے پہلے ہوئی تھی آئینہ دکھایا گیا تو وہ دیو آسا جنگجو انسان اپنے ہی عکس سے خوفزدہ ہوگیا اور اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا۔

یہ مختصر اور دلچسپ کتاب جس کے مندرجات میں ہمیں اپنے آج کے ناولوں کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں، ہماری زندگی کی حقیقت کے بارے میں اس زمانے میں لکھی ہوئی سب سے زیادہ حیران کن تحریر نہیں ہے۔

جرائرغرب الہند کے وقائع نگاروں نے ایسی لاتعداد تحریریں چھوڑی ہیں۔ ال ڈوراڈو ہماری غیر حقیقی تصوراتی اور مشہور سرزمین پہلے متعدد نقشوں پر ظاہر ہوئی۔ اس کا مقام اور

ہئیت یا شکل وصورت ہر نقشہ ساز کے اپنے تصوّر کے مطابق تبدیل ہوتی رہی۔ اساطیری الور نونیز کابیزسے ڈے وا کا نے " دائمی جوانی کے چشمہ " کی تلاش میں آٹھ سال تک میکسیکو کے شمال کو ایک فریب خوردہ مہم میں کھنگال ڈالا جس کے دوران مہم کے ارکان ایک دوسرے کو کھانے پر مجبور ہوئے اور چھ سو میں سے صرف پانچ افراد زندہ سلامت واپس آئے۔

اس زمانے کے کئی سربستہ رازوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ گیارہ ہزار خچر جن میں سے ہر ایک پر ایک سو پونڈ سونا لدا ہوا تھا، ایک روز اٹاہولپا کا خراج ادا کرنے کے لیے سوز کو سے روانہ ہوئے اور اپنی منزل پر کبھی نہ پہنچے۔ بعد ازاں نو آبادیاتی زمانے میں کارٹیجینا ڈے انڈیا میں ایسی مرغیاں بیچی گئیں جو سیلابی زمین پر پالی گئی تھیں اور جن کے سنگدانوں میں چھوٹے چھوٹے سونے کے ٹکڑے ہوتے تھے۔

ہمارے آباؤ اجداد کی ہوسِ زر کچھ عرصہ پہلے تک بھی ہم پر سوار تھی۔ پچھلی صدی میں ایک جرمن مشن نے جسے اٹلانٹک پانامہ کے پار ریلوے لائن بچھانے کے لیے مطالعاتی کام مکمل کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا، یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس منصوبے کو ایک شرط پر مکمل کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پٹریاں لوہے کی نہیں بلکہ سونے کی تیار کی جائیں کیونکہ اس علاقے میں لوہا کمیاب ہے۔

ہسپانوی تسلط سے ہماری آزادی نے بھی ہمیں اس پاگل پن سے چھٹکارا نہیں دلایا۔ جنرل انتونیو لوپیز ڈو سنتا نا نے جو تین مرتبہ میکسیکو کا ڈکٹیٹر رہا، اپنی داہنی ٹانگ کی تدفین کے لیے شاندار تقریب منعقد کی جو نام نہاد پیسٹریوں کی جنگ میں ضائع ہو گئی تھی۔ جنرل گیبرئیل گارشیا مورینو نے سولہ برس تک بادشاہِ مطلق کی حیثیت سے ایکویڈور پر حکومت کی۔ جب وہ مرا تو اس کے لیے رت جگا ہوا جس میں اس کی لاش کو صدارتی کرسی پر بٹھایا گیا اور مکمل وردی پہنا کر تمغے سجائے گئے۔

ال سلویڈور کے مطلق العنان اور جابر حکمران جنرل میکسیمیلیانو ہرنانڈ ے مارٹینے روحانیات

کا عالم تھا۔ اس نے ایک ہولناک قتلِ عام میں تیس ہزار کسانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ اس نے اپنے کھانے میں زہر کا پتہ چلانے کے لیے ایک پنڈولم ایجاد کیا تھا اور خسرہ کی وبا کے تدارک کے لیے سٹریٹ لیمپوں کو سُرخ کاغذ میں لپیٹ دیا تھا۔ جنرل فرانسسکو موراژان کا مجسمہ جو ٹیگوسیگالپا کے بڑے چوک میں نصب کیا گیا تھا، درحقیقت مارشل نائے کا ہے جو پیرس کے ایک کباڑ خانے سے خریدا گیا تھا۔

گیارہ برس پہلے ہمارے وقت کے ممتاز شاعر چلّی کے پابلو نرودا نے آج ہی طرح کے اجتماع کو اپنے خطاب سے نوازا تھا۔ اس وقت سے اب تک خیر اندیش یورپی اور بعض اوقات بداندیش بھی لاطینی امریکہ کے ہیبت ناک واقعات سے انگشت بدنداں ہیں اور اس سرزمین کے آسیب زدہ اور تاریخ ساز واقعات پر حیرت کرتے ہیں جن کی لازوال سرکشی، داستانی پیکروں میں تحلیل ہو گئی ہے۔

ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی چین میسر نہیں آیا۔ پرومیتھس سے مشابہ ہمارا ایک صدر اپنے جلتے ہوئے محل میں محصور ہو کر اکیلا ایک پوری فوج سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ ہمارے دو رہنما ہوائی جہازوں کے مشکوک حادثوں میں ہلاک ہوئے جن کا راز ابھی تک نہیں کھُلا۔ ان میں سے ایک میں ایک بہادر صدر کی جان گئی اور دوسرے میں ایک اور بڑے دل گردے والے صدر، جمہوریت پسند سپاہی کی جس نے لوگوں کے وقار کو بحال کیا تھا۔

ہمارے ہاں پانچ جنگیں اور سترہ فوجی بغاوتیں ہوئیں۔ پھر ہمارے ہاں ایک شیطانی ڈکٹیٹر اُبھرا جو لاطینی امریکہ میں پہلی بار خدا کے نام پر نسل کشی کے لیے قتلِ عام کر رہا ہے۔ دریں اثنا لاطینی امریکہ کے دو کروڑ بچے ایک سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی مر گئے۔ یہ تعداد یورپ میں ۱۹۷۰ء سے اب تک پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ جبر و تشدد کی وجہ سے جو لوگ لاپتہ ہو چکے ہیں ان کی تعداد تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار ہے۔ متعدد خواتین کو اس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ حاملہ تھیں اور اُنھوں نے ارجنٹائن کی جیلوں میں بچوں کو جنم دیا۔ کوئی شخص ان بچوں کے بارے میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں گئے۔ اُنہیں فوجی حکام کے احکامات پر یتیم خانوں میں بھیج دیا گیا یا اُنھیں چوری

چھپے متبنّیٰ بنالیا گیا۔

اس پورے برّاعظم میں تقریباً دو لاکھ مردوں اور عورتوں کو صرف اس لیے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا کہ اُنھوں نے صورتحال کو تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔ صرف مرکزی امریکہ کے تین چھوٹے بدقسمت ملکوں نکاراگوا، ال سلواڈور اور گوئٹے مالا میں ایک لاکھ سے زائد مرد و زن کو قتل کیا گیا۔" اگر ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ایسا ہوا ہوتا تو چار برسوں میں وہاں مارے جانے والوں کی متوازی تعداد سولہ لاکھ ہوتی۔ دس لاکھ افراد چلّی سے فرار ہو گئے ہیں، اور یہ وہ ملک ہے جو مہمان نوازی کی روایت میں ممتاز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چلّی کی دس فیصد آبادی ملک چھوڑ چکی ہے۔ پچیس لاکھ کی آبادی کے چھوٹے سے ملک یوراگوئے سے، جو خود کو برّاعظم کا سب سے مہذب ملک سمجھتا ہے، ہر پانچواں شہری فرار ہو چکا ہے۔ ال سلویڈور میں ۱۹۷۹ء میں خانہ جنگی شروع ہوئی اور وہاں ہر بیس منٹ میں ایک شہری ملک سے فرار ہوتا ہے۔

لاطینی امریکہ کے ملکوں سے بھاگنے والے شہریوں پر مشتمل اگر ایک ملک بنایا جا سکتا ہے تو اس کی آبادی ناروے سے زیادہ ہوتی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس غیر معمولی حقیقت نے سویڈش اکیڈیمی آف لیٹرز کی توجہ حاصل کی ہے۔ محض اس کے ادبی اظہار نے نہیں۔ یہ حقیقت کاغذی نہیں بلکہ ہمارے اندر رہتی بستی ہے اور روزانہ وقوع پذیر ہونے والی ہماری بے شمار ہلاکتوں کے ہر لمحہ کا تعین کرتی ہے۔ یہی ہماری کبھی ختم نہ ہونے والی تخلیقی قوتوں کا سرچشمہ بنتی ہے۔ جو غم و اندوہ اور حُسن سے لبریز ہے۔ اور جس کا ایک قطرہ کولمبیا کا یہ آوارہ گرد اور نوسٹلجیا کا مارا ہوا بشر ہے، جس کو قسمت نے آپ نے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

ہم کہ شاعر بھی ہیں اور فقیر بھی، موسیقار بھی اور روحانی پیشوا بھی، جیالے سپاہی بھی اور بدمعاش بھی، ہم سب اسی بے لگام حقیقت کی پیداوار ہیں۔ ہمیں تخیل سے زیادہ مدد لینے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ ہمارا تو سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مروجہ طریقوں کو استعمال کرتے ہوئے

ہم اپنی زندگیوں کو قابلِ یقین انداز میں کیسے پیش کر سکیں۔ میرے دوستو! یہ ہے ہماری تنہائی کا بنیادی مسئلہ۔

اور اگر یہ مشکلات جو ہمارے لکھنے والوں کے لیے مشترک ہیں، ہماری راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں تو یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ دُنیا کے اس حصّے میں جہاں آپ آباد ہیں عاقل اور ذہین لوگوں کے پاس، جو اپنی اپنی ثقافتوں پر نازاں ہیں ہمارے حالات کو جانچنے کا کوئی معقول ذریعہ نہیں۔ یہ قدرتی بات ہے کہ وہ ہمیں اسی پیمانے سے ناپنے پر اصرار کرتے ہیں جو وہ اپنے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ زندگی کی غارت گری سب لوگوں کے لیے ایک جیسی نہیں ہوتی اور یہ کہ اپنے تشخص کی جستجو ہمارے لیے بھی اسی طرح مشقت طلب اور خون ریز ہے جس طرح ان کے لیے تھی۔ ہماری حقیقت کی تعبیر ان مثالوں اور نمونوں کے ذریعے جو ہمارے اپنے نہیں ہیں، لاحاصل ہیں بلکہ ہمیں اور زیادہ نامعلوم، گمنام اور تنہا کر دیتی ہیں۔

اگر قابلِ احترام یورپ ہمیں خود اپنے ماضی کے حوالے سے دیکھے تو شاید وہ ہمیں بہتر سمجھ سکے۔ اگر وہ صرف یہ یاد کرے کہ لندن کو اپنی پہلی فصیل تعمیر کرنے میں تین سو سال لگے اور ایک بشپ حاصل کرنے کے لیے مزید تین سو سال لگے اور یہ کہ روم نے بیس صدیاں تذبذب کے دھندلکوں میں گزاریں، تب کہیں شمالی اٹلی سے آئے ہوئے ایک بادشاہ نے اسے تاریخ میں مستحکم جگہ بخشی اور یہ کہ سوئٹزرلینڈ کے موجودہ پُرامن باشندے جو ہماری تواضع پھیکے پنیر یا بلس گھڑیوں سے کرتے ہیں۔ سولہویں صدی تک کرائے کے فوجی بن کر پورے یورپ کو خون میں نہلاتے رہے ہیں۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے عروج کے زمانے میں شاہی افواج کے بارہ ہزار کرائے کے فوجیوں نے روم کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اور آٹھ ہزار شہریوں کے سر قلم کر دیئے تھے۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ ٹونیو کروگر کے فریبِ نظر کو متشکل کروں جو پاکباز شمال کو جذباتی جنوب سے ملا دینا چاہتا تھا اور جس کو ۵۳ سال پہلے یہاں ٹامس مان نے اپنا موضوع بنایا تھا۔ میرا عقیدہ ہے کہ یورپی باشندے جو یہاں بھی ایک زیادہ منصفانہ اور انسانیت پرور نظام کے لیے جدوجہد

کرتے ہیں ۔ اگر ہمیں دیکھنے اور جانچنے کے طریقہ پر نظر ثانی کریں تو ہماری بہتر طور پر مدد کر سکیں گے ۔

ہمارے خوابوں کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کرنے سے وہ ہماری تنہائی اس وقت تک کم نہ کر سکیں گے جب تک ان کے احساسات فطری اور جارحانہ حمایت کے ٹھوس اقدامات کی شکل نہ اختیار کر لیں ۔ ان تمام قوموں کی حمایت کے لیے جو دُنیا کی موجودہ تقسیم میں اپنی زندگیاں اپنے طریقے سے بسر کرنے کے خواب دیکھتی ہیں ۔

لاطینی امریکہ نہ یہ چاہتا ہے نہ اس کے لیے کوئی وجہ ہے کہ وہ کسی کا مہرہ بنے اور اپنا کوئی ارادہ نہ رکھے ۔ اور یہ محض خوش فہمی بھی نہیں کہ آزادی اور اختراع کے لیے لاطینی امریکہ کی جدوجہد ایک مغربی امنگ بن جائے ۔ بہر حال جہاز رانی کہ جس نے ہمارے امریکہ اور یورپ کے درمیان فاصلے کم کر دیئے ہیں اُس کا ایک الٹا نتیجہ ہوا ہے کہ ہماری ثقافتی دوری میں اضافہ ہو گیا ہے ۔

ایسا کیوں ہے کہ ہماری تخلیقی قوتِ ایجاد کو تو ادب میں تسلیم کیا گیا ہے لیکن سماجی تبدیلی کے لیے مختلف کوششوں کے سلسلے میں ہماری تخلیقی صلاحیتوں سے انکار کیا جاتا ہے ۔ ایسا کیوں سوچا جاتا ہے کہ ترقی پسند یورپیوں نے اپنے ملکوں اور اپنے معاشروں کے لیے جو سماجی انصاف حاصل کیا ہے وہ لاطینی امریکہ کا مختلف صورت حال میں مختلف طریقوں کے ذریعے حاصل کیا جانے والا مقصد نہیں ہو سکتا ۔

ہماری تاریخ کا لامحدود تشدد اور دُکھ دیرینہ ناانصافیوں اور بے انتہا تلخیوں کا نتیجہ ہیں ۔ یہ ہمارے گھروں سے تین ہزار میل دور تیار ہونے والی سازش کا نتیجہ نہیں ۔ لیکن متعدد یورپی رہنماؤں اور مفکروں نے ایسا ہی سوچا ہے ۔ وہ ان جہاندیدہ لوگوں کی طرح ہیں جو بڑی معصومیت کے ساتھ اپنی جوانی کی غلط کاریوں کو بھول جاتے ہیں جیسے کہ یہ بات بالکل ناممکن ہو کہ آدمی دو بڑے آقاؤں کے رحم و کرم کے بغیر زندہ نہ رہ سکے ۔ اور اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہ ہو ۔

میرے دوستو! ہماری گمنامی اور ہماری تنہائی اور گوشہ نشینی کا پیمانہ یہی ہے ۔

اس کے باوجود ہم جبر، لوٹ مار، اور بے چارگی کے ماحول میں زندگی کے بھرپور ردِ عمل کا

ثبوت دیتے ہیں۔ سیلاب، وبائیں۔ قحط، قیامت خیز تباہیاں اور صدیوں سے جاری ہماری ازلی جنگیں اس قابل نہیں ہوسکیں کہ موت پر زندگی کی مستقل فوقیت کو زیر کرسکیں۔

ہماری ایک فوقیت جو روز بروز تیزی سے بڑھ رہی ہے، یہ ہے کہ ہر سال مرنے والوں کی نسبت ۷۴ لاکھ زیادہ انسان پیدا ہوتے ہیں۔ ہر سال ان زندگیوں میں اتنا اضافہ ہوتا رہتا ہے کہ نیو یارک کی آبادی سات گنا ہو جائے۔ آبادی کا یہ اضافہ ان ملکوں میں سب سے زیادہ ہوتا ہے جن کے وسائل بہت ہی کم ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں لاطینی امریکہ کے ممالک بھی شامل ہیں۔

آج ہی کی طرح ایک دن میرے استاد ولیم فوکنر نے کہا تھا "میں انسان کے خاتمے کو ماننے سے انکار کرتا ہوں"۔ مجھے اس جگہ پر کھڑے ہوتے شرم محسوس ہوتی اگر میں اس حقیقت سے پوری طرح واقف نہ ہوتا کہ ۳۲ سال قبل اس نے جس بے پناہ المیے کو ماننے سے انکار کردیا تھا، اب وہ المیہ، انسانیت کی ابتدا کے بعد اب پہلی بار ایک سائنسی امکان میں تبدیل ہوچکا ہے۔

حضرات! آج ہم اس ہیبت ناک حقیقت سے روبرو ہیں جسے پوری انسانی تاریخ میں محض ایک یوٹوپیا سمجھا گیا ہے۔ ہم جو قصے اور کہانیاں بناتے ہیں اور جو کسی بھی شے پر یقین کرلیتے ہیں۔ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ ایک قطعی مختلف یوٹوپیا تخلیق کرنے کے لیے سرگرم عمل ہونے کا وقت ابھی ہاتھ سے نکلا نہیں۔ زندگی کا ایک نیا اور ہمہ گیر یوٹوپیا جس کو کسی کو یہ طے کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا کہ دوسروں کو کیسے مرنا چاہیئے، جس میں محبت سچی ہوگی اور خوشیاں ممکن ہوں گی اور جس میں ان قوموں کو جنہیں سو برس تک تن تنہا رہنے کی سزا ملی ہے آخر کار دُنیا میں جینے کا دوبارہ موقع ملے گا۔

خورخے لوئس بورخیس
ترجمہ:۔ آصف فرخی

پیراڈائزو، سی ویک ۱۰۸

ڈائیوڈورس سائیکلس ایک ایک خداوند کی کہانی سناتا ہے جو ٹوٹ گیا اور بکھر کر دور دور پھیل گیا۔ ہم میں سے کون ہے جس نے جھٹ پٹے میں چلتے ہوئے یا اپنے ماضی کی کوئی تاریخ درج کرتے ہوئے یہ محسوس نہ کیا ہو کہ اس سے کوئی بے پایاں شے گم ہو گئی ہے۔

انسان کا ایک چہرہ گم ہو گیا ہے، ایک ناقابلِ تنسیخ چہرہ، اور ہر ایک کو وہ یاتری بننے کی آرزو رہی ہے۔ جس کا نظارہ ایمپائرین میں گلاب کے پیچھے دکھائی دیا تھا۔ جیسے روم میں ویرونیکا نظر آتی ہے اور فرطِ عبودیت سے بڑبڑاتا ہے "میرے آقا میرے عیسیٰ، یسوع مسیحؑ، اے خداوند تو کیا تیری صورت ایسی تھی؟"

ایک سڑک کے کنارے پتھر کا چہرہ بنا ہے جس پر لگا کتبہ کہتا ہے، "شبیہہ حقیقی چہرہ مقدمہ خداوندِ جابن کی۔ اگر ہمیں واقعی معلوم ہو جائے کہ وہ کیسی تھی تو تمام حکایات کی کلید ہمیں مل جائے اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ بڑھئی کا بیٹا کیا واقعی ابنِ خداوند تھا۔

پال نے اسے روشنی کے روپ میں دیکھا جس نے اسے زمین پر ڈھیر کر دیا۔ یوحنّا کو وہ سورج میں نظر آیا جو تمام تر جلال میں بھڑک رہا ہے۔ شہر لیون کی ٹرےزا نے اسے بارہا دیکھا، پاکیزہ نور میں تر بتر، مگر وہ کبھی طے نہ کر سکی کہ اس کی آنکھوں کا رنگ کیسا ہے۔

یہ نقوش ہم سے گم ہو گئے ہیں۔ جس طرح روائتی ہندسوں پر مشتمل طلسمی عدد گم ہو سکتا ہے۔ جس طرح سیربین میں ایک صورت گم ہو جاتی ہے، ہمیشہ کے لیے ہم اُنھیں دیکھ بھی لیتے ہیں پھر بھی نہیں جانتے۔ زمین دوز راستے میں نظر آنے والے ایک یہودی کا چہرہ یسوعؑ کا بھی ہو سکتا ہے جو ہاتھ ٹکٹ گھر کی کھڑکی میں سے ہمیں ریزگاری واپس دے رہے ہیں، شاید انہی کو دُہرا رہے ہوں جنہیں

بعض سپاہیوں نے ایک دن کیلوں سے صلیب پر گاڑ دیا تھا۔

شاید اس مصلوب چہرے کا کوئی نقش ہر آئینے میں جھلکتا ہے، شاید وہ چہرہ مر گیا۔ مٹ گیا۔

کون جانے کہ آج رات ہم اسے خوابوں کی بھول بھلیّاں میں دیکھ لیں اور کل صبح پہچان بھی نہ پائیں کہ ہم نے اسے دیکھا تھا۔

احمد ندیم قاسمی

اپنے لہو سے آپ چراغاں کرتا ہوں — مجھکو بھی دیکھو میں بھی تو ایک تماشا ہوں
میرے عدوئے تیرہ ضمیر کو کیا معلوم — نورِ سحر ہوں اور افق پر جلتا ہوں
دشتِ خیال کا ایک بگولہ ہوں لیکن — عرش کو چھوتا ہوں جب فرش سے اُٹھتا ہوں
میری حیات، تلاشِ جنتِ گم گشتہ — اوّل دن سے اپنے وطن سے بچھڑا ہوں
باندھ رکھا ہے میں نے ازل سے رختِ سفر — کھول کے شہپرِ فکر، ابد تک اُڑتا ہوں
ایک آواز مسلسل پیچھا کرتی ہے — انسانو! میں باغِ بہشت میں تنہا ہوں
میں انسان ہوں میرا غروب قیامت ہے — میں سورج ہوں اور بظاہر ڈوبا ہوں
گزرے دنوں کی گونج بھی میرے کان میں ہے — آنے والے دور کی چاپ بھی سُنتا ہوں
ہمدمو اپنے اندر جھانکو اور بتاؤ — کانٹا بن کر کس کے دل میں کھٹکتا ہوں
پاس رہے جس کو آدابِ عداوت کا — میں دیوانہ اس دشمن پہ مرتا ہوں
شاید مستقبل کا مورّخ ہی سُن لے — پتھر کی دیوار پہ دستک دیتا ہوں
شعر کہے تو کبھی کبھی محسوس ہوا — جیسے ابر ہوں اور خلا میں برستا ہوں

اپنی فنا سے مجھ کو بلا کی ضد ہے ندیم
سبزہ بن کر اپنی لحد سے نکلا ہوں

ثروت حسین

غزل

تھامی ہوئی ہے کاہکشاں اپنے ہاتھ سے
تعمیر کر رہا ہوں مکاں اپنے ہاتھ سے

آیا ہوں وہ زمین و شجر ڈھونڈتا ہُوا
کھینچی تھی اِک لکیر جہاں اپنے ہاتھ سے

حُسنِ بہار مجھ کو مکمّل نہیں لگا
میں نے تراش لی ہے خزاں اپنے ہاتھ سے

آئینے کا حضور سمندر لگا مُجھے
کاٹا ہے میں نے سیلِ گراں اپنے ہاتھ سے

ثروت ہدف بہت ہیں جوانانِ شہر میں
رکھّو ابھی نہ تیر و کماں اپنے ہاتھ سے

محمد الماغوط

ترجمہ : احمد سلیم

ڈر

قیدیو! تم جہاں کہیں بھی ہو
تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے
مجھے بھیج دو
ڈر، چیخیں، تنگدستی

ساحلِ سمندر کے مچھیرو!
تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے
مجھے بھیج دو
خالی جال اور سمندر اور درد

دنیا بھر کے محنت کش، مزدورو!
تمہارے پاس جو کچھ بھی ہے
مجھے بھیج دو
پھول اور دھجیاں

چاک پیٹ
اُکھڑے ناخن

میرے پتے پر بھیج دو
کسی بھی قہوہ گھر میں
دھرتی کی کسی بھی سڑک پر

انسانی دکھ کے موضوع پر
مَیں ایک بہت بڑی دستاویز تیار کر رہا ہوں
خدا کے حضور پیش کرنے کے لئے
بھوک کے ہونٹوں اور بھلا دیئے گئے لوگوں کی پلکوں سے
دستخط کروا لوں گا

بس ایک ہی ڈر ہے دوستو،
کہیں خدا بھی اَن پڑھ ہی نہ ہو۔

(ادبِ لطیف لاہور)

افتخار عارف

گواہی

کبھی کبھی خود چراغ کی لَو یہ چاہتی ہے کہ ایک سرکش ہوا کا جھونکا
ادھر بھی آئے
جو رات آنکھوں میں چھپ رہی ہے نظر بھی آئے ۔
پھر اس اندھیرے میں ہر مسافر کو اپنے گھر اپنے ماہ یاد آئیں
اپنے گم کردہ راہ یاد آئیں
وہ یاد آئیں کہ جن کے انوارِ قدس کی بارشوں میں کونین
اپنا گرد و غبار دھولیں
وہ جن کے ناموں کے اسمِ اعظم کی روشنی ہو ۔
تو سنگ بولیں
حجابِ اکبر اُٹھے تو سرِّ وجود کھولیں
کبھی کبھی خود چراغ کی لَو یہ چاہتی ہے
کہ ایک سرکش ہوا کا جھونکا اِدھر بھی آئے ۔